

# ایک سیاست کچی کہانیاں

رؤف کلاسرا



# ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

ایک سیارست کئی کہانیاں

دوست چہلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی



ڈان کے لیجنڈری ایڈیٹر

احمد علی خان (مرحوم)

کے نام

جن کے 1998ء میں بنگلہ دیش سے اسلام آباد چلا کر گئے  
کے ایک فیصلے نے ہماری زندگی بھر کے لیے بدل دی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-385-3

کتاب	ایک داستان کی کہانی
مصنف	رائل کارا
تاریخ شائع	2010
زبان	فارسی
صفحہ	181
قیمت	8950

ڈاکٹر علی گینو، 118، 119، 120، 121، 122، 123، 124، 125، 126، 127، 128، 129، 130، 131، 132، 133، 134، 135، 136، 137، 138، 139، 140، 141، 142، 143، 144، 145، 146، 147، 148، 149، 150، 151، 152، 153، 154، 155، 156، 157، 158، 159، 160، 161، 162، 163، 164، 165، 166، 167، 168، 169، 170، 171، 172، 173، 174، 175، 176، 177، 178، 179، 180، 181، 182، 183، 184، 185، 186، 187، 188، 189، 190، 191، 192، 193، 194، 195، 196، 197، 198، 199، 200، 201، 202، 203، 204، 205، 206، 207، 208، 209، 210، 211، 212، 213، 214، 215، 216، 217، 218، 219، 220، 221، 222، 223، 224، 225، 226، 227، 228، 229، 230، 231، 232، 233، 234، 235، 236، 237، 238، 239، 240، 241، 242، 243، 244، 245، 246، 247، 248، 249، 250، 251، 252، 253، 254، 255، 256، 257، 258، 259، 260، 261، 262، 263، 264، 265، 266، 267، 268، 269، 270، 271، 272، 273، 274، 275، 276، 277، 278، 279، 280، 281، 282، 283، 284، 285، 286، 287، 288، 289، 290، 291، 292، 293، 294، 295، 296، 297، 298، 299، 300، 301، 302، 303، 304، 305، 306، 307، 308، 309، 310، 311، 312، 313، 314، 315، 316، 317، 318، 319، 320، 321، 322، 323، 324، 325، 326، 327، 328، 329، 330، 331، 332، 333، 334، 335، 336، 337، 338، 339، 340، 341، 342، 343، 344، 345، 346، 347، 348، 349، 350، 351، 352، 353، 354، 355، 356، 357، 358، 359، 360، 361، 362، 363، 364، 365، 366، 367، 368، 369، 370، 371، 372، 373، 374، 375، 376، 377، 378، 379، 380، 381، 382، 383، 384، 385، 386، 387، 388، 389، 390، 391، 392، 393، 394، 395، 396، 397، 398، 399، 400، 401، 402، 403، 404، 405، 406، 407، 408، 409، 410، 411، 412، 413، 414، 415، 416، 417، 418، 419، 420، 421، 422، 423، 424، 425، 426، 427، 428، 429، 430، 431، 432، 433، 434، 435، 436، 437، 438، 439، 440، 441، 442، 443، 444، 445، 446، 447، 448، 449، 450، 451، 452، 453، 454، 455، 456، 457، 458، 459، 460، 461، 462، 463، 464، 465، 466، 467، 468، 469، 470، 471، 472، 473، 474، 475، 476، 477، 478، 479، 480، 481، 482، 483، 484، 485، 486، 487، 488، 489، 490، 491، 492، 493، 494، 495، 496، 497، 498، 499، 500، 501، 502، 503، 504، 505، 506، 507، 508، 509، 510، 511، 512، 513، 514، 515، 516، 517، 518، 519، 520، 521، 522، 523، 524، 525، 526، 527، 528، 529، 530، 531، 532، 533، 534، 535، 536، 537، 538، 539، 540، 541، 542، 543، 544، 545، 546، 547، 548، 549، 550، 551، 552، 553، 554، 555، 556، 557، 558، 559، 560، 561، 562، 563، 564، 565، 566، 567، 568، 569، 570، 571، 572، 573، 574، 575، 576، 577، 578، 579، 580، 581، 582، 583، 584، 585، 586، 587، 588، 589، 590، 591، 592، 593، 594، 595، 596، 597، 598، 599، 600، 601، 602، 603، 604، 605، 606، 607، 608، 609، 610، 611، 612، 613، 614، 615، 616، 617، 618، 619، 620، 621، 622، 623، 624، 625، 626، 627، 628، 629، 630، 631، 632، 633، 634، 635، 636، 637، 638، 639، 640، 641، 642، 643، 644، 645، 646، 647، 648، 649، 650، 651، 652، 653، 654، 655، 656، 657، 658، 659، 660، 661، 662، 663، 664، 665، 666، 667، 668، 669، 670، 671، 672، 673، 674، 675، 676، 677، 678، 679، 680، 681، 682، 683، 684، 685، 686، 687، 688، 689، 690، 691، 692، 693، 694، 695، 696، 697، 698، 699، 700، 701، 702، 703، 704، 705، 706، 707، 708، 709، 710، 711، 712، 713، 714، 715، 716، 717، 718، 719، 720، 721، 722، 723، 724، 725، 726، 727، 728، 729، 730، 731، 732، 733، 734، 735، 736، 737، 738، 739، 740، 741، 742، 743، 744، 745، 746، 747، 748، 749، 750، 751، 752، 753، 754، 755، 756، 757، 758، 759، 760، 761، 762، 763، 764، 765، 766، 767، 768، 769، 770، 771، 772، 773، 774، 775، 776، 777، 778، 779، 780، 781، 782، 783، 784، 785، 786، 787، 788، 789، 790، 791، 792، 793، 794، 795، 796، 797، 798، 799، 800، 801، 802، 803، 804، 805، 806، 807، 808، 809، 810، 811، 812، 813، 814، 815، 816، 817، 818، 819، 820، 821، 822، 823، 824، 825، 826، 827، 828، 829، 830، 831، 832، 833، 834، 835، 836، 837، 838، 839، 840، 841، 842، 843، 844، 845، 846، 847، 848، 849، 850، 851، 852، 853، 854، 855، 856، 857، 858، 859، 860، 861، 862، 863، 864، 865، 866، 867، 868، 869، 870، 871، 872، 873، 874، 875، 876، 877، 878، 879، 880، 881، 882، 883، 884، 885، 886، 887، 888، 889، 890، 891، 892، 893، 894، 895، 896، 897، 898، 899، 900، 901، 902، 903، 904، 905، 906، 907، 908، 909، 910، 911، 912، 913، 914، 915، 916، 917، 918، 919، 920، 921، 922، 923، 924، 925، 926، 927، 928، 929، 930، 931، 932، 933، 934، 935، 936، 937، 938، 939، 940، 941، 942، 943، 944، 945، 946، 947، 948، 949، 950، 951، 952، 953، 954، 955، 956، 957، 958، 959، 960، 961، 962، 963، 964، 965، 966، 967، 968، 969، 970، 971، 972، 973، 974، 975، 976، 977، 978، 979، 980، 981، 982، 983، 984، 985، 986، 987، 988، 989، 990، 991، 992، 993، 994، 995، 996، 997، 998، 999، 1000

ان کی 4192794-3

## ترتیب

7	روح کا سرا	کہانوں کی کہانی
13	عامر حسین	زاویے
19		چوہدری شہامت حسین
42		چوہدری نثار علی خان
73		جہاں علی تھی خان
95		شاہد حامد
127		اسحاق ڈار
147		فیصل صالح حیات
167		امین نبیم
188		آصف علی زرداری
217		آفتاب احمد خان شیرپاؤ
230		سلطان محمود قاضی



www.iqbalkalmati.blogspot.com

### کہانیوں کی کہانی

میں یہ کتاب چھ سال کی خانم سے لکھوا ہوں۔ یہ پورنگ کا کچھ ایسا چکاچنڈ ہے۔ اس وقت میں ہم سب کے گرد ماہرین کے بقول "کیرا" ہونے کا کتاب کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ لیکن میں قیام لندن کے دنوں میں جس بک سٹور پر گیا اور جس بک سٹور پر گیا تو وہاں وہاں کے کسی سہانی نے لکھی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جتنی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان کے لکھے والے بھی غیر ملکی سہانی ہیں۔ یہ سہانی پاکستان میں اپنے اخبار کے لیے صرف تین سال لکھتے ہیں اور اپنی معیاد ختم ہونے پر واپس جا کر ان کا پہلا کام پاکستان اور پاکستانی سیاستدانوں، طوچ اور انجینیئروں کے بارے میں کتابیں لکھنا ہوتا ہے۔ لہذا ایک نوازل میرے دل میں لگی بیٹھ سے موجود تھی کہ کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار اور پڑے پڑے کرداروں کو عوام کے سامنے ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا جاسکے۔ اسی خواہش کے پیش نظر ان سیاسی ناکوں کو اردو میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یاد رکھیں چنانچہ کہ میرے اہل میں یہ بات کیسے آئی تھی کہ 2003ء میں، میں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاستدان چوہدری شجاعت حسین کا انٹرویو کیا تھا جس نے میرے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ میں ہیبت اس کوشش میں رہا کہ میں خبر کو بھی ایک کہانی کی شکل میں لکھوں تاکہ پڑھنے

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں سے لا کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ تو ایک نیا ہیرو ہے۔ اس کی کہانی کی طرح ہی لگتا تھا۔ وہ کہانی تو کون کوئی پاس آتی کہ باہر میں نے تمہیں کے قریب سر پہ ہاتھ افون کی کہانیوں لکھیں۔ مجھے محمود خان اپکنزنی کا وہ نظریہ نہیں ہوا کہ میں نے چالیس برس بعد اپکنزنی مشہور عالمی صحافی اور ریٹلائی کی ڈائریکٹس وائس تھی۔ میں نے اس وقت تک عالمی لیڈروں کے ذریعے سے انٹرویوز پر مشتمل امریکا کی کتاب "An interview with history" نہیں پڑھی تھی۔

جب پڑھی تو اس کا ایک ایسا رو مانس سر پر ۱۳ مارچ ۱۹۷۲ء کو میں نے اس کا ایٹن صاحب کا مشہور زمانہ انٹرویوز ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل مانسی سے قدر سے روشناس ہو سکے۔ یہ انٹرویوز ۱۹۷۲ء میں لیا گیا تھا۔ میرا بڑا دل چاہا کہ کاش اور ریٹلائی دوبارہ ایٹن صاحب کا انٹرویوز ۱۹۷۷ء کی فونی بناوت کے بعد کرتی تو یہ نہیں کیا کیا انکشافات ہوتے۔ جس انداز سے اور ریٹلائی نے ایٹن صاحب کی شخصیت کو بے گلاب کیا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلکش بنائے گا۔

جب میں اپنے ان تیس سیاسی خاکوں میں سے انتخاب کرنے بیٹھا تو مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس کا نام ڈراپ کروں۔ مجھے سب سے زیادہ مایوسی اس بات کی ہے کہ محمود خان اپکنزنی کے ساتھ آٹھ برسوں پر محیط گفتگوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکا کہ وہ مجھے اپنے رازوں کی کہانی لکھنے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر محمود اپکنزنی مجھے اجازت دے دیتے تو وہ اس کتاب کا سب سے بہترین باب ہوتا۔ میں ابھی بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ انہوں نے آٹھ برس پہلے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ تمام راز آف دی ریکارڈ بنائے جا رہے ہیں۔ میرے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پنخان کے لہجے میں بولے۔ "اگر تم نے وہ راز راز نہ رہنے دیئے تو پھر ہو سکتا ہے کسی دن تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے اسلام آباد سے فرار ہونا پڑے تو اگر کوئی شخص تمہیں پورے پاکستان میں اپنا مہمان بنائے گا تو وہ صرف محمود اپکنزنی ہوگا۔ آگے تمہاری مرضی۔ اگر تم اپنی آخری پناہ گاہ محض میرے راز لکھ کر رقم کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری پوائس!"

یہ بات میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی مشکل سے میں نے ان آٹھ برسوں میں محمود اپکنزنی کے سینے سے دھواں بن کر نکلنے والے ان خوفناک رازوں کو کیسے ایک صحافی ہونے کے باوجود چھپا کر رکھا ہے۔ اگرچہ میرے دوست کالم نگار سلیم سانی نے محمود اپکنزنی کی موجودگی میں مجھے کہا کہ رؤف بھائی اتم بھی

مجھے مانس آوی ہو۔ تم مجھے دیکھ لو۔ یہ مجھے کی گئی باتیں تھیں۔ رہتے ہیں انہیں میں چھاپنے کے بعد ایک اور نسخے ان سے نہیں لیتا اس پرمان کا دل بہت بڑا ہے۔ یہ جلدی اور سے جیسے سماجوں کو سٹاف کر دیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سلیم سانی کو جواب دیا کہ ہو سکتا ہے یہ قسمی رہا ہے محمود اپکنزنی صاحب سے یہ کہنا تو ان کے بہترین صحافی کے ساتھ تو روا رکھتے ہوں لیکن وہاں کے صحافی کو ان آٹھ برسوں میں ابھی تک ان سے انکی قریب حاصل نہیں ہو سکی۔

محمود اپکنزنی کے علاوہ شیخ رشید، مولانا محمد آصف، مشاہد حسین، ابراہیم الخضر، ابو سلف اللہ اور چند ایسے بڑے سیاستدان تھے جن کے پروفائل لکھ کر بھی میں اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا۔ اگر اس سیاسی کتاب کو پڑھنے والی ملی تو شاید ان کے رازوں سے بھی بڑے اللہ ہائیں۔ بہت سارے دوستوں نے کہا کہ قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمن اور الطاف حسین کے بھی اس طرح کے پروفائل لکھوں۔ یہ نہیں میرا دل کیوں نہیں مانتا۔ میں نے ان سب کو یہی جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے دل کی باتیں نہیں بتائیں گے یا وہ کچھ جو میں سننا چاہتا ہوں وہ اپنے اندر سے نہیں نکال پائیں گے، لہذا ان کا اور اپنا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ان تینوں کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

"دی نیوز" کے سابق ایڈیٹر سلیم بخاری مجھے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ مجھے انگلش میں لکھنے کے یہ سارے سیاسی پروفائلز کتابی شکل میں لے آئے چاہئیں۔ یہ کرنے میں بھی سلیم بخاری کو ہاتا ہے کہ یہ سب کے سب تھمکا۔ خیر پروفائلز انہی کے دور میں شائع ہوئے اور پہلی دفعہ جنرل مشرف کے دور میں انہی کے خلاف ہی ایسی ایسی چیزیں شائع ہونا شروع ہوئیں جن کا تصور کرنا شاید مشکل تھا۔ سلیم بخاری نے ایک بھی پروفائل نہیں رکھنے دیا۔ اگر میں یہاں جنگ گروپ کے مالک میر کلیل الرحمن کا ذکر نہ کروں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس بات کا میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ میر کلیل الرحمن پر جنرل مشرف کا کتنا دباؤ تھا کہ وہ اس طرح کے انٹرویوز چھاپنا بند کریں۔ جنرل علی قلی خان کے پروفائل کے بعد تو حد ہو گئی تھی کیونکہ اس سے جنرل مشرف کی ان سازشوں کا پورا پورا فاش ہوا تھا جو انہیں نواز شریف سے خفیہ ملاقاتوں کے بعد آرمی چیف کے عہدے تک لے گئی تھیں۔ میر کلیل الرحمن نے بڑی ہمت سے میرے سارے پروفائل اخبار میں چھاپے۔ شاید اگر وہ جنرل مشرف کے دباؤ میں آجاتے تو آج یہ تاریخ اس طرح رقم نہ ہو پاتی جس طرح اس کتاب کی شکل میں ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب پر زیادہ تبصرہ اس لیے نہیں کرتا











ہوتا ہے۔ اسے اسکی سمجھوں کی کھوج میں رکھتا ہے جہاں سیاسی گفتگو ہو سکے۔ یہ "گلوبل ریڈف" کو چھوڑے  
واقعات کی بڑی کہانیوں سے کڑیاں جوڑنے میں مصروف رکھتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی صحافت کے لوازمات ذرا مختلف ہیں۔ گورے صحافیوں کے لیے پاکستان کا  
موردی جائیداد اور برادری یعنی معاشرہ سمجھنا اور مشکل فعل ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اپنے انگلش میڈیم  
صحافی بھی پاکستانی سیاست کے مقامی بیچ و تم سیاسی کرداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور مختلف ادوار کے  
اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا تردد نہیں کرتے۔ میرے کافی ایسے "مقامی گورے" صحافی دوست ہیں جو فخریہ  
بتاتے ہیں کہ ان کی اردو بہت کمزور ہے اور یہ کہ وہ اردو اخبار پائل نہیں پڑھتے۔ اکثر بڑے شہروں میں  
پلے بڑھے ہیں اور نچلے طبقوں کے معاشرتی مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جو صحافی درمیانے  
اور نچلے طبقوں سے ترقی کر کے اوپر آ گئے ہیں، اسلام آباد اور بڑے شہروں کی رنگینیاں ان کی آنکھوں پر  
پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے جان چھڑاتے نظر آتے ہیں۔

صحافت میں پاکستانی معاشرے میں موجود یہ طبقاتی مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر اب فرق یہ  
ہے کہ سیاست سے نا بلد صحافیوں کی ایک پوری نسل ایسے مہدوں پر براجمان ہو چکی ہے کہ وہ رائے عامہ  
کو ایک اندھیری گلی میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔

نئی دیرین کی آمد سے یہ رجحان مزید خطرناک ہو گیا ہے۔ اینٹرز کا ایک طبقہ اسلام آباد کے  
ڈرائنگ رومز کی گپ شپ، ایجنسیوں کی پھیلائی ہوئی سازشی افواہوں اور مراعات یافتہ مافیاء کے  
پرائیویٹنگ کے گویا سی تجربے کے طور پر روزانہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اکثر اینٹرز کا صحافتی تجربہ کچھ سالوں یا مہینوں پر محیط ہے جس میں اچھے زمانوں میں صحافیوں کو  
سیاسی رپورٹنگ کی مشکل اجازت ملتی تھی۔ انہیں تنہو زور و حرکی ڈانٹ ڈپٹ کا تجربہ ہے نہ فیلڈ رپورٹنگ  
کا۔ یہ ایسے ایسے کی بیہوش ہیں جس میں سیاسی عمل یا تو نا پید تھا یا اس کی کوئی تقریبی شکل سیاست کے  
ظہر پر موجود تھی۔ اس کی وجہ سے یہ نو مولود صحافی سیاست اور سیاستدان کے خلاف بڑی جلدی تعصب  
قائم کر لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں دشواری ہوتی ہے بلکہ ہم  
ایک باج اور قبائلی خیالات کو برواشت کرنے والے معاشرے کو قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ آئے دن  
پاکستانی ٹی وی چینلز پر سیاسی موضوعات پر ایسی بھونڈی بحث نظر آتی ہے کہ انسان کا سر پیٹنے کو دل کرتا

ہے۔ ایک بیکار چال ہے جس میں بھونڈی خبر پھر ناظر کے اس طرح اچھا لگتی ہے کہ اس سے  
مکومت اور ملک پر برا جمہوری نظام ختم کرنے میں نہ جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں سیاستدان کا کام ہوتے ہیں۔ حکومتیں کرتی ہیں۔ آئین تہذیب ہوتے  
ہیں اور ادارے اختیارات پر لڑتے بھی ہیں مگر اس سے نظام ریاست یا قومی سلامتی پر کوئی آنکھیں آتی۔  
انہی میں پچھلے 25 سال میں پاکستان کے مقابلے میں دوکان حکومتیں گر چکی ہیں۔ امریکہ میں  
سپریم کورٹ نظر یاتی بنیاد پر استوار ہے۔ جنوں کے نظریات، زندگی اور فیصلوں پر عام تہذیب ہوتی ہے۔  
فرانس کے صدر کی اہلیان کی تیسری بیوی بننے سے پہلے ننگے جسم کی ماڈلنگ کرتی تھی۔ جاپان اور برطانیہ  
میں آئے دن سیاستدان مالی اور جنسی سکیڈلز میں پکڑے جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے ان ملکوں کی  
قومی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کوئی بیدارگ نہیں الایا کہ یہ ناکام ریاست ہے یا یہ ملک نوٹ جانے کا  
بلکہ اس طرح کی بحثیں ملک، جمہوریت اور مستند معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے  
اگر سیاست اور سیاستدانوں کو صحیح جاہل میں دیکھا جائے۔

پاکستان میں تو ویسے ہی سیاست کو سات خون مواف کر دینے چاہئیں۔ جس ملک میں اس کی  
تاریخ کے آدھے وقت فوج حکمران رہی ہو وہاں سیاست کو کیسے گالی دی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم  
سیاستدان کہہ کر تھوکتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مختلف ادوار میں ایجنسیوں نے بڑی محنت کے  
بعد چنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان کے ایجنڈے پر کاربند رہیں اور سیاسی عمل کو پھینٹ نہ دیں۔ ان میں سے کچھ  
لوگ جب نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم صحافی ان کو ان کا مکروہ ماضی یاد دلا کر اسے پتھر مارتے ہیں  
کہ وہ بچاؤ سے یا تو سیاست چھوڑ دیتے ہیں یا دو باروا سٹیٹسٹ کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ جنہوں  
بڑی جماعتیں، مسلم لیگ، ان اور ق اور پیپلز پارٹی یا تو فوج کی تحقیق شدہ ہیں یا ان کے قاتلین نے  
مارشل لا کی کوکھ سے جنم لیا ہے مگر اس کے باوجود مختلف ادوار میں سب نے اپنی رسا طہ عمل اور حالات  
کے حلق ملک و معاشرے کی بھلائی کے لیے کاوشیں کی ہیں۔

اس سب کے لیے سیاست کی افادیت کے بنیادی قسطے پر امتداد ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ  
ہمارے ہاں عمومی طور پر پالی جانے والی سیاست اور اس سے وابستہ کردار اور جماعتوں کے حلق جو آراء  
پالی جاتی ہیں وہ صحیح ہوں۔ ضروری نہیں کہ سیاست کا مطلب مال بڑانا اور طاقت کا حصول ہو۔ ضروری



تجربہ کی یہ استعداد کہ وہ وہی نام کا کام دہرائیں اور اس کے اندر کوئی تبدیلیاں نہ لگائیں اور وہی صورت کے تجربے سے کبھی نئے کار پائوں اور پڑھوں سے وہ بات کہنا ہو۔

سیاست کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام مہیا کرے جس میں عوام کو شراکتہ اور اس میں حصہ لینے کو ملے کہ جو کچھ ہوا ہے ان کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ سیاستدان وہ مانتی ہے جس نے اپنے آپ کو عام کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ ان سے کردار اور اہمیت میں باہر ہے اور ان کی وہی ہوئی طاقت کو ان کی ہمدانی کے لیے استعمال کرے گا اور ہر انسان کو یہ حق ہے کہ اس کے کردار کے حعلق پہاچی پڑھال کر سکے۔ سیاسی عمل پر نہیں ہے کہ کس سیاستدان نے کس وقت کیا اور کیوں کیا بلکہ یہ ہے کہ اس کے کام سے عوام کے مسائل کا کیا حعلق ہے۔ سیاست عوامی مسائل کے حعلق ہے نہ کہ سیاسی معاملات سے۔ ہم کو یہ لازم ہونا چاہیے کہ ہم سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو یہ موقع دیں جس میں سیاسی عمل اور ارتقا جاری رہے۔ ایسا سیاسی عمل ہر وہاں چڑھے جس میں ہم سیاستدانوں پر ہاؤز تقید بھی کرتے رہیں اور سیاسی نظام بھی نہ لڑ سکے۔ جس میں سیاستدانوں اور جماعتوں کو عوام ووٹ کے ذریعے ہی لے کر آئیں اور ووٹ کے ذریعے ہی تبدیل کریں۔ جس میں رائے عامہ مانتی مضبوط ہو کہ سیاسی جماعتیں وراثتی اور موروثی امیدواروں کی جگہ سیاسی کارندوں کو فروغ دیں اور اپنی جماعت کے اندر بھی جمہوری پھیلاؤ نافذ کریں۔ جس میں کار دہاری اور کرپٹ مافیا کا کردار کم ہو اور عام آدمی بھی سیاست میں ترقی کر سکے۔ جس میں آزاد الیکشن کمیشن سب کے لیے مساویانہ موقع فراہم کر سکے اور عوام میں ووٹ کی طاقت کا ادراک بڑھ سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی بحث و مباحثہ یا Informed public discourse ہو جس میں عوام اچھے اور برے کا بہتر تعین کر سکیں۔

ایسی پڑھی لکھی Debate تب ہی ممکن ہے جب ہمارے سیاسی رپورٹرز یا تجزیہ نگار (جو کہ آج کے تجزیہ باز صحافیوں سے مختلف ہیں) کو اپنے موضوع کا بہتر ادراک ہو اور یہ سب تب ہی ممکن ہے جب نئے تجزیہ نگاروں کو وہ مواد مہیا ہو جس سے وہ کل کے واقعات جان کر آج اور آنے والے کل کے متعلق بہتر بات کہہ سکیں۔ رؤف کھاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔

رؤف نے یہ سوچا تھا کہ اگر ان خصوصیات کے اندر تبدیلیاں نہ لگائیں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ لیکن ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے انکسار کریں، رؤف نے سیاست کے ایک اور نکتہ پر بیان میں رپورٹس کے لیے پبلک دیا ہے جس کی میں انتہائی شکرگزار ہوں اور پڑھنے کی خواہش ہرگز نہیں ہے۔

مجھے پڑھنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ جو پڑھ رہی تھی وہ پڑھ رہی تھی رؤف کے ناکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتی ہی نہیں پڑھ کر مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دکھایا ہے۔ تاہم یہ سوچ سمجھتے کا یہی سب سے بڑا عمل ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان ناکوں کا عنوان "ایک سیاست کی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس کہانی کی تشکیل دینی نہیں اور یوں ہی کہانی کہانوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر حسین  
دی نوبل اسلام آباد



## چوہدری شجاعت حسین

مجھے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے کا شوق اس وقت ہی پیدا ہو گیا تھا جب لاہور جیل میں قید یوسف رضا گیلانی اور اسلام آباد کے سب سے مہنگے ترین ملائے ای سیون بنگلہ میں واقع اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے سید مقابہ حسین نے مجھے ایک ہی بات بتائی کہ جب ان دونوں کو 12 اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کے بعد گرفتار کیا گیا تو جو شخص ان کے گھر سے پہلے اپنی جیبوں میں پیسے ڈال کر ان کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا وہ اور کوئی نہیں چوہدری شجاعت تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کا ایچ ایک ایسے سیاسی گاڈ فادر کا ساہن گیا تھا جو مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ شاید چوہدری صاحب بھی ماریو پوزو کے ناول گاڈ فادر کے ڈان کو ریلوے کی طرح اپنے اندر ایک ایسی جہالت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے سیاسی مخالفین کو جیتنے کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار تھے۔ کہنے کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں یوسف رضا گیلانی کے گھروالوں کی مصیبتوں کا اس لیے بھی علم تھا کیونکہ وہ خود پرویز الہی کے ساتھ اسی لاہور جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے لگے تھے۔ یہ بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ جنرل مشرف کے ساتھ مل کر تو انہوں نے گیلانی کو

تیل بھولیا تھا ہذا ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کے قیدی کے گھر میں اب بیویوں کی کمی تھی۔

جب 23 اپریل 2003ء کو میں ایف ایٹ مرکز میں واقع چوہدری شہامت کی رہائش گاہ کے باہر پہنچا تو وہاں جیتی کاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر کسی بھی شخص کا پہلا تاثر یہی ہوتا کہ اس ملک کا اصل عمران جنرل مشرف نہیں بلکہ جو اس گھر میں رہتا تھا۔ بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہر قسم کے سیاسی چرسے دیکھے جاسکتے تھے۔ وہاں کوئی وزیر بننا چاہتا رہتا تھا تو کوئی پارلیمانی سیکرٹری اور کچھ نہیں تو اسٹینڈنگ ممبر کی حیثیت سے بھی لگ جاتے۔ چوہدری شہامت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر پانچ منٹ بعد اس سیاسی جلسے میں سے کوئی اپنا منہ آگے نکال کر اپنے نعتیے پھلانے زور سے اپوزیشن کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا کہ محترم مشرف کے لیگل فریم ورک آرڈر کی مخالفت کرنے کی کیا تلک تھی۔

میں خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ان سیاسی لوگوں کی مضحکہ خیز باتیں سن رہا تھا کہ کسی نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور یہاں کہ میں چوہدری شہامت کا انتظار کروں۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چوہدری شہامت اندر داخل ہوئے۔ میں کھڑا ہوا تو وہ بڑی عزت و احترام سے ملے۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید منہ جو وہ سیاسی صورتحال پر ان کا کوئی روشن میں اندر چل کر رہا تھا۔ میں مسکرایا اور انہیں بتایا کہ چوہدری صاحب یہ اندر چلے جاتے ہیں اور مجھ سے بہت بہتر صحافی یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں کچھ اور بات تھی۔ میرے خیال میں لوگ جانتا چاہتے ہیں کہ کیا قرآن پاک نام پر احمد ان سے ایک سیاسی گفتگو کیسے ہوتی ہے۔ وہ شخص جس کے گھر کو 12 اکتوبر کی رات ٹھہرنے لگا اور میں گھر سے ملے لیا تھا اور اچھلی ذلت آمیز انداز میں گھر کے کنبوں کی جھڑپ لگی تھی وہ ہوا کیسے آس پڑا تھا میں آ گیا تھا کہ جنرل مشرف جیسا کہ وہاں سے حضور کے گھر لے کر آئے تھے۔

چوہدری شہامت محکراتے ہوئے انہوں نے اپنے پاس سے گلا فوس کی ڈیم من کر کوئی احتجاج کیا بات نہیں کہ مجھے چہ نہیں کہ نہیں گلا فوس کا مطلب کچھ نہیں ہے اور انہوں نے اس لقب کو اپنے لیے نہیں لیا اور انہوں نے۔

چوہدری شہامت سمجھتی اور کے لیے چپ ہوئے اور بولے کہ اس کا مطلب ہے آپ کو خصوصاً نام دینا پڑے گا اور یہ گفتگو تو پھر یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ تو کیا خیال ہے کل سے کسی اور جگہ نہ ملا جائے۔ ابھی میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس وقت سٹیٹز پارٹی کے ایک ہائی ایم این اسے رضامندی حیات ہراج کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے لہذا انہوں نے کھل کر چوہدری شہامت کو بتایا کہ کیسے سٹیٹز پارٹی والوں کو ڈرا لیا گیا تھا۔ چوہدری شہامت نے ہاں ہاں میں جواب دیا۔

اگلے دن جب میری ملاقات چوہدری شہامت سے سٹریٹ انٹرویو میں رہائش پذیر وزیر صحت نسیر خان کے گھر ہوئی تو پھر چوہدری شہامت نے اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور ایک نئی کہانی کی ابتدا ہوئی۔

چوہدری شہامت نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوں گے۔ ان کے باپ چوہدری ظہور الہی اور ان کے خاندان کی جتنی بھی فیکٹریاں تھیں وہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء میں جھکاری کے نام پر اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ یوں بھٹو اور چوہدری خاندان میں دشمنی کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ جب جنرل ضیاء نے بھٹو کا تختہ الٹا تو چوہدری خاندان نے آگے بڑھ کر اس فونمی ڈائریکٹر کو اپنے کھلے سے لگا لیا کیونکہ دشمن کا دشمن ہمیشہ آپ کا دوست ہوتا ہے۔ ان تینوں بیٹیوں بھٹو، ضیاء اور چوہدری ظہور الہی کو پتہ نہیں تھا کہ بہت جلد ان کے خاندانوں میں ایک ایسی مستقل دشمنی کی بنیاد پڑنے والی تھی جس کی بازگشت 27 سال بعد بھی اکتوبر 2007ء میں اس وقت ہی لگی جب جنرل بھٹو نے یہاں پر آگ لگا دیا کہ چوہدری چوہدری الہی 18 اکتوبر کی رات کو اپنی بیٹیوں کو لے کر ہٹل کے کمرے میں چلے گئے جس میں راجہ سوہیل پانڈی کا دروازہ کھلا گیا اور ان کی بیٹیوں کا اس سال کی جلد ہی کے بعد انتقال کرنے آیا ہوا تھا۔ بے نظیر کے حوالے تھیں کہ پانچ لاکھ ڈالرز بھی ہوا کیے گئے تھے۔ چوہدریوں نے اس رقم کی بھرتی تو دے لی۔ مگر یہ ناشی میں چوہدری شہامت نے ان بیٹیوں کے خاندانوں کے درمیان دشمنی کم کرنے کی کوشش شروع کی جب انہوں نے وزیر شریف کی حکومت میں وزیر تعلیم کے طور پر جیل میں رہ کر آصف زرداری کو ہٹا دیا۔ بہت جلد ان کے بیٹے اور بیٹیوں میں دشمنی پھیل گئی اور ان سے ملاقاتوں کی اجازت ملنے میں چوہدری شہامت کو اس سخت کے صورتحال میں جان کی آڑ میں باتیں بھی کرنی پڑی تھیں۔







تشریح کے لیے ایک ایسے عمل میں رکھا گیا جس میں بیوقوفی سمجھتی تھی لیکن جس میں اللہ تعالیٰ نے حیرت سے  
 فریاد کیا کہ اپنے لیے بڑی سزا کی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عمل میں اس وقت  
 نہ ہونے لگا اور شریف کی قید سے اور جو کچھ شریف کی شجاعت نے وہاں اپنے خربے سے فراہم  
 کرنا تھا ان سے وہ بھی بڑا ہوا تھا۔ جب وہ اللہ تعالیٰ سے گرفتار تھے تو سزا کی سزا کو نہ سمجھتے  
 تو یہ سزا کی سزا کہ اس وقت وہ ایک بڑے بڑے کے پاس آئے کہ آپ تو اللہ تعالیٰ کا رسول  
 ہو اور ان کے بدلے میں یہاں بیٹھنا ہم سے لے لیا گیا تھا۔ یہ سزا کا ایک فقرہ بھی ان سے  
 ملنے کے لیے آیا تھا جو یہ کہتا کہ آپ اپنی پارٹی کے اندر ایک قادر و طاقتور بنائیں۔ جو ہمدردی شجاعت کو  
 یہ بھی یہ سزا دیا گیا کہ صرف درواری ان سے بیٹھ کر ملاقات کر کے ذلیل کرنے کو تیار تھے لیکن  
 شجاعت اور ہمدردی نے ہمدردی کی حکومت سے بیٹھ کر ذلیل کرنے سے انکار کر دیا۔  
 اس پر میں نے شجاعت سے پوچھا کیا کہ اگر وہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی وقار دار تھے تو انہوں نے  
 12 نومبر 1999ء کے بعد تو اللہ تعالیٰ کا ساتھ چھوڑ کر جنرل شرف کے ساتھ ذلیل کیوں کر لی تھی۔

شجاعت نے بڑی سختی سے میری اس بات کو مسترد کیا کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی وقار دار تھے تو انہوں نے  
 لینے کے بعد انہوں نے بڑے دنوں میں ان کا ساتھ چھوڑ کر جنرل شرف سے ہاتھ ملا لیا تھا۔  
 ان کے بقول تو اللہ تعالیٰ نے جنرل سے ہی انہیں میاں اکبر، اعجاز الحق اور چند دوسرے لوگوں کو  
 پارٹی سے نکال دیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے اللہ تھا کہ انہوں نے پارٹی چھوڑی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہیں  
 پارٹی سے نکال دیا تھا۔ شجاعت نے انہوں سے سوال کیا کہ لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ اصل  
 ان سب کو جو کہ تو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا جو ایک فوجی جنرل سے ذلیل کر کے ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔  
 اپنے اور تو اللہ تعالیٰ کے درمیان اندرونی اختلافات کی کہانی سناتے ہوئے شجاعت نے کہا کہ  
 وہ اگست 1997ء کے بھارتی میٹنگ نے ان کی شخصیت پر بڑا برا اثر ڈالا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات  
 چھٹی تھی کہ وہ کوئی بہت بڑا کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اس پیکر میں انہوں نے ایسے کام  
 نہیں کیے تھے جن کا نتیجہ کچھ ایسا نکلا تھا۔ جب 1997ء کے الیکشن کے بعد ایک مہنگی ہوئی  
 سزا دیا گیا تو اس وقت وہ شجاعت اور ہمدردی کے درمیان اختلافات کی کہانی سناتے ہوئے شجاعت نے کہا کہ

کی تھی کہ وہ ان دنوں سے ہوشیار ہے۔ کچھ معاملات اور تو کچھ۔ شجاعت نے بھارتی پارٹی سے کہے کہ  
 ان کے خلاف کے رہنے اور شریف نے ان سے کہا کہ انہوں کو اپنے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ ان کے بقول تو  
 شریف کی سب لوگ ان کی انگلیوں اور انہیں نصرت کی جو سے بڑا بڑا اور احترام کرتے تھے۔ ہم  
 جب اور دوسری صورت میں ہوا تھا تو وہ عمل چھوڑ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نومبر 1998ء میں  
 تو اللہ تعالیٰ کی سربراہی میں ایک بیٹنگ اسٹیٹ کرنے کے بعد شجاعت نے ہمدردی کو ہمدردی کو ہتھیار  
 اپنی ایم ایل تواری کی حکومت بڑا بڑا ہر ایک کس پلے گی۔

میرے جنس پر چھوڑی شجاعت نے انکشاف کیا کہ اس بیٹنگ کے شروع ہونے سے پہلے  
 تو اللہ تعالیٰ نے وہاں موجود تمام لوگوں سے جن میں انہیں بھی شجاعت کے سربراہان موجود تھے قرآن پر  
 عمل لیا تھا کہ وہ اس بیٹنگ کی بات کو باہر نہیں بتائیں گے۔ اس بیٹنگ میں بہت سی غلطیاں کچھ  
 فیصلے کیے گئے تھے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا ایسے وہ کون سے فیصلے تھے جنہوں نے ہمدردی شجاعت میں جیسے  
 بندے کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

چھوڑی شجاعت کو ہمدردی سوچتے رہے کہ وہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں۔ خاصگی وہ ہمدردی نے جنس  
 ایک اشارہ دیا کہ اس بیٹنگ کے فوراً بعد پنجاب اور کراچی میں ماہرینے عدالت میں شروع ہو گئے تھے۔  
 شجاعت جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، ان کے بقول انہوں نے فیرقہ فتنی فیصلوں کے خلاف  
 مزاحمت کی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ چاہے مجرم ہی کسی، اس کو بھی عدالت میں اپنے آپ کو قانع کرنے  
 کا حق دینا چاہیے۔ شجاعت کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ ماہرین قرآن کو جنرل سے نکال کر ایک جعلی پولیس  
 سٹاٹے میں گولی مار دی گئی تھی۔

یہ بیٹنگ بات ہے کہ چھوڑی شجاعت ان فیصلوں کے خلاف تھے، لیکن ان کی وزارت ان  
 فیصلوں کی مہم بھی کر رہی تھی۔

جب میں نے چھوڑی شجاعت کی آواز میں انہوں کی محسوس کیا تو مجھ میں نے ان سے پوچھا  
 لیجئے کہ اگر وہ سزا سے فیصلے انہیں مل گئے تھے تو انہوں نے انہوں کو ہمدردی سے انکشاف کیا



میں نے وہی شہادت لے سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور بولے کہ رولف صاحب اب ان مسائل  
 قابل نہیں تھے۔ میں نے نو اشریف کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگز میں واحد شخص ہوتا تھا جو ٹکمر سے ٹکمر سے  
 نو اشریف کے اس طرح کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔ یہ میری وجہ سے ہی ہوا کہ گی رولف  
 کو اس طرح کے فیصلے نہ ہو سکے جن سے ان کی اپنی حکومت اور ملک کو شدید نقصان ہوتا۔ شہادت کے  
 بقول سب نو اشریف ملک میں اپنی حکومت برقرار رکھنے کا چاہ رہے تھے اور یہ بات کیجٹ کے  
 سامنے آئی گی تو انہوں نے اس کو سارے پیمانے سے ہی ہٹا دیا۔ تاہم نو اشریف اسے رہے اور انہوں  
 نے آگے کیجٹ میں اس کی منظوری لے لی۔ اس پر پھر پوری شہادت نے نو اشریف کو خبردار کیا تھا  
 کہ ایک دن ہم سب کو ان عدالتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لہذا ابھی ہے کہ ہم ان کے قیام سے گریز کریں  
 اور اگر ایک دن جنرل مشرف نے نو اشریف کی بنائی ہوئی اسی ایک عدالت سے انہیں معزیت دی تھی۔

شہادت کے بقول 112 کتوری بغاوت سے پہلے نو اشریف جو ٹوٹنا کھیلنا کرنا چاہ رہے  
 تھے وہ چھاکہ ہو ہی سرعام اسٹیج کی نمائش کرنے کا اسے سزا دے دی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے  
 انہوں نے فوجیوں کو استعمال کرنا تھا اور 114 کتوری 1990ء کو انٹیکس کی کیجٹ کمیٹی کی میٹنگ طلب کر لی  
 گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا جاتا تھا۔ تاہم وہ دن پہلے ہی ان کا اپنا ٹھکانہ الٹ دیا گیا۔ شہادت کے اسے  
 ایک کام لگا دیا گیا تھا کہ وہ اس میٹنگ میں تمام مظہری کمانڈروں کو اس منصوبے کے بارے میں بریف  
 کریں گے اور آرمی سے کہا جائے گا کہ وہ نہ صرف اس معاملے میں ان سے تعاون کریں بلکہ سرعام اسٹیج  
 کی نمائش کرنے والے لوگوں کو پکڑ کر ان کو سزا دی جائے۔ شروع میں چوہدری شہادت نے اس  
 پلان کی بڑی مخالفت کی۔ ان کے بقول نہ صرف اس قانون کا غلط استعمال ہوگا بلکہ یہ حکومت کے لیے  
 بھی بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ تاہم، شہادت کو کہا گیا کہ وہ 112 کتوری کو یہ سارا پلان کیجٹ کمیٹی  
 کے سامنے دفاع میں پیش کرنے سے پہلے وزیر اعظم سے ڈسکس کر لیں۔ اس میٹنگ میں جنرل پرویز  
 مشرف نے بھی شرکت کرنی تھی اور چاروں مسوہوں کے وزراء نے اعلیٰ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔  
 تاہم سب لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب غیر متوقع طور پر سندھ کے وزیر اعلیٰ فوٹ علی شاہ

نے وزیر اعظم کے حکم کے باوجود اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کہ آج ہی فوٹ علی شاہ پر یہ الزام لگانا  
 ہے کہ انہوں نے فوجی بغاوت کی نہ ہوگی لی تھی اور وہ اس میٹنگ میں شرکت نہیں ہونے لگے۔ شہادت  
 کے بقول ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دن نو اشریف بہت خاموش تھے اور پریشانی واضح  
 طور پر ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی جیسے ان کے ذہن پر کوئی بہت بڑا اہم ہوا۔ یہ میٹنگ کوئی دو بجے  
 کے قریب ختم ہوئی اور تمام لوگ نو اشریف کے ساتھ ہی قائم نظر ہوا جس پہلے گئے تاہم پھر پوری شہادت  
 وہاں سے نکل گئے کیونکہ انہوں نے جاہل سلیپر کے ساتھ لگی کرنا تھا۔

اس سلسلے پر پھر پوری شہادت ٹیوی ریپورٹ کے لیے ریکارڈنگ کے ایک براؤزنگ سیشن لیا اور بولے کہ  
 اگر 112 کتوری والے دن وزیر اعظم کے ساتھ چلے جاتے تو وہ بھی وہاں بہت سارے دوسرے لوگوں  
 کی طرح انہوں کے افسوس رہا ہے جو ہاتھ بندھا ہوا جیل گیا، والدین جیل کو لیا آئی بیٹے جانے کی  
 تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوتے تھے۔

میں نے پھر پوری شہادت سے پوچھا کہ آفر نو اشریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف  
 کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

پھر کسی ٹیگ کیجٹ کے شہادت نے جواب دیا کہ نو اشریف ان دنوں غیر سیاسی لوگوں کے  
 گھیرے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان سے وہ اہتمام فیصلے کرواتے تھے۔ کیجٹ کے کسی  
 ایک ممبر کو بھی اس فیصلے کی پٹنگ نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اور تو اور، شہادت بھی جنرل مشرف کو ہٹانے  
 جانے کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔ شہادت کے بقول شریف برادران کا کچھ مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ  
 بڑے بڑے فیصلے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے قریبی سیاسی ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر گزرتے تھے۔  
 چوہدری شہادت کا خیال تھا کہ اگر نو اشریف نے مشرف کو ہٹانا ہی تھا تو اگر وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے  
 مشورہ کرتے تو اس سارے کام کو بڑے بہتر انداز میں کیا جاسکتا تھا۔ شہادت کا اپنا خیال تھا کہ سری لنگا  
 سے واپسی پر اگر مشرف کو بلا کر یہ کہا جاتا کہ انہیں آرمی چیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے تو کوئی  
 آسمان نہ گر پڑتا۔ شہادت کے ذہن میں کوئی ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ جنرل مشرف کے پاس  
 آنے کا ذمہ دار اور کوئی نہیں، نو اشریف خود تھے۔ شہادت اکثر نو اشریف کو بتایا کرتے کہ آپ فوجی





تاریخ میں اسے جلال شرف رکھئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک بھولی سی اٹرنی کالی اور اس  
روم ہنگوی ہار میں بولی شروع کر دی جس میں انہوں نے نواز شریف کے ساتھ کارگل پر قبضیل سے  
کھڑکی بولی تھی۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ اس میٹنگ میں سوجھ بوجھ اس کے نام واپس ان کا ساتھ دینا  
کے مرنے اور جہاں وقت کارن منسٹر تھے اور شجاعت وزیر داخلہ ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔  
..... وہاں پہلے ہے۔

تاہم وہ سول میں آگے بڑھی تو شجاعت نے کہا کہ اب چونکہ مسئلہ بہت مشکل کیا ہے لہذا  
ہوں بیٹھے تو شرف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے استقامت سے بھلا دیں اور پریس کو ایک میسج کہ بیان  
بجانب اس میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں اور شرفی لینڈ ریسٹ کا میسج کہ بیان تھا۔  
تاہم نواز شریف نے جو دعویٰ شجاعت کی یہ بات نہیں مانتی بلکہ شجاعت کی اس بات سے  
نواز شریف شرف سے ملے اور جب وہ میسج سے اٹھ کر جانے گئے تو انہوں نے شجاعت سے نہ  
باجوہرہ نہ فریضہ نہ ملا کہا۔ یہ جو دعویٰ شجاعت کے لیے بڑا مشکل تھا کہ وہ کارگل کے سگے پر  
جزل شرف کی صورت کہنے پر ان سے ملتا ہے۔

ان امر سے پھر شرف نے شجاعت سے پوچھا کہ جزل شرف کی بھارت کا سب سے بڑا فائدہ تو  
ان کے ہاتھوں کو ہوا تھا جس طرح وہ بڑا عظیم نواز شریف کی مخالفت کر کے جزل شرف کی حمایت  
کرتے رہے تھے اس کا انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

تاہم جو دعویٰ شجاعت میری اس بات سے متفق نہیں ہوئے اور بولے کہ جب اس ملک میں  
داخلہ کا تو جزل شرف کے اور حکومت میں انہیں اور ان کے خاندان کو سب سے زیادہ سیاسی انتقام  
کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ بتانے لگے کہ جو نئی بھارت ہوئی، ایک آرمی - بھرا لاہور میں واقع ان کے گھر پر  
ہلکا۔ اس نے ان کی فواتح کے ساتھ بد قیڑی کی اور ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ شجاعت  
میں کی پہلی کوٹنگ کرنے کی فریض سے ایک بہت بڑے لیول کی ٹیم ان کے گھر بھیجی گئی تھی کہ وہ جا کر ان  
کے ہاتھ روک چیک کریں تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ کتنے امیر لوگ تھے۔ اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور  
انہیں انتقام کے حالات کے جواب دینے کے لیے کہا گیا کہ ان کا کہن، ہاتھ روک فٹنس اور اس طرح

کی ایک بھولی سولی جڑ میں کپے اور کیو کر گئی تھی۔ ہاتھ روک میں بڑی بھولی جڑوں کی تصبیحات لراہم  
کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ دعویٰ شجاعت نے پھر بھی جس سے کام لیتے ہوئے ان حالات کے جواب  
دینے۔ تاہم اس کے روز ایک اور ٹیم وہاں بھیجی گئی جس کے ہاتھ میں وہ ہتھیار تھے اور انہوں نے ہاتھ  
روک اور ہتھیار چیک کر کے شروع کر دیے کہ کیا واقعی ان کو چیک جواب دینے کے تھے۔

جب یہ دعویٰ شجاعت کے گھر اس طرح کا پھانسا لیا گیا تو انہوں نے پہلی اور طارق مزیز کو  
ٹیلی فون کیا جس اس وقت جزل شرف کے ساتھ تھے۔ طارق مزیز نے شرف سے پوچھا تو جزل نے کہا  
کہ انہوں نے اس طرح کے کوئی آزاد رہا نہیں کیے۔ تاہم یہ دعویٰ شجاعت کی پہلی کے خلاف اس  
طرح کے ایکشن ہوتے رہے تھے کہ ان کے ہاتھوں کا اور ان کے گھر پر

جب شجاعت نے طارق مزیز کا نام لیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ  
انہوں نے طارق مزیز کو استیصال کرتے ہوئے جزل شرف سے اپنے تعلق سے استیصال کر کے آنے  
والے دنوں میں اس ملک کے پہلے سیاسی گانا گار کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

طارق مزیز جو دعویوں کے اس وجہ سے بھی بڑے مسخ تھے کہ جب ایک سول سروٹ کی  
حیثیت سے آصف علی زرداری ان سے شدید بارش ہوئے اور انہوں نے ان کے گرد گھیرا لگ کر نے  
کی کوشش کی تو ان کی جو دعویوں نے جان بچائی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ طارق مزیز جو دعویوں کے  
ان احسانات کا بدلہ چکاتے۔ تاہم یہ جو دعویٰ شجاعت اس بات سے انکاری تھے کہ طارق مزیز نے ان کو  
کوئی سیاسی رول لے کر دینے میں کوئی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے شجاعت  
نے انکشاف کیا کہ آپ طارق مزیز کی کیا بات کرتے ہیں۔ وہ تو میری جزل احمد سے ایک میسج بھی  
کرانے میں ناکام رہے تھے۔ یہ میسج جزل شرف کے کہنے پر ہوئی تھی کیونکہ شرف چاہتے تھے کہ میں  
ان سے مل کر اپنے خلاف ٹیب میں رجسٹرڈ کیے گئے تمام کیسز کی وضاحت چوں کروں۔ طارق مزیز کی تمام تر  
کوششوں کے باوجود جزل احمد سے ان کی میسج نہیں ہو سکی تھی۔ شجاعت کے بقول جزل شرف کی  
حکومت نے دراصل The Most Wanted کے نام سے سیاستدانوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جس کا  
نام "Big Heads" رکھا گیا تھا۔ جو دعویوں کے خلاف مقدمات قائم کر کے انہیں ہراساں کرنے کا









نہیں رکھتے تھے تاہم جنرل شرف زخمی تھے بلکہ چوہدریوں کے اپنے حلقوں کی سیاست کا اظہار ہی اس جنرل کی زندگی اور زندگی کے ساتھ منسلک تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں اور بات یہ ہے کہ چوہدری شجاعت وردی میں ملیوں آری جرنیلوں سے تقابلاً ان کے سیاست میں ترقی کی صورتیں ملے کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے باتوں باتوں میں یہ انکشاف کیا کہ جیسے ایک ان جنرل مسلم لیگ نے انہیں ملنے کی دعوت دی۔ جب وہ چوہدری الہی کے ساتھ وہاں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو بیگ صاحب نے ان دونوں کو گردنوں روپے دینے کی پیشکش کی۔ یہ نیکرستہ رقم انہیں میران بیگ کے اکاؤنٹ سے ملی تھی۔ یہ وہی میران بیگ اسکینڈل ہے جس کے بارے میں اصغر خان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ کیسے جنرل مسلم لیگ اور ریٹائرڈ آرمی می ایس آئی ایس اسد درانی نے سیاستدانوں میں چودہ کروڑ روپے کی رشوت ہانپی تھی۔ جن سیاستدانوں کو میران بیگ سے پیسے دیئے گئے تھے ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ہام صادق، ایم کیو ایم کے الطاف حسین، یوسف حسین، جاوید ہاشمی، لیاقت جتوئی، ایم کیو ایم کے آفاق احمد، امتیاز علی، ہام معشوق، اہمل خان، دوست محمد فیضی، عدنان ولد سرتاج عزیز وغیرہ شامل تھے۔

چوہدری شجاعت کے بقول جب وہ مسلم لیگ کے گھر پہنچے تو وہ انہیں ہارڈوں کی شرٹ پہنے بہت دیکھیں نظر آ رہے تھے۔ جنرل بیگ نے ان دونوں چوہدریوں کو بتایا کہ انہوں نے ایک پلان بنایا ہے جس کے تحت آئی سی آئی کے پلیٹ فارم سے لانے والے تمام سیاستدانوں کو ان کے الیکشن کے لیے پیسے ایسے ہائیں گے۔ چوہدری شجاعت حسین ایک سرونگ آری چیف کے منہ سے اتنی بڑی بات جو اسنے آرام سے کہی تھی سن کر ششدر رہ گئے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ سے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل مسلم لیگ کو چوہدریوں کا یہ انکار سن کر بڑا احمق لگا کیونکہ اب تک ان سے آئی ہارڈ میں ہر کسی نے پیسے لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ مرزا مسلم لیگ نے یہ سمجھا کہ انہوں نے چوہدری شجاعت سے اپنے نام پر پیسے لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہذا یہ لگا پھرتا دکھانا شروع کر رہے تھے۔ چنانچہ جنرل بیگ نے انہیں پتہ لگایا کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولنے کے بجائے اپنے کسی دوست کو اکاؤنٹ کھولنے سے روک دیا۔ اس کے نام پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے فرسٹ کر دیئے

جانتے تھے۔ چوہدریوں کا حوصلہ نہ جاننے کے لیے جنرل بیگ نے یہ بھی حلقوں کی کہ اس وقت اکاؤنٹ میں گا ہے لگاتے پیسے فرسٹ ہوئے راجی گے اور وہ پیسے چھوڑ پارتی کو انکسٹن جراتے گئے لیے استعمال کر سکیں گے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے ایک گھڑا سیاستدان کی طرح ایک بیوقوف سمجھنے سے انکار کر دیا جو پانی میں تکیڑا کھانے کے پکار میں دریا کے کنارے ایک کھارنی کا پتلا اٹھ لیتی ہے اور پھر اس کی قسمت کا فیصلہ وہ چھاری کرتا ہے۔ چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ کو بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کی گھڑیا سیاست کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ نظری جرنیلوں سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ ایک حیران اور پریشان آرمی جنرل کو چوہدری شجاعت نے بتایا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی پارٹی کے بہت سارے لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے خود پیسے فراہم کرتے ہیں۔ بھلا انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب وہ ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ انہوں نے جنرل بیگ کو بتایا کہ وہ ان سے ایک روپے بھی نہیں لیں گے اور اپنی جیب سے سارا الیکشن لڑیں گے۔

چوہدری شجاعت نے مجھے بتایا کہ جب جنرل بیگ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں تو یکدم آرمی جنرل کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ چہرے پر کبھی ناراضگی ساف نظر آ رہی تھی۔ جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت پر زور ڈالا کہ وہ پیسے لے لیں۔ تاہم، آخری حربے کے طور پر جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت کو کہا کہ لھیک ہے، اگر وہ خود پیسے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ ایم این این اور ایم پی این کا الیکشن لڑنے والے ان لوگوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں جو چھوڑ پارتی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ جنرل بیگ کے بقول ان تمام امیدواروں کو میران بیگ سے قیوں کی ادائیگی کی جائے گی۔

چوہدری شجاعت نے اس بات کا میرے سامنے امتزاف کیا کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک آرمی چیف کو ناراض کرنے کی جرات کر رہے تھے جس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں لگتا تھا۔ لہذا انہوں نے بڑی گھڑاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل مسلم لیگ سے ہمدردت مانگا اور کہا کہ بہت جلد وہ ایک فہرست بنا کر ان کے حوالے کریں گے جو ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑنے پر راضی ہو جائیں۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے کہا کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی جنرل بیگ سے ملنے نہیں گئے اور وہی انہوں نے اس







اور پرویز الہی نے آصف زرداری سے شکایتیں بلا جانے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کا انقلاب کیا گیا۔ قدرت نے یہ دن دکھانے تھے کہ جو بددلی شہامت اور پرویز الہی جن کی مرضی کے بغیر اس ملک میں آٹھ سال تک کوئی پتہ نہیں ہلا تھا، آج ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر جا رہے تھے تاکہ اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچائی جاسکے۔

اپنے اخبار میں یہ کہانی لکھیے ہوئے مجھے اپریل 2005ء کی ایک صبح یاد آگئی جب میں بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ آصف علی زرداری کے ساتھ دہلی سے آکر لاہور ایئر پورٹ پر اتر اٹھا۔ زرداری صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ملک بھر سے آئے ہوئے پارٹی ورکرز پرویز الہی کی پنجاب پولیس کے ہاتھوں اڈے کما کر ایوان ایئر پورٹ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف زرداری کو ایجنسیوں نے یقین دلا یا تھا کہ گروہ فورس کرپس تو ملک میں نئے انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کی پارٹی حکومت ہوائے کر دی جائے گی۔ آصف علی زرداری صاحب بھی ایجنسیوں کے مہمانے میں آ گئے۔ تاہم لاہور ایئر پورٹ پر جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گیم ختم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جہاز کے اندر لاہور کے ایس بی ٹیکن نے آکر آصف زرداری کو سیلوٹ مارا تو انہوں نے اپنی راجی سکرابت سے اس نوجوان آفیسر کو کہا کہ تمہارے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہوں گے لہذا مجھے لے چلو۔ ہم سب صحافیوں نے حیران ہوئے کہ یہ صاحب تو لاہور فتح کرنے آئے لیکن وہ چپکے سے ایسی ٹیم کے ساتھ سرینگر گازی میں پہنچ کر زرداری ہاؤس چلے گئے اور پرویز الہی کے کمانڈرز نے ہم صحافیوں کو مارا کر دیا۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم نے زرداری صاحب کے ساتھ دہلی سے آنے کی نراحت کیے کی تھی۔

آٹھ دنوں کے دوران ہوا کہ وہی پرویز الہی اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ گئے تھے اور سومر صاحب نے بھی پنجاب کے ان جہازوں کو مارا نہیں کیا اور اپنے صاحب نے اس میں ایسی چیزیں ڈالنے کے ارادے سے صحافیوں کو مارا لیکن جہازوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں ایک ایک صحافی کے ہینڈل کے اہل کاروں نے انہیں نکال دیا اور انہیں جہازوں سے اترنے کے بعد وہاں جہازوں پر تھکنے کے اہل کاروں نے انہیں جہازوں سے اترنے کے بعد انہیں لے کر دہلی لے گئے۔

کے گرد منڈلاتے تمام فطرات بھی دور ہو گئے۔ اس کے بعد جو بددلی شہامت اور پرویز الہی نے آصف زرداری کے صدر بننے کے بعد ان صدر میں رات کے اندر میرے میں کئی کھانے کھائے جہاں یہ منصوبے بنائے گئے کہ پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف کی کرکے توڑی جائے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی پنجاب میں گورنر راج لگا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب لوگوں نے دیکھا کہ کیسے ان سب لیڈروں کو اپنا قہو کا ہوا چاٹنا پڑا۔ نہ صرف نواز شریف اور شہباز شریف عدالتوں سے بحال ہوئے بلکہ پنجاب حکومت بھی واپس کر دی گئی۔

اپنے ایف ایٹ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے جو بددلی شہامت اور پرویز الہی مجھے یہی سمجھا رہے تھے کہ مجھے اس طرح کی خبریں نہیں چھپانی چاہئیں۔ ایک بات کی میں یقیناً دادوں گا کہ میں نے جو بددلی شہامت اور پرویز الہی کے خلاف ان کے قرضے معاف کرانے سے لے کر فیصل آباد کی سونیا ناز کے ساتھ پنجاب میں ہونے والے ریپ کیس اور اب قیوم سومرو کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی کئی ایسی خبریں چھپانی تھیں جو یقیناً کوئی بھی سکران پسند نہیں کرتے۔ لیکن کسی ایک دن بھی جو بددلی شہامت یا پرویز الہی نے میرے ساتھ کئی یا سختی سے بات نہیں کی بلکہ جب اور جہاں ملے بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تمام سیاسی لیڈروں کے برعکس جو بددلی شہامت اور پرویز الہی میں ہم صحافیوں کو اپنے خلاف لکھنے کے باوجود برداشت کرنے کی بہت بڑی کوالٹی ہے۔

یہی وجہ ہے میں چپ چاپ جو بددلی شہامت اور پرویز الہی کی باتیں سنتا رہا اور جب اٹھنے لگے تو ان سے ایک ہی بات کی کہ جو بددلی صاحب آپ نے مجھ سے پانچ سال پہلے جنرل قیام کی انکواری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور آپ نے آج تک میرا وہ کام نہیں کیا۔ جو بددلی شہامت توڑنے کے لیے آپ سے گئے اور بولے کہ جس دن انہیں اور کچھ صحافیوں کے وہ انکواری رپورٹ دیکھیں گے ان حالات سنا لیں گے۔ جو بددلی صاحب کو روکھنے ملے جس اور انہیں انہوں نے جنرل قیام کے حیارے کے اٹھنے کی رپورٹ سنا لیں گے انہیں یہ بھی لیکھا تھا کہ جانتے لگے گت مجھے یہی ہے اور اس کا کیا ہے۔







مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کے پاس کس طرح کے راز ہو سکتے ہیں اور وہ کتنی حد تک ان رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ یہ ٹیبلٹ ہات ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جتنے پروفاکٹس اب تک کیے ہیں چوہدری نثار کا پروفاکٹس سب سے زیادہ پاورفل اور رازوں کے انکشافات سے بھرا ہوا تھا۔ چوہدری نثار سے کیسا واقف تھا ان کے گھر پر ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اچھے میزبان ہیں اور کوئی گھبراہٹ سے نہیں تھا اب عدویہ کے دوران کوئی چیز کھانے پینے کے لیے آجاتی رہی ہو۔ میں ان کے بلا سے پیارے بچوں نکلتا اور توہر کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ان دنوں میں جب میں ان کے والد صاحب سے اجازت کرنے مگر جاتا تھا مجھے بڑی اچھی تپنی دی اور گپ شپ کی۔ تیور کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے اور وہ ہم اکرم ان کے بلا سے ٹورٹ کھا رہی تھے اور مجھے امید ہے کہ چوہدریوں کا یہ بیٹا شاید اپنے آپ کو ان کے فنی اور سیاسی خاندان سے بھارت کر کے کسی دن کرکٹ میں نام روشن کرے۔

جب میں چوہدری نثار کے اراکھ روم میں بیٹھا تو نثار نے چھوٹے ہی پہلی بات یہی کی کہ ہاں بھائی اجس جگہ آپ بیٹھے ہیں اسی جگہ آئی امیں آئی کے سربراہ جنرل محمود ان کی متیں کرتے تھے کہ جنرل شریف کو پھیر کر جنرل شریف کے ساتھ ل جائیں تو وہ کونسا بڑا اجداد ہے جو انہیں نہیں دیا جا سکتا ہے جس کی شریف کے ساتھ اور رہنا پاتے تھے۔ یہ ٹیبلٹ کہانی ہے کہ بعد میں کٹھوم نواز کی وجہ سے ان کے اشتیاق نثار شریف سے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ایک مرحلے پر وہ بڑی بھیدگی سے چھڑ پائی تھی کہ نثار کو کہہ رہے تھے۔ اس کام کے لیے یہ نظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آنت پر اپنے سے اور اپنے میں تھے اور سوانت مگر ہاتھ ہو چکے تھے کہ چوہدری نثار نواز شریف کو پھیر کر اب یہ نظیر بھٹو کے لیے یہ سوانت میں لے

چوہدری نثار نے اپنے گھر میں بھارتیوں کے چرے کو دیکھا تھا کہ ایک کے بعد دوسرے کے گھر سے اور وہ کسی کے گھر سے کسی کے گھر سے لے کر آتے تھے۔ چوہدری نثار کی شہرہ بھاری تھی مگر ان کی جان بھاری تھی اور ان میں آتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ایک سوانت میں لے آئے مگر ان کی طاقت کے باوجود چوہدری نثار نے یہ سوانت نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی دفعہ قومی اسمبلی کے گھر تک ہوئے تو انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایک ان سوانت میں اس تمام ہونجی کے جہاں وہ آج کھڑے تھے۔ چوہدری نثار کو

نواز شریف اور محمد خان جو نیچو میں سے کسی ایک لیڈر کا انتخاب کرنا تھا اور نثار نے نواز کا کیا۔ نثار کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں انہیں یہ لگتا تھا کہ وہ ایک پیدائشی سیاستدان تھے۔ جب وہ پہلی دفعہ قومی اسمبلی کی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی باتیں نیچے سے کا پ رہی تھیں۔ جب نثار نے اپنی پہلی تقریر ختم کی تو اس وقت کے وزیر خزانہ محبوب الحق نثار کی سیٹ کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ نثار آج کے بعد تم میرے پارلیمنٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرو گے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے چوہدری نثار کو تمام مالی معاملات پر مکمل آزادی دی۔ نثار نے ڈاکٹر محبوب الحق سے بہت کچھ سیکھا جو ان کی آنے والی سیاسی زندگی کا بہت بڑا ثبوت ثابت ہوا۔ تاہم، بہت جلد جنرل نیپا اور جو نیچو کے درمیان اشتیاقات پیدا ہوئے اور ڈاکٹر محبوب الحق کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا۔ یاسین انوکو نیا وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ایک دن جو نیچو نے نثار کو بلایا اور اس کے کام کی تعریف کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ اسے وزیر بنا دیا جا رہا تھا۔ نثار نے جو نیچو کا شکر یہ ادا کیا اور یہ درخواست کی کہ اسے اگر وزیر بنانا بھی ہے تو وزیر مملکت برائے فنانس بنا دیا جائے۔ جو نیچو صاحب مان گئے۔ تاہم، چوہدری نثار کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب وہ حلف لینے کے لیے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں وزارت ہنزولیم کا وزیر بنا دیا گیا تھا۔ بعد میں نثار کو پتہ چلا کہ یاسین انوکو اپنی وزارت میں اپنی منشا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم، نثار نے قومی وزارت میں دلچسپی لیرا شروع کی۔ وہ وزارت انہیں اتنی اچھی لگی کہ اس کے بعد جب بھی نثار کے پاس ہوا اس آئی وہ پیش ہنزولیم کے وزیر ہی بنے۔

میں چوہدری نثار سے یہ پوچھنے کے لیے رہا تھا کہ آخر جنرل نیپا اور محمد خان جو نیچو کے درمیان ایسے کون سے اشتیاقات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنیاد پر چوہدری نثار نے وزارت قومی کی تھی۔ چوہدری نثار نے قہر لکھا اور بولے کہ محمد خان جو نیچو کو تمام سیکرٹس انکلیسیوں سے بڑی محنت اور کوشش کے بعد ڈھونڈ کر آئے۔ یہ کہہ کر جنرل نیپا کے سامنے پیش کیے تھا کہ اس سے اگر وہ اپنے سربراہ لیڈر ہنزولیم کے لیے کے لیے کوئی اور شخص مل سکتا ہے۔ تاہم محمد خان جو نیچو نے جنرل نیپا کی ساری خوشی سنی اور کہہ دی کہ وہ ہنزولیم بننے ہی جو نیچو نے جنرل نیپا کے قریبی ساتھی اور اس وقت کے وفاقی سیکرٹری انار بھٹو جنرل بھٹو کو طرف کر دیا۔ آنے والے دنوں میں بات حریف بڑھتی گئی جب جو نیچو نے ان جنرل بھٹو کو ہنزولیم دینے سے انکار کر دیا جنہوں نے یہاں پر بھارت کو قہر کرنے دیا تھا۔



تعمیر ہو چکی تھی۔ یہ بات سنا کر چار گھنٹے کے اندر میں نے اپنے کچھ دوستوں کو بلوایا اور ان کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص کو بھی بلوایا۔ ہم نے کہا کہ اس معاملے میں ہمیں ایک ایسی کارروائی کرنی چاہی جس کا مقصد ان کے اندر امن و امان پیدا کرنا ہو۔

اپنا کچھ بھائی بھانجے اور بہنوں کو بلوایا اور ان کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص کو بھی بلوایا۔ ہم نے کہا کہ اس معاملے میں ہمیں ایک ایسی کارروائی کرنی چاہی جس کا مقصد ان کے اندر امن و امان پیدا کرنا ہو۔

28 مئی 1988ء کو جب نوجو حکومت قائم کی گئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہت جلد وزیر اعلیٰ جنسین جنرل ضیاء نے برطرف کیا تھا وہ دو بارہ ملک نے کران کی نگرانی میں قائم کی گئی اور میں رہنے لگے تھے۔ پھر ریٹائر ہو گئے ان وزیروں میں شامل تھے جبکہ پنجاب میں نواز شریف نے قائم مقام وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ تاہم، ٹار نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز اور انہوں نے خود ہی بلج کے خلاف جنرل ضیاء کی حمایت کر کے غلطی کی تھی۔ تاہم، ٹار نے کہا کہ شاید اس لیے کے لیے یہ وجہ تھی کہ پنجاب میں وہی پکا زام صاحب مسلسل نواز شریف کے خلاف ایک سیاسی گروپ کو اپنے حلقے کا قیام دیا ہے تھے۔ ان دنوں سے پاس ایک بڑی وجہ بن گئی تھی کہ ہم اسلام آباد میں ہی پکا کے سربراہ کاظم کا ساتھ نہ دیں۔ تاہم، ٹار نے یہ بات مان لی کہ چاہے وہ کچھ بھی ہو، یہ سب شخصیات چاہیے تو انہیں سیاسی قوتوں کو ایک سیاسی وزیر اعظم کا ساتھ دینا چاہیے تھا کہ وہ وہی میں بیٹھے تھے ایک جنرل کا ہیں جنرل ضیاء نے نواز شریف اور جوجو کے درمیان اختلافات کا یہ اقدام اختیار کیا تھا کہ وہ اس وقت حکومت چھین کر لیں۔

تاہم، یہ بدلی ٹار کے اندر ابھی بھی ایک سیاسی دور کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ضیاء نے

جوجو کی حکومت کو 27 مئی 1988ء کے خلاف ایک ایسا دورہ کیا تھا۔ یہ بیان چھ ماہ کے بعد شریف نے لکھا تھا اور یہ حمایت کی کہ وہ اس طرح کے بیان دینا نہ کرے اور اس پر چپ ہو گئے۔

میں نے 28 مئی سے پانچ لاکھ جنرل ضیاء کی مصیبت کس طرح کی تھی۔ وہ بولے ضیاء نے اس وقت کے مزاج کے تھے اور یہی شہادت سے پہلے آتے تھے۔ تاہم، جوجو حکومت برطرف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک بار مل زندگی شروع نہیں کر سکے تھے۔ جوجو حکومت کی برطرفی سے لے کر اپنی موت تک ٹار نے شاید ہی جنرل ضیاء کو ابھی سوا میں دیکھا ہو۔ 28 مئی کو ایک دن کا پورے ملک سے پہلے ٹیلی ویژن کے کمرہ میں کے آنے سے قبل جنرل ضیاء نے اپنے تمام وزیروں سے کہا کہ وہ ہاری ہاری کیمبرے کے سامنے مسکرائیں تاکہ عام پبلک میں یہ تاثر پائے کہ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی ہرگز پریشان نہیں ہیں۔ اس ایک بات سے جنرل ضیاء میں کچھلی ٹینشن اور پریشانی کا اندازہ ہوتا تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔

ہاتوں ہاتوں میں ٹار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ جنرل ضیاء کا عیار نہ کر لیں ہونے سے کچھ دن قبل جنرل ضیاء کے سینئر وزیر اسلم بنگ نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہذا وہ ہوائی جہاز کا سہارا ترک کر دیں۔ جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کو بتایا کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ ٹار کے بقول جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا حالانکہ اسلم بنگ کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی اندر کی انٹاریشن موجود تھی کہ جنرل ضیاء کو قتل کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جنرل ضیاء پاکستان کی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے لیے اب ایک بہت بڑا بوجھ بن چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنرل ضیاء اپنی موت سے قبل یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں سے انتخابات نہیں کروائیں گے اور مختلف آپشنز پر غور ہو رہا تھا۔ ایک دن جنرل ضیاء نے کیبنٹ میٹنگ بلائی اور اپنے تمام وزیروں سے یہ پوچھا کہ کیا ملک میں سے الیکشن ہوتے چاہئیں۔ وزیروں کی اکثریت نے ملک میں سے انتخابات نہ کرنے کا مشورہ دیا اور یہ تجویز دی کہ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا جائے۔ ان وزیروں نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ وہ ابھی بھی ملک میں بہت زیادہ پاپولر تھے اور بینظیر بھٹو کو صدارتی انتخاب میں شکست دے سکتے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ان وزیروں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ ایک عورت کو 111 تھیں دیں گے۔ ٹار نے جب یہ























رجز کے بعد ہزار میں جا کر بیٹھیں آف سٹاف کھلی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، عام توقعات کے برعکس جنرل کرامت کا بیٹھ سیکھ رتی کونسل نے اس کا متنازعہ بیان ہی ان کے نواز شریف کے ساتھ گفتگو کی کوئی ایک ہفتہ تھا۔ نواز شریف کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ جب جنرل کرامت اپنے وطن کے ایک ایسے دوست سے ملے جو نواز شریف کے بھی دوست تھے تو انہوں نے وزیر اعظم کے پاس سے کہا کہ یہ ریلوے کے ایسے ایسے دوستوں سے نہیں کیا گیا۔ نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے اپنے بارے میں کہے گئے ریلوے کے بارے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اپنی بات سے منکر تھے۔ نواز شریف اور جنرل کرامت میں بات آتی رہی کہ تمہارا وہ بارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد کا کہہ رہا تھا کہ اس کے دوستوں میں سے کئی کوئی نہی۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان بیٹھنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنرل جہانگیر کرامت اپنی مرضی کے ایک جنرل ملی قومی خان کو اپنے بعد آری چیف بنوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے وہ ان بات کو بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم نواز شریف کو سیکرٹ اینجینیئروں نے کھانسی پر چڑھ کر بھی لکھی تھیں جو توقع آری چیف کے خلاف تھیں۔ اس وقت کے ڈی ای آئی ایس آئی جنرل نسیم رانا بھی نواز شریف کے پاس سے چیف آف آری سٹاف کے متوقع امیدواروں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کر آئے تھے جو ٹیکے تھیں۔ جنریلوں کی حرکتوں اور ان کے کڑوتوں کے بارے میں سیکرٹ اینجینیئروں کی تیار کی ہوئی اور پورے نہیں دیکھ کر چوہدری ثار پہلی دفعہ بڑے ڈسٹرب ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیکرٹ اینجینیاں اپنے سر و تک جنریلوں کے بارے میں بھی اس طرح کی چیزوں کا خفیہ ریکارڈ رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف اور صدر فاروق لغاری کے درمیان تعلقات خراب ہوئے تھے تو جنرل کرامت نے بھی ایک خط وزیر اعظم کو لکھا تھا جس پر نواز شریف خوش نہیں تھے۔ جنرل کرامت نے لونت کی کمر پر آفری تھا اس وقت رکھا جب انہوں نے نیول وار کالج والاہور میں بیٹھ سیکھ رتی کونسل خانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اس خطاب سے اسلام آباد میں بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ چونکہ یہ بھی یہ تھی کہ جہانگیر کرامت نے بیٹھ سیکھ رتی کونسل کا نام اپنی تقریر میں نہیں لیا تھا لیکن جب آئی ایس آئی آئی کے سربراہی طور پر بیٹھ سیکھ رتی کونسل کا خط پر نہیں بلکہ میں شامل کر کے لپٹی وی کو بھیجا تو اس سے

حکومت کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سیر نہیں ہے۔

نواز شریف نے سوچا کہ اب کافی ہو گیا ہے۔ جنرل کرامت نے اپنی صدارت سے تمنا کر لیا تھا۔ نواز نے ہر قیمت پر جنرل کرامت کو گھر بیٹھے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری ثار اور شہباز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن نواز شریف نے یہ کہہ کر ان کی بات مسترد کر دی کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک میں اب سو بیس لوگوں کی رٹ قائم کی جائے۔ نواز نے جنرل جہانگیر کرامت کو وزیر اعظم ہاؤس والا یا اور غیر متوقع طور پر کرامت کے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی۔ اسی شام ڈی ای آئی ایس آئی رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کو آ کر دے گئے۔



اب نواز شریف کو ایک دفعہ پھر ایک سے آری چیف کی تلاش تھی جو ان کے خیال میں ایک سو بیس حکومت کو جو اب وہ ہو اور وہ نہ تو وزیر اعظم کو کسی صدارت کے حق میں خط لکھے اور نہ ہی اپنی تقریروں میں کھلے عام بیٹھ سیکھ رتی کونسل بنانے کی تجویز پیش کرے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بیٹھ بیٹھے ملک کے وزیر اعظم کے خلاف گفتگو بھی نہ کرے۔ جنرل ملی قومی خان کے خلاف چوہدری ثار اور جنرل افتخار ملی خان پہلے ہی محاذ بنا چکے تھے اور نواز شریف چوہدری ثار سے پوچھے بغیر کوئی نیا آری چیف نہیں لگانا چاہتے تھے۔

جب میں نے ثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف کو کس نے آری چیف بنوایا تھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ نواز شریف نے خود ہی مشہور صحافی سہیل وزرائی کو جہدہ میں دیکھے گئے اپنے ایک اسٹریو میں یہ کہا تھا کہ انہوں نے چوہدری ثار کے کہنے پر انہیں آری چیف لگایا تھا۔

چوہدری ثار نے مجھے جنرل مشرف کو آری چیف بنوانے کی کہانی سنانا شروع کی۔

جس شام ڈی ای آئی ایس آئی جنرل رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کے حوالے کر گئے تو نواز شریف نے اپنے مطری سیکرٹری سے کہا کہ وہ کور کمانڈر منگھ لیٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے پہلے نہیں آ کر لیں۔ جنرل مشرف کو جب یہ ٹیلیفون کال ملی تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ ملک کا وزیر اعظم جس نے کچھ دن پہلے آری چیف

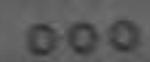


سے استعمالی لیا تھا۔ انہیں اس طرح ہمارے کون سا ہوا ہے۔ جنرل شریف اسے گھبراہٹ کے انداز میں  
نے فوری نگرانی سے پوچھا کہ کیا میں وزیراعظم سے ملنے کو بللارم میں آؤں یا سادہ کپڑوں میں آ  
جنرل شریف کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا وزیراعظم ان سے سرکاری طور پر ملنا چاہتے تھے یا وہ ان  
سے کوئی لیبہ پہنک کر چاہتے تھے جس کا ٹون کی اعلیٰ قیادت کو علم نہ ہونے کی بنا پر۔ جنرل شریف کو اتنا  
کہا کہ وہ لیبہ پہنک کر وزیراعظم سے ملنے آئیں۔

ہاں، جنرل شریف کو پوچھنے کے لیے جو لے کر وہ وقت پر وزیراعظم ہاؤس نہ گئے۔  
یوں بیانی دی لے لہجے کی خبروں میں جنرل جہاںگیر کراہت کے استعمالی کی خبر تو چلا دی تھی اور ساتھ میں  
جنرل شریف کو کیا آری چیف ہانے کا بھی اعلان انہی خبروں میں کیا گیا۔ اس وقت جنرل شریف  
اسلام آباد آ رہے تھے۔ ایک نئی جگہ تھے اب انہیں سوچنا تھا کہ ان کے کسی دوست کا فون آیا کہ انہیں نیا  
آری چیف بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت جنرل شریف کو یہ احساس ہوا کہ انہیں اہر ہنسی میں وزیراعظم  
ہاؤس میں بلا دیا گیا ہے۔

چوہدری نثار کے بقول فوج میں ہر آری جنرل کی اپنی ایک لابی ہوتی ہے۔ اگر جنرل کی لابی  
پہلے نہ ہو تو آری چیف بننے کے بعد خود کو وہیں چاہتی ہے۔ نثار نے جنرل شریف کو آری چیف بنا دیا تھا  
تہا یہ بحث اب بیکار ہے کہ ان کا نام جنرل شریف کو کس نے دیا تھا۔

سے آری چیف کی تقرری کے وقت نواز شریف کے پاس تین ہرنیلوں کے نام موجود تھے جن  
میں جنرل علی قلی اور جنرل پرویز شریف بھی تھے۔ تاہم، نثار نے سٹیک کے بعد مقابلہ جنرل علی قلی اور  
پرویز شریف میں تھا۔ نواز شریف علی قلی نثار سے خوش نہیں تھے۔ غصہ سا جب سے جنرل کراہت کے  
ساتھ ان کی ٹینشن شروع ہوئی تھی۔ جنرل علی قلی نے فوج کی کسی اہم ذمہ داری سنبھالنے میں ہکوانی باتیں کی تھیں  
جنرل شریف کو یہ نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ جنرل جہاںگیر کراہت بھی علی قلی نثار کے فوج میں تھے  
تہا یہ بات بھی ان کے خلاف چلی گئی اور وہیں جنرل شریف کو آری چیف بنا دیا گیا۔



جنرل شریف کو جو تو یہ تھا انہیں تھا کہ جنرل پرویز شریف سے بڑھ کر انہیں نے

جنرل شریف انہوں نے علی قلی خان کو نکلوانا ان کے آری چیف بنا دیا تھا۔ وہ ایک دن ان کے دفتر کے  
لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر نمودار ہو گا۔ کارگل کا آپریشن نواز شریف کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں  
تھا۔ انہوں نے جن دنوں بھارتی وزیراعظم واپسی کو لاہور بلا دیا تھا اس وقت ان کے اپنے آری  
چیف انہیں اتنے بلیہ کارگل پر اپنی فوجیں چڑھانے تھے۔ نواز شریف کو جنرل شریف کے اس غلبہ  
پلان کا اس وقت پتہ چلا جب واپسی کے ایک رات فور ٹیلی فون پر نواز شریف کو کتا کر ان کی آری  
بھارت کے ساتھ کارگل کے معاملے پر ہاتھ دھو بیٹھ لاری ہے۔

جب نواز شریف کے فون میں یہ بات آئی تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ وہ کارگل کی اس  
جگہ کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اسے Reverse کر سکتے تھے۔ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے  
تھے اور جنرل شریف کے اس ایڈوائس کا نواز شریف کی حکومت پر بہت برا اثر پڑنے والا تھا۔

نواز شریف اور ان کی حکومت کو فوجی قیادت نے کارگل آپریشن کے بارے میں صرف اتنا کچھ  
تایا جو ان کے خیال میں سیاسی قیادت کو بتانا چاہیے تھا۔ ساری بات اس وقت کھل کر سامنے آئی جب  
گورنر ہاؤس لاہور میں نواز شریف کو جنرل پرویز شریف نے کارگل آپریشن پر بریفنگ دی جس میں اس  
وقت کے نیول چیف فصیح بخاری اور ایئر چیف پرویز مہدی بھی شامل تھے۔ جب جنرل پرویز شریف نے  
اس آپریشن کی تفصیلات بتائیں تو اس میں سٹیک کے باقی شرکاء کو تو چھوڑیں، وہاں بیٹھے فصیح بخاری اور  
پرویز مہدی بھی ہکا بکار ہو گئے۔ ان دونوں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا اور بولے کہ ہمیں تو کبھی بھی اس  
آپریشن سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جگہ کی صورت میں ان دونوں  
نے اپنی جواز دی اس سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان دونوں کی باتوں  
سے سب کو یہ پتہ چلا کہ اگر بھارت نے کارگل کو بنیاد بنا کر پاکستان پر فضا کی اور بحری راستوں سے قتل کیا  
تو شاید صورت حال بہت خراب ہو جائے۔ اس میں سٹیک میں بیٹھے ہوئے تمام شرکاء کو کھلی دفعہ یہ احساس ہوا  
کہ کارگل کی وجہ سے پاکستان ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ جنرل شریف یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ انہوں نے کارگل  
کا کیا آپریشن نواز شریف کی منظوری سے شروع کیا تھا۔ چوہدری نثار نے اور بولے کہ نواز شریف نے  
اس کی منظوری دی تھی تو کیا وہ اتنے بیوقوف تھے کہ وہ ایک طرف کارگل کا آپریشن شروع کراتے اور



ماہ کے اندر اندر وہ اپنی کولا اور جالیٹے۔

گورنر ہاؤس لاہور میں ہونے والی اس میٹنگ کے بعد چوہدری نثار کو وزیراعظم نواز شریف نے فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر ان کے ساتھ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہ پاکستانی فوج کی عزت بچانے کا وقت ہے۔ نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب چوہدری نثار نے انہیں امریکہ جانے سے منع کیا اور کہا کہ یہاں صاحب اجن لوگوں نے اپنے سولین لیڈروں کو اعتماد میں لیے بغیر کارگل کا ایڈوانس شروع کیا ہے انہیں اب اس کے نتائج بھی سمجھنے دیں۔

نواز شریف نے تب یہ جواب دیا کہ چوہدری صاحب انہیں اس لیے ملک کی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ذلیل ہونے نہیں دیکھ سکتے۔

نثار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جس طریقے سے نواز کے امریکہ جانے کی مخالفت کی تھی اس کے گوشہ نشین شریف خود ہیں۔

نثار نے اس موقع پر گہرا سانس لیا۔ مجھے دیکھ کر بولے کہ بڑے انہوں کی بات ہے کہ جس فوج کو نواز شریف نے قتل کیا تھا وہی نے ہی انہیں ایک قلعے میں ڈال دیا۔

نثار مجھے بتاتے تھے کہ یہ وہی جگہ ہے کہ جس سیاسی و ذرا اہم عظیم نے فوج کے ساتھ اچھائی کی فوج نے انہیں پتہ چلائی پرچہ صلیب بھرا ایک قلعے میں قید کر دیا۔

ایسی بات میں حیران پیدا کرنے کے لیے نثار نے کہا کہ یہ بھونسی تھے جو تو بجز پاکستانی فوجی بھارتی قید سے انہیں لے آئے تھے اور اسی آری نے انہیں پھانسی دی۔ ٹھیک سا نہیں سال بعد اسی فوج نے بیکہا نواز شریف کے ساتھ کہا۔ اپنی فوج کی عزت بچانے کے لیے نواز شریف اپنے اوپر تمام تر تنقید سہے 1998ء کی امریکی صدر بل کلنٹن سے ملنے گئے۔ انہوں نے وہاں امریکی مداخلت کے ذریعے نازی فوج کی عزت بچالی جو اس وقت بھارتی افواج کی توجہ سے نہایت خطرے میں تھی۔ ٹھیک تین ماہ بعد اسی فوج نے نواز شریف کو پھانسیوں کا گواہی عظیم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔

نواز شریف اور جنرل مشرف میں بھی تنازعات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات میں اصل بنیادی اس وقت آئی جب یہ خبریں سامنے آئے کہ جنرل مشرف کو کور کمانڈر کے طور پر جنرل طارق پرویز کو نواز شریف سے ملاقات کرنے پر طرف کرنے والے تھے۔

شہباز شریف، چوہدری نثار اور جنرل مشرف ڈنڈ پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل مشرف نے انہیں بتایا کہ وہ جنرل طارق کو برطرف کرنے والے ہیں۔ نثار نے جنرل مشرف کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے خیال میں جنرل طارق کے خلاف ایکشن لینا بہت ضروری ہے تو انہیں برطرف کرنے کے بجائے ان کا کہیں ٹرانسفر کر دیں۔ جنرل مشرف نے چوہدری نثار کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

نثار نے شہباز شریف سے بھی کہا کہ وہ نواز شریف کو مت بتائیں کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے جنرل طارق کے معاملے پر کیا بات ہوئی تھی کیونکہ وزیراعظم پہلے ہی خاصے ناخوش تھے۔ تاہم، شہباز شریف کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی اور انہوں نے جاتے ہی نواز شریف کو یہ بات فوراً بتادی کہ جنرل مشرف جنرل طارق پر دین کو ان سے ملاقات کرنے کے الزام میں کو کور کمانڈر کی پوزیشن سے ٹرانسفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف کی سسرال میں ہونے والی کسی کی موت پر جنرل مشرف ان سے تعزیت کے لیے ان سے ملنے گئے تو وزیراعظم نے جنرل طارق کا معاملہ ان کے سامنے اٹھایا جس سے ان دونوں کے درمیان طعنے حریفہ بڑھ گئی۔ اگر ابھی بھی کوئی کی رو گئی تھی تو اختیار میں یہ قہر چھپ گئی کہ جنرل طارق کو وزیراعظم نواز شریف سے ملاقات کرنے پر جنرل مشرف نے برطرف کر دیا ہے۔ یہ خبر بڑھ کر نواز شریف خاصے اشتعال میں آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر اس کی ایک وضاحت جاری کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ کور کمانڈر اور پولیٹسی جنرل محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئی ایس پی آر کے بجائے وزارت دفاع اپنی طرف سے ایک وضاحت جاری کر دے۔ تاہم، فیصلے سے بھرے نواز شریف نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اسی اثنا میں فوج میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نواز شریف چار جرنیلوں کو کارگل آپریشن کے متعلق وزیراعظم کو بے خبر رکھنے کے الزام میں برطرف کرنا چاہتے ہیں جن میں جنرل محمود، جنرل عزیز، کور کمانڈر نارن ایہ یاز جنرل جاوید حسن اور ڈی جی ملٹری آپریشنز جنرل توقیر ضیاء شامل ہیں۔

نثار نے کہا کہ اس طرح کا تاثر فوج میں جان بوجھ کر پھیلا دیا گیا تھا تاکہ ایک سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لا لگایا جائے جیسا کہ جنرل ضیاء نے 1988ء میں جو نیو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اسی طرح کا بہانہ تراشا تھا کہ وزیراعظم جو نیو اور جزی کیپ کے ذریعہ جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔



جنرل مشرف نے فوری طور پر چوہدری نثار اور شہباز شریف سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا کہ  
راہی نوڈ شریف میں پارٹی بھین کو طرف کرنا چاہتے ہیں اس پر ان دونوں نے انہیں بھین دیکھا کہ  
میں کوئی بات نہیں اسٹریٹ کی زبردستی کرنے کے لیے انہیں نوڈ شریف سے جھڑپ میں جانک نہیں آئی  
تفصیلاً سچائی کا مہمہ بھی دیکھا گیا۔

اسی دن میں جنرل مشرف کے قریبی جرنیلوں نے نوڈ شریف کو طرف کرنے کا فیصلہ کر لیا  
فدائی کا بیان یہ تھا کہ اگر نوڈ شریف نے جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی تو وہ اس پر اپنی پیشہ  
کے۔ ان جرنیلوں نے سیاسی حکومت کو ایک باقاعدہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر جنرل مشرف کو ہٹانے کی  
کوشش کی گئی تو وہ اس پر شدید رد عمل ظاہر کریں گے۔ نوڈ شریف کے گرد بیٹھے سازشیوں نے انہیں  
خبردار کیا کہ اگر انہیں نے جنرل مشرف کو طرف نہیں کیا تو فوج انہیں برطرف کر دے گی۔ دونوں  
اطراف نے اپنے تئیں برطرفی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے انداز میں اپنا رد عمل ظاہر کیا اور فوج ان کی  
ہولی جن کے پاس تینک اور توپیں تھیں۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ جنرل مشرف چاہتے تھے کہ نوڈ شریف  
وزارت مصلحتی کا مہمہ اپنے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو دے دیں کیونکہ وہ انہیں زیادہ بہتر لیدر سمجھتے  
تھے۔

میری بات سن کر چوہدری نثار مسکرائے اور بولے کہ دراصل شہباز شریف کو تھوڑی سی علامتہی  
ہوتی تھی۔ اگر آپ نوڈ شریف کے اقتدار کے آفری دن یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آری  
قیادت اس پر ایمان میں نہیں تھی کہ وہ نوڈ شریف کو کسی بات پر انہیں دیتی۔ جنرل مشرف نے دراصل  
مذاق میں یہ بات کی تھی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جنرل مشرف، نثار اور شہباز شریف کے درمیان  
اب جنرل مشرف نے مذاق کے انداز میں شہباز شریف سے کہا کہ آپ پنجاب پر مگرانی کرنے کی  
جگہ اسلام آباد کیوں نہیں آجاتے۔ مشرف کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام آباد آ کر ایک طرح سے  
فریڈ پر انہیں مطلقاً سارا دل لگا کر رہیں اور نوڈ شریف کو ان کے مسائل سلھانے میں ان کی مدد کریں۔

12 اکتوبر 1999ء کی شام چوہدری نثار علی خان وزیر اعظم ہاؤس میں ۱۲ بجے رہے  
نوڈ شریف نے جنرل چوہدری مشرف کو طرف کر کے جنرل شہباز شریف کو آری چیف مقرر کر دیا۔  
اس سے پہلے یکم اکتوبر کو چوہدری نثار علی خان دلی خان سے ملنے کے لیے لندن گئے تھے تاکہ وہ  
انہیں دوبارہ حکومت میں واپس لائیں۔ وہ لندن میں اس دن رہے اور ۱۵ اکتوبر کو پاکستان واپس لوٹے  
تھے۔ چوہدری نثار نے ۱۶ اکتوبر کو نوڈ شریف سے ملنے کی کوشش کی تو یہ جہاں کہہ دینی گئے ہوئے تھے۔

12 اکتوبر والے دن شہباز شریف نے چوہدری نثار کو وزیر اعظم ہاؤس گنج پر بلایا۔ دونوں نے  
وزیر اعظم ہاؤس میں شہباز شریف کے کمرے میں بیٹھ کر گنج کیا۔ ان دونوں کو بتایا گیا کہ وزیر اعظم ابھی  
مکان سے واپس لوٹے ہیں اور کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ نثار اور شہباز نے وزیر اعظم کو پیغام بھیجا  
کہ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں بلا لیا جائے۔

اسی اثناء میں شہباز شریف سو گئے اور چوہدری نثار نے وہی دیکھتے رہے۔ اچانک چوہدری نثار  
نے پٹیائی دی کہ جنرل مشرف کی برطرفی کی خبر سنی اور فوری طور پر شہباز شریف کو بلایا۔ شہباز شریف کو  
بھین نہیں آ رہا تھا کہ نوڈ شریف نے جنرل مشرف کو طرف کر دیا ہے۔ انہوں نے بڑے قصے میں  
چوہدری نثار سے کہا کہ وہ ابھی جا کر وزیر اعظم کو پنجاب کی وزارت مصلحتی سے استعفیٰ دے دیں گے کیونکہ  
اگر وہ اپنے گئے بھائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد وزیر اعلیٰ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں!

نثار نے بھروسے ہوئے شہباز کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ان کے لیے پہلے ہی بہت بڑے مسائل  
کھڑے ہو گئے ہیں، وہ اب نئے مسائل نہ کھڑے کریں۔ چوہدری نثار وزیر اعظم ہاؤس سے نکلے اور  
راولپنڈی میں واقع اپنے گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شہباز شریف کا فون آیا کہ چند فونٹی اسرین  
نے پٹیائی دی کہ قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ نثار نے دوبارہ اپنی گاڑی نکالی اور  
وزیر اعظم ہاؤس کی طرف دوڑا دی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فونٹی وزیر اعظم ہاؤس کو گھیرے میں  
لے چکے تھے اور کسی نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔

چوہدری نثار کو سمجھ آ گئی کہ سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔



چوہدری ثار جب اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوجوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے انہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخر کار بھٹ کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا اور دو سال تک اس گھر میں قید رہا۔

ایک رات انہیں اپنی کس کاٹھ پورہ ہوا۔ وہ ساری رات اور سے سوچتا رہا کہ میں فوجوں نے انہیں علاقے کے لیے پھر نہیں جانے دیا۔ صبح کے وقت گیس ہا کر ان کا آپریشن ہوا۔

چوہدری ثار علی خان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین دن تھے۔ انہوں نے کبھی سوہا بھی نہیں تھا کہ ایک دن پندرہ فوجی ان کے گھر کے گرد گھیراواں کر انہیں اپنے ہی گھر میں قید کر لیں گے۔ یہ فوجی ان کی اور ان کے بچوں کی ڈاک کو چیک کرتے تھے۔

ایک دن ٹیپ اور ایف آئی اے کے دو آفسرز چوہدری ثار سے ملنے کے لیے گھر آئے۔ ان دونوں نے ثار سے کہا کہ وہ نواز شریف کے خلاف ایک تحریری بیان دیں کہ انہوں نے ان سے راجپوت کے لیے گیس کی منظوری لی تھی۔ ثار نے ان سے کالتھ بین لیا اور نواز شریف کے حق میں بیان لکھ کر دے دیا۔

جنرل مشرف کو چوہدری ثار کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ جس دن مشرف نے رفیق تارڑ کو ہٹا کر خود صدر بننے کا فیصلہ کیا، اس سے ایک دن پہلے غیر متوقع طور پر اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل محمود ان کے گھر پر تشریف لائے۔ جنرل محمود تین گھنٹے تک چوہدری ثار کے ساتھ رہے۔ وہ دو گھنٹے پہاں منت تک بولتے رہے اور جنرل محمود سنتے رہے۔ ان تین گھنٹوں میں جنرل محمود صرف دس منٹ کے لیے بول پائے۔

جو فوجی جنرل محمود چوہدری ثار سے ہاتھ مل کر صوفے پر بیٹھے ثار نے ان کے بولنے سے پہلے ہی ان پر تین باتیں بڑی واضح کر دیں۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ وہ نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، پی ایم ایل کیو کو ہاٹن نہیں کریں گے اور جنرل مشرف کی حکومت کے حق میں کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔

جنرل محمود نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ ٹھیک ہے کہ آپ نواز شریف کو نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن نواز شریف کے بارے میں کیا خیال ہے جو انہیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں بدھ پلے گئے تھے۔

ثار نے جنرل محمود سے کہا کہ اگر آج انہوں نے نواز شریف سے بے وفائی کر کے اس قید سے رہا لیا بھی تو وہ ساری مرا اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔ یہ بات سن کر جنرل محمود انہیں چلے گئے۔

فوجوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں ہی دو سال تک قید رہنے کی وجہ سے چوہدری ثار کے بچوں پر برا اثر ہوا۔ انہیں انسانی اثر پڑا۔ اس برس وقت میں چوہدری ثار کے بچوں کو سب سے زیادہ ہوا کا سامنا کرنا پڑا۔

جب چوہدری ثار اپنے گھر میں قید تھے تو جنرل مشرف نے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں ملنگ قسم کی آفر دی جاتی رہی۔ انہیں پی ایم ایل کیو کا صدر بنانے سے ملے کر وزیراعظم بنانے تک کی بھی پیشکش کی گئی۔

اسی اثناء میں پی ایم ایل نواز کے لیڈروں کی طرف سے چوہدری ثار علی خان پر الزام لگایا گیا

ہانے لگیں۔ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ جنرل مشرف کو آری چیف بنانے والے چوہدری ثار تھے لہذا حکومت کی برطرفی کا ذمہ دار ایک لحاظ سے انہیں بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ان دنوں کلثوم نواز اور تہجد دوستانہ نے جنرل مشرف کی حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات مشہور ہونا شروع ہو گئی کہ

جنرل مشرف نے نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، اسحاق ڈار اور پارٹی کے دیگر ٹاپ لیڈروں کو تو جیلوں اور انک قلعے میں رکھا ہوا تھا جبکہ چوہدری ثار وہ واحد لیڈر تھے جنہیں گھر پر قید کیا گیا تھا۔ بہت

سارے سوالیہ نشانات چوہدری ثار علی خان کی نواز شریف اور پارٹی سے وفاداری پر اٹھائے جا رہے تھے۔ اور تو اور، کلثوم نواز کی بھی یہی سوچ تھی کہ چوہدری ثار جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور

ان کے بدلے میں انہیں جیل کے بجائے گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں کلثوم نواز، نواز شریف کے کانوں میں ڈال رہی تھیں جب وہ ان سے ملنے جیل جاتیں۔ اسی اثناء میں یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ

کئی نے رات کے اندھیرے میں چوہدری ثار کو باقاعدہ ڈرائیو تک کرتے ہوئے چکری کی طرف ہاتھ ہوئے سوئے پر دیکھا تھا۔ ان تمام باتوں کا نواز شریف پر بڑا اثر ہوا رہا تھا۔ استثنائی فیہ محسوس

ٹریپے سے نواز شریف ان باتوں پر قائل ہونا شروع ہو گئے تھے کہ چوہدری ثار علی خان بھی جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نواز شریف کا ان باتوں پر فوراً یقین کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ

جنرل شریف اور چوہدری نواز شریف کے درمیان سے ایک اور سلسلے کے دوست تھے اور ان کے کہنے پر ہی انہیں پارٹی میں شریک کیا گیا تھا۔

چوہدری نواز کو ان دنوں کا علم نہیں تھا۔ انہیں کوئی اطلاع نہ تھی کہ ان کی ملاقات پر شک کرنے کا اس وقت یہ پہلا دن ہے ان کی فیصلہ کی گئی۔ چوہدری نواز کو پارٹی کے امور سے دور رکھنے کے لئے وہاں انہیں نواز شریف کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے یہ پارٹی کے امور کہاں دیکھے لوگوں کا نام لے کر شریک کیا گیا وہاں انہوں نے ان کا نام کیوں نہیں لیا۔ اس پر چوہدری نواز نے انہیں جواب دیا کہ یہاں صاحب اچھے من تمام لوگوں نے فون کر کے مبارکباد دی تھی۔ میں آپ کے فون کا انکار کر رہا ہوں آپ نے بھی فون کر کے مبارکباد نہیں دی تھی میں نے بھی آپ کا فون پرانا کرنا سب نہیں سمجھا۔

چوہدری نواز اور نواز شریف کے درمیان ملی فون پر یہ نے وہی اس مختصر گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ آپ دونوں کے سیاسی امور ذاتی تعلقات جو 1985ء میں شروع ہوئے تھے، وہ سترہ سال بعد آخر کار شک و شبہات کی نذر ہو گئے تھے۔ چوہدری نواز نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب 1991ء میں آئے تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں گے۔ چوہدری نواز کے ساتھیوں نے اس پر بڑا شدید رد عمل ظاہر کیا۔ انہوں نے چوہدری نواز کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب نواز کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ گھڑا ہو گیا کہ وہ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں کیونکہ وہ اپنے ہمیل مسلم لیگ نواز کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے تھے جس کی قیادت نے انہیں اس بات پر سزا دینے کی بجائے کہ انہوں نے پارٹی سے برے وقتوں میں نہ اڑی انہیں کی تھی، ان پر شک کیا تھا کہ وہ شاید جنرل شریف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کی کہہ اور لٹی کی گئی تھی۔

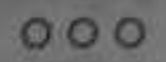
چوہدری نواز نے مجھے بتایا کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس اہم مرحلے پر میرے پاس 1991ء سے تھے باتوں میں بی ایم ایل نواز کے ساتھ چہل قدمی ہوں اور انہیں پارٹی کو جان کر لوں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے اپنی فیصلہ خیر کے دورے میں چھوڑ پارٹی چھوڑنے کے لیے فیصلہ بات چیت ہی شروع کر دی تھی۔

جب اس بات کا پتہ چلا کہ چوہدری نواز نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہوں نے فوری طور پر چوہدری نواز کو اس سے روکا۔ اکتوبر 1991ء کے ایک جلسے میں تھے۔ چوہدری نواز نے چوہدری نواز کو اپنی پارٹی کا شمار دیکھا، اپنی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے پر راضی کر لیا۔

نواز شریف نے فون کر کے چوہدری نواز کو اطلاع دیا کہ وہ آئے کی دعوت دی۔ جب تین سال بعد نواز شریف اور چوہدری نواز کی ملاقات ہوئی تو نواز نے گھر گیا کہ جنرل شریف کی برطرفی سے پہلے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر نواز شریف نے یہ جواب دیا کہ کیا تھا کہ وہ انہیں اور شہباز شریف کو یہ بات بتاتے تو شاید وہ انہیں جنرل شریف کو برطرف نہ کرنے دیتے اور وہ ہر قیمت پر جنرل کو گھر بیٹھا پھاڑتے تھے۔ چوہدری نواز نے نواز شریف سے یہ بھی شکایت کی کہ وہ ان تین سالوں میں اسے برے حالات سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی ان سے یا پارٹی سے بے وفائی نہیں کی لیکن اس کے باوجود بھی پارٹی کے لیڈران کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔

چوہدری نواز علی خان کا اشارہ کلثوم نواز کی طرف تھا جن سے کئی برسوں سے ان کی بول چال ٹیک بند تھی اور آج تک ہے۔



جب میں چوہدری نواز علی خان سے 2003ء میں ان کے گھر پر ملا تھا، اس وقت پاکستان کا نیو کیئر الیٹو ایک دفعہ پھر تنازعات میں گھر چکا تھا۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ 1991ء میں ایک دن اس وقت کے آری چیف چوہدری نواز سے ملے اور انہیں وزیر اعظم نواز شریف کے نام ایک بڑا خطیہ پیغام دیا۔ جنرل اسلم کے بقول کہ اگر پاکستان ایک مسلم ملک کو نیو کیئر نیٹو کی فراہم کرنے پر تیار ہو جائے تو اس کے بدلے میں بارہ ارب ڈالر دینے کو تیار تھا۔

یہ سن کر چوہدری نواز علی خان جو اس وقت وزیر پٹرولیم کے علاوہ نواز شریف کے اسٹیفنڈ اسٹنٹ بھی تھے، ان کے جھروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ اس طرح کی



سودے ہادی پاکستان کے مفاد میں ہرگز نہیں ہے۔ جہاں میں ذہ بے چہ جہری ٹار نے جنرل سے پوچھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ وزیر اعظم کے نام کس طرح کی تجویز بھیج رہے ہیں اور پاکستان پر مسلم ملک کو نیو کلیئرینا لوبی ایک سپورٹ کرنے کے الزامات کی بنا پر کس طرح کے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

آرمی چیف چوہدری ثار کی یہ بات سن کر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہا کہ آپ ایک دفعہ وزیر اعظم نواز شریف سے بات تو کریں۔ وہ اس ذیل کے ذریعے پاکستان کو بڑی آسانی سے بارہ ارب ڈالر دلوا سکتے تھے۔

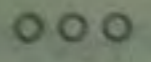
جب چوہدری ثار نے نواز شریف کو جنرل کی اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے اور انہوں نے نہایت نظرت بھرے لہجے میں اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کہا کہ کس طرح آرمی چیف کسی بھی ملک کو نیو کلیئرینا لوبی فروخت کرنے کی اس طرح کی اہمیتانہ تجویز اپنے دماغ میں لیے گھوم رہا ہے۔

یہ واقعہ سنا کر چوہدری ثار نے مجھے کہا کہ عمومی طور پر ہمارے یہ فوجی جرنیل سیاسی قیادت کو بااثر سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ملک بچانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اب بھلا بتائیں کہ ایسے آرمی چیف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو محض امریکہ کو سبق سکھانے کے نام پر ایک اسلامی ملک کو بارہ ارب ڈالر کے ارضی اسٹیم بم فروخت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

میں چوہدری ثار کی یہ بات سن کر سوچنا اور مسکراتا ہوا ان کے گھر سے باہر آ گیا کہ جنرل اسلم بیگ پہلے آرمی چیف نہیں تھے جن کے ذہن میں اسے بلا سے بلا سے اعلیٰ حیالات پرورش ہا رہے تھے۔ جنرل بیگ سے بلا کا کام تو جنرل شرف نے کر رکھا تھا جنہوں نے نہ صرف کارگل پر بلکہ شراسی کی نواز شریف کے ارضی امریکہ اور میان میں اہل کربھارتے کو ملنے سے بچانا اور اسی کارگل کو استعمال کرنے اور وزیر اعظم اور کھڑیاں لگا کر بلا سے بلا سے اس ملک پر نو سال حکمرانی کی اور اب سے بلا کہ انہوں نے چوہدری ثار کو استعمال کرنے کے اپنے آپ کو آرمی چیف ہی قرار دیا ہے۔

یہاں تک کہ وہ ہالاک کون وہ ہالاک کون وہ ہالاک کون وہ ہالاک کون کے مطالبے ہیں

ذریعہ ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اگر سیاسی طور پر چالاک اور گھٹن دار یہ فوجی جرنیل ہمارے سیاستدان ہوتے اور مذہب اور اوسط درجے کی ذہانت رکھتے ہالے یہ سیاستدان ان کے جگہ فوجی جنرل ہوتے تو شاید پاکستان آج ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا!



میرا چوہدری ثار علی خان کے بارے میں تاثر بڑا اچھا تھا۔ تاہم مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسے سیاسی رہنما رنگ کے شوقین بہت جلد ان لیڈروں کی باتوں میں آجاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو فوجی چوہدری ثار نے قومی اسمبلی میں اپنے پر پرزے پھیلا کر شروع کیے تو یہ وہ شخص نہیں تھے جن سے مل کر میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی آواز اور رویے میں رعونت اور تکبر آچکا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو اس کے بعد وہ اش روم جا کر اپنے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر جنرل شرف کے ایک وزیر کے سکیئنڈل کے دستاویزی ثبوت دیئے۔ وہ وزیر ان کے صلے میں ان کا رواجی حریف تھا۔ خبر اچھی تھی لہذا میں نے فائل کر دی۔

کچھ دنوں بعد ان کا مجھے پھر فون آیا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ پکری کے قریب واقع ان کے گاؤں سے ملحقہ زمینوں کو فوجیوں نے ایکواڑ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ وہاں کوئی فوجی تحصیل بنانا چاہتے تھے۔ چوہدری ثار کی اپنی زمینیں بھی اس میں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس پر ایک سنووری قلمبند کروں۔ انہوں نے مجھے کچھ کاغذات بھی دیئے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہر حال، میں نے میرٹ پر اپنے ایڈیٹر کو راضی کر لیا کہ ہمیں یہ خبر شائع کرنی چاہیے۔ اس کام میں دو تین دن لگ گئے۔ ایک شام مجھے چوہدری ثار کا بلا سے ٹھے میں فون آیا کہ میں نے اب تک وہ خبر کیوں نہیں فائل کی۔ میں ان کی فون سن کر بڑا حیران ہوا۔ وہ اپنا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے وہ میرے پاس ہوں اور میں کسی سرکاری ٹھے کا ملازم۔ اس دن کے بعد میرے ان سے کبھی تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں نہ میں نے کبھی ان سے ہاتھ ملانے کا سوچا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ سب ہاتھ ان صحافیوں کو حاصل استعمال کرنا ہائے ہیں۔ اگر آپ ان کی مرضی کی خبر کرتے رہیں تو آپ سے ان کے اور دوست صحافی ہیں۔ اگر آپ اپنے پرائیویٹ گروہ کو فائل کریں گے تو پھر یہ ایک ٹھے میں اپنی آواز دہرائے ہیں۔ میں نے چوہدری ثار کے اس رویے سے بہت ہلکا بھینسا اور اس کے بعد میں

نے کسی سیاستدان کو اپنا دوست رکھنے کی مزاحمت نہیں کی۔ چوہدری نثار سے رہی کسی امیدیں اس وقت قائم ہو گئیں جب ڈان ٹی وی کے رپورٹر اعجاز سید نے اپنے گفتگو پر یہ خبر لے کر ایک کی کہ چوہدری نثار اور شہباز شریف آری چیف اشفاق پر وہ کیا فیہ سے اب تک چھ نختیہ ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اس خبر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جیلوں میں مار کھانے کے باوجود بھی یہ سیاستدان فون کے ساتھ مل کر اس ملک اور اس کی سیاست کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ جنرل شرف کے دور میں ماضی سے بہتی حاصل کرنے کے جو یہ ایک دلدہ پھر سے آری چیف کے دروازے پر رات کو پندرہوں کی طرح دستک دے رہے تھے۔

## جنرل علی قلی خان

جس دن میں نے چوہدری نثار علی خان کا انٹرویو کیا تھا اور انہوں نے جنرل علی قلی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ اس سابق جنرل سے اب گفتگو کرنا شایعہ اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دن میں اسلام آباد میں واقع فرانسیسی سفارت خانے کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لیے گیا تو وہاں علی قلی کے بھائی رضا علی خان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا وہ پشاور میں فرانسیسی کونسل خانے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ میں جنرل قلی کے بھائی کے ذریعے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش کروں کیونکہ نثار کے انٹرویو کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل قلی کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوگا۔

دو تین بعد آخر میرا جنرل علی قلی سے رابطہ ہو گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا، انہوں نے چوہدری نثار کا انٹرویو پڑھ لیا تھا اور اب وہ مجھے گفتگو کرنے کا وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ میں جنرل علی قلی سے ملنے کے لیے ان کے راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب واقع گھر میں گیا۔ جنرل قلی اس وقت گھر پر اکیلے تھے۔ انتہائی عزت و احترام اور شائستگی کے ساتھ وہ مجھے اندر لے گئے اور بتانے لگے کہ ساتھ والا گھر سابق آری چیف جنرل وحید کاکڑ کا ہے۔ جو بھی انہوں نے جنرل کاکڑ کا نام لیا تو میرے اندر ایک رپورٹر کا لالچ پھر جاگ پڑا اور میں نے ان سے اسی وقت درخواست کر



میں گندہ جزل کا کرے دیکھنے سے کہہ کر شروع کر دیں۔ میں ان کا دور مشہور ہوں گا۔ ابھی میں جزل  
 ملی تھی سے جزل کا کر کا شروع کرانے کی بات کر دی، یہاں تک ایک بار میں نے جزل ملی کے گمرا  
 گیا۔ جزل صاحب نے ان سے میرا تعارف کر دیا اور بتایا کہ یہ جزل وہی ہے کہ آئے تھے ہیں۔ میں دل  
 کی دل میں یہ سوچا تھا کہ جزل صاحب سے قسمت میرے دل میں تھی اور ہو سکتا ہے کہ بہت جلد کا کر  
 صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے اور 1992ء کے پاکستانی سیاست کے انتہائی اہم سالوں پر سے یہ وہ  
 انقلابی بننے کے لیے جاکے ہیں نے ان کا تعلق اور تمام اہمیت میں ان کو گمراہیت میں اہم کر دیا گیا تھا۔  
 نام آئے والے دنوں میں میرا یہ پہلا ملاقات تھا کیونکہ جزل ملی تھی وہ ایک راجہ زادہ کی گزار  
 رہے تھے اور ان کی سہایلی سے ملنے کے لیے چاہتے تھے۔

میں نے ہاتھ ہاتھوں میں جزل ملی تھی کو تمہارا سا بچا ہوا پایا۔ اپنے ساتھ اس ہونے والی  
 اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ جزل ملی تھی۔ آپ سے جانا اور بیٹے سے بچنے تک فریج میں جانے کی  
 روایت نہ تھی تھی۔ ملی تھی کا زمانہ فریج میں پچھ سال ان کی کرنے کے بعد کہیں کے طور پر رہا کر دیا ہو کر گمرا  
 آ گیا تھا۔ میں جزل صاحب اور جزل ملی تھی کی روایت تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

ملی تھی نے مجھے ہر ملکی بات بتائی وہ بھی تھی کہ انہیں سینئر مونس ہونے کے باوجود بھی آری  
 جزل صاحب نہیں بھلا گیا تھا اور یہاں کا حق ہوتا تھا۔ جب جزل ملی تھی نے یہ خبر سنی کہ جزل مشرف کو چیف آف  
 آری صاف بتا دیا گیا تھا تو انہوں نے اسی وقت صاف کا شکر ادا کیا کہ آج ان کا باپ جزل صاحب یہ خبر  
 سننے کے لیے زندہ نہیں تھا۔

جزل صاحب ایک بہ فیصل اور قابل جزل تھے۔ جزل صاحب اور جزل ملی تھی دونوں سچ میٹ  
 بھی تھے۔ جزل ملی تھی ایک رہنما تھے جبکہ اس کے برعکس جزل صاحب نے باقاعدہ انٹرنیشنل فٹری میں  
 کیمپن کے ذریعے آری جوائن کی تھی۔ اگرچہ جزل ملی تھی ان وہ سے سینئر تھے کہ ان کا پاس آؤت  
 جزل صاحب سے پہلے ہوا تھا لیکن جہاں تک اہلیت اور فریج کا تعلق تھا ان کا جزل صاحب سے کوئی جوڑ  
 نہیں ہوتا تھا۔ جزل صاحب کو دراصل ایک اوسط اور بے کے جزل کی ضرورت تھی اور جزل ملی تھی ان کی  
 ات کے لیے بہت سوزوں تھے۔ میں صرف 48 سال کی عمر میں جزل صاحب نے جزل  
 صاحب کو بنا کر دیا۔

جب جزل صاحب ایک مشہور اور نوسے دل کے ساتھ رہے گا کہ گمراہے تو انہوں نے  
 اپنے بیٹے ملی تھی کو یہ یاد دہا کر دیا کہ جزل ملی تھی نے ایک دن آری جزل ملی تھی سے  
 اپنے باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ملی تھی جزل ملی تھی سے ہڈ ہائی ہونے اور ہاشمی میں  
 گمراہے۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ جزل صاحب ان کی سب سے بڑی بیٹی کی زب (2003ء میں ایم ایچ  
 سے تھیں۔ وہ کو ہر اجاب کی تھی اور ہر اجاب نہان کی والدہ ہیں) ان سے ملنے کر اپنی تھیں تو وہ اپنے  
 بیٹے ملی تھی کے فریج میں مستحکم کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ وہ ستر پر چار پڑے تھے لیکن  
 وہ اپنے بیٹے کے فریج میں مستحکم کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جزل صاحب نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ  
 ان سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔ اپنے باپ کی یہ بات سن کر زب نہا سیر میں ہوئیں۔ وہ اپنے  
 باپ کی طرف بھٹکیں تاکہ وہ سن سکیں کہ وہ ایسی کوئی خاص بات ان سے کرنا چاہتے تھے۔

جزل صاحب نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولے کہ زب دیکھو تمہارا بھائی جزل  
 ملی تھی آج اپنی صحت اور قابلیت کی بنیاد پر اسٹے بڑے عہدے پر پہنچا ہے۔ تمہارے شوہر کو ہر اجاب نہان کی  
 سیاست اس کے آری چیف بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ تم لوگوں کی وجہ سے ملی تھی کے لیے  
 کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بیٹی نے اپنے باپ کو حیران بھری نظروں سے دیکھا اور بولی کہ ہا ہا آپ یہ کیسے سوچ سکتے  
 ہیں کہ ایک سگی بہن اپنے میاں کی سیاست کی وجہ سے اپنے بھائی کو مساکل میں گمراہے دیکھ سکتی ہے۔  
 زب نے اپنے باپ کو تسلی دی کہ وہ ہریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

جزل ملی تھی اب اپنے باپ کی یادداشتوں میں کھوپکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جزل صاحب  
 کی زندگی اتنی آسان نہیں رہی تھی۔ وہ نو جوان تھے۔ انہوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی  
 اور انتہائی بھونکی حکومت آئی تو جزل صاحب ہر کرپشن کے الزامات لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔  
 اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دراصل جزل صاحب اور جزل ملی تھی خاں ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ جزل ملی تھی نے  
 کسی دور میں جزل صاحب کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جزل صاحب جیل بھیج  
 نہیں گئے تھے۔ شروع میں جب جزل صاحب نے حراست کی تو ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کسی

انہوں نے ان کے بھائی جنرل صیب کو تھیل میں ڈالا تھا۔  
آغا بھورہ کو بھٹو صاحب نے لندن جنرل صیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے  
بعد بھٹو صاحب اور جنرل صیب میں اختلافات ختم کرانے گئے۔  
میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل صیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان  
کا اس پر کیا رد عمل تھا؟

جنرل علی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ  
بہت لطف تھا۔ جنرل ضیاء کو انہیں پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ جنرل علی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ  
حقیقت تھی کہ جنرل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں  
سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم، جنرل علی کے خیال میں جنرل ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دیکر بہت  
بڑی لطفی کی تھی۔

میں نے جنرل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جزی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک پہنچ  
کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟  
جنرل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے  
تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 29 اپریل 1957ء  
میں کیمپن لیا اور اپنی امی پر فارمنس کی وجہ سے انہیں لندن کے Sand Hurst School بھیجا گیا۔ یہ  
معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جنرل علی قلی نے اچھائی قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی  
کونٹ کا اعزاز دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جنرل مشرف اور علی قلی جج میٹ تھے۔ علی قلی خان  
نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا جبکہ جنرل مشرف کی کیا ہوئی پوچھنا نہیں۔ ان کے ایک اور جج میٹ  
شیر شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاندار آرمی آفیسر تھے جو بعد میں قطر میں امیر ہو گئے۔ تیسرے اہم جج  
میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ ایجنٹ جنرل خالد  
نور محمد جنرل راجی اور سابق ای سی آئی ایس آئی رانا نسیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرمی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت  
کا آئی ایس آئی چارج ہونے والا تھا۔ ان کے بعد جنرل خالد نور، جنرل یوحنا مشرف اور جنرل نسیم رانا

انہوں نے ان کے بھائی جنرل صیب کو تھیل میں ڈالا تھا۔  
آغا بھورہ کو بھٹو صاحب نے لندن جنرل صیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے  
بعد بھٹو صاحب اور جنرل صیب میں اختلافات ختم کرانے گئے۔  
میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل صیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان  
کا اس پر کیا رد عمل تھا؟

جنرل علی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ  
بہت لطف تھا۔ جنرل ضیاء کو انہیں پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ جنرل علی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ  
حقیقت تھی کہ جنرل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں  
سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم، جنرل علی کے خیال میں جنرل ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دیکر بہت  
بڑی لطفی کی تھی۔

میں نے جنرل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جزی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک پہنچ  
کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟  
جنرل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے  
تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 29 اپریل 1957ء  
میں کیمپن لیا اور اپنی امی پر فارمنس کی وجہ سے انہیں لندن کے Sand Hurst School بھیجا گیا۔ یہ  
معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جنرل علی قلی نے اچھائی قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی  
کونٹ کا اعزاز دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جنرل مشرف اور علی قلی جج میٹ تھے۔ علی قلی خان  
نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا جبکہ جنرل مشرف کی کیا ہوئی پوچھنا نہیں۔ ان کے ایک اور جج میٹ  
شیر شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاندار آرمی آفیسر تھے جو بعد میں قطر میں امیر ہو گئے۔ تیسرے اہم جج  
میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ ایجنٹ جنرل خالد  
نور محمد جنرل راجی اور سابق ای سی آئی ایس آئی رانا نسیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرمی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت  
کا آئی ایس آئی چارج ہونے والا تھا۔ ان کے بعد جنرل خالد نور، جنرل یوحنا مشرف اور جنرل نسیم رانا

انہوں نے ان کے بھائی جنرل صیب کو تھیل میں ڈالا تھا۔  
آغا بھورہ کو بھٹو صاحب نے لندن جنرل صیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے  
بعد بھٹو صاحب اور جنرل صیب میں اختلافات ختم کرانے گئے۔  
میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل صیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان  
کا اس پر کیا رد عمل تھا؟



انتہائی بے سروتی سے کہا کہ میں نے تمہیں ملتے بعد یہ کرسی چھوڑنی ہے۔ تم صرف اس وقت ہی آ کر میری اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔

جنرل علی قلی کو ایک شدید دھچکا لگا کیونکہ وہ تو اپنے اس دوست کے پاس Courtesy call کرنے گئے تھے۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کی کرسی پر تمہیں ملتے بعد بیٹھنا ہے۔

جنرل علی قلی خان کو جنرل افتخار علی خان کے اس سرد رویے کا معاملہ فوراً سمجھ میں آ گیا جب انہوں نے جنرل افتخار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر جنرل پرویز مشرف کو ملتے پھرتے دیکھا۔ جنرل علی قلی بڑے حیران ہوئے کہ جنرل مشرف جو اس وقت منگلا کے کور کمانڈر تھے وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟ جنرل علی قلی نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور جنرل افتخار سے کہا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کو اندر بلائیں اور بیٹھ کر گپ شپ کریں۔

جب جنرل پرویز مشرف کمرے میں داخل ہوئے تو جنرل قلی بڑے گرم جوش انداز سے آگے بڑھ کر جنرل پرویز مشرف سے ملنے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جنرل مشرف یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنایا جائے گا۔

جب جنرل جہانگیر کرامت کو غیر معمولی طور پر یہ پتہ چلا کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار کے پاس اس دن دفتر میں موجود تھے تو انہوں نے جنرل افتخار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ جنرل صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ مشرف آپ کے دفتر میں کیا کر رہے تھے؟ آپ نے انہیں بلایا تھا یا پھر وہ چھٹی لے کر آپ سے ملنے آئے تھے۔ جہانگیر کرامت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنرل افتخار سے پوچھا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کور کمانڈر منگلا جنرل مشرف کو اپنے دفتر میں کیوں بلایا تھا؟

جنرل افتخار نے جہانگیر کرامت کو بتایا کہ دراصل جنرل مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر مایوس ڈسٹرب تھے۔

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی جنرل قلی سمجھ رہے تھے۔

گھڑی پکانا شروع ہو چکی تھی۔

تھے۔ جنرل ضیاء اللہ بن سٹان سے جو نئے تھے اور لہرست میں پانچویں نمبر پر تھے۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ فون میں سمجھ کر قلی، ریگیمینٹ اور سمجھ جنرل کی ترقی ایک سلیکشن پر اس کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جنرل جہانگیر کرامت نے جو اس وقت آرمی چیف تھے، چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کرنی تھی تو جنرل علی قلی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ان کے سچ میٹ جنرل زیدی پہلے ہی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب اس پوسٹ کے لیے مقابلہ جنرل علی قلی، جنرل خالد نواز اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان تھا جو تینوں سچ میٹ تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کی پروفیشنل قابلیت اور اہلیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں جنرل پرویز مشرف اور جنرل خالد نواز پر فوقیت دی۔ جنرل نسیم رانا کی ترقی ان سے کچھ دن بعد ہوئی تھی لہذا وہ اس دوڑ سے نکل چکے تھے۔ چند دنوں بعد اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار علی خان (چوہدری غار علی خان کے بڑے بھائی) ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ جنرل قلی اس وقت راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ اپنی پروموشن پر جنرل جہانگیر کرامت کا شکر یہ ادا کرنے وہ ان سے ملنے گئے تو جنرل کرامت نے انہیں کہا کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنا کر انہوں نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک حقدار کو صرف اس کا حق دیا تھا۔

جنرل جہانگیر کرامت سے ملنے کے بعد علی قلی خان اپنے قریبی دوست جنرل افتخار علی خان جن کی جگہ اب ان کی تعیناتی ہوئی تھی سے ملنے کے لیے گئے تاکہ وہ ان کا بھی شکر یہ ادا کریں۔ وہ جنرل افتخار کا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جنرل قلی جنرل افتخار کو اپنا ذاتی دوست سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا دوست ان کی ترقی پر خوش نہیں ہوگا۔ جنرل افتخار کا یہ رویہ دیکھ کر جنرل علی قلی کو بڑا صدمہ ہوا۔ جنرل قلی کو اس وقت یہ احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ اگر جنرل افتخار جیسا یہ اتنا دوست بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات درست نہیں ہیں۔ جنرل علی قلی اور جنرل افتخار کی دوستی دو سطحوں سے پہلی آرمی تھی کیونکہ ان دونوں کے والدین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

جب جنرل علی قلی جنرل افتخار کے دفتر میں داخل ہوئے تو جنرل افتخار نے کہا کہ ہاں مجھے تمہاری چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر تعیناتی کی خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔ جنرل افتخار نے















جزل قلی نے ایک اور نئی کہانی سنائی۔

جزل جہا گنیر کرامت کے استعفیٰ اپنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں کہ ان کے بعد کیا آری چیف کون ہوگا۔ ایک دن جزل قلی قلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب نواز شریف کے ایک بڑے قریبی معتمد خاص نے ان سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کی نواز شریف سے ایک خطیہ ملاقات کرانا چاہتے ہیں تاکہ کل کو وہ آری چیف کی تقرری کے وقت زبردستی نہ لائے جاسکیں۔ قلی قلی کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نواز شریف سے خطیہ ملاقات کے لیے راضی ہو جائیں تو پھر انہیں ایک عام سی کار میں بٹھا کر سادہ کپڑوں میں پرانے مسٹر بلاس لے جایا جائے گا۔ قلی قلی کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے پہلے جزل آصف نواز کی بھی اسی طرح خطیہ ملاقات کرائی گئی تھی اور انہیں بھی سادہ کپڑے پہنا کر ایک عام سی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ نواز شریف کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد جزل آصف نواز کو آری چیف بنانے کی میسرس دے دی گئی تھی۔ جزل قلی کو بتایا گیا کہ یہ بات ان کے اپنے خاکے میں ہے اور انہیں جہا گنیر کرامت کے بعد آری چیف بنایا جاسکتا ہے۔

اس پیغام کے کچھ دن بعد ایک اور بڑے سرکاری افسر جو نواز شریف کے قریب تھے، نے ایک دفعہ قلی قلی سے رابطہ کیا اور نواز شریف سے ملانے کی پیشکش کی۔ اس بڑے سرکاری افسر نے جزل قلی کو بتایا کہ وہ اتنی طور پر انہیں چیف آف آری سٹاف بنوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وہ پہلے ان کی نواز شریف سے خطیہ ملاقات کرائیں گے اور پھر انہیں آری چیف بنانے کا کیس تیار کر کے پیش کریں گے۔

لیکن نواز شریف کپ کی توقعات کے برعکس جزل قلی نے سادہ کپڑے پہن کر نواز شریف سے خطیہ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جزل قلی نے انہیں بتایا کہ وہ آری چیف بننے کے لیے اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے پیغام رساں کو کہا کہ خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے اور اگر ان کی قسمت میں آری چیف بننا ہوتا تو انہیں کوئی ٹکس روک سکتا۔ اگر خدا انہیں آری چیف نہیں دانا چاہتا تو پھر نواز شریف سے خطیہ ملاقاتیں کر کے بھی وہ آری چیف نہیں بناتے جاسکتے۔

پس نے جزل قلی سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ نواز شریف نے جزل شریف کو آری

چیف بنانے سے پہلے ان سے بھی خطیہ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ جزل قلی نے میرے اس سوال کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ اس طرح کی خطیہ ملاقاتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔

میں نے کہا لیکن جزل صاحب اشجہ رشید نے تو اپنے انٹرویو میں مجھے بتایا تھا کہ جزل قلی کو آری چیف نہ بنانے کی وجہ ان کے بڑا اور ان الگو ہر ایوب تھے جو اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جزل قلی نے اس بات سے اتفاق کیا۔ قلی نے مجھے کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ گوہر ایوب خان انہیں آری چیف بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گوہر ایوب خان نے کبھی بھی انہیں آری چیف بنانے کے لیے نہ تو لابی کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اس پر بات چیت کی تھی۔ قلی کے بقول نواز شریف گوہر ایوب خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جزل قلی نے بھی کبھی گوہر ایوب خان سے یہ بات نہیں کی تھی کہ وہ انہیں آری چیف بنائیں۔ قلی کے بقول اگرچہ وہ اپنی پوزیشن بحال کرنے کے لیے ساری باتیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہیں گے کیونکہ ان کی سچی زبان گوہر ایوب کی بیوی سے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔

قلی نے کہا کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان شاید میرے لیے لائیگ کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے والد جزل صیب خان کو آری چیف نہ بنانے والے جزل ایوب خان اسی گوہر ایوب کے سی والد تھے۔ قلی نے کہا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

جزل قلی نے اس بات کو دہرایا کہ دراصل نواز شریف کو آری ہاؤس میں ان کی جہا گنیر کرامت کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں دی گئی تھیں۔ قلی نے اس بات کو مسترد کیا کہ جب جزل وحید کا کڑ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان سے ملاقات کی تھی جس کے بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیے تھے تو شاید وہ اس میٹنگ میں موجود تھے۔ قلی نے کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ ڈی بی ایم آئی تھے اور انہوں نے نواز شریف کو دھمکی دے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا۔ جزل قلی کے بقول یہ بات غلط تھی۔ وہ نہ تو اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے نواز شریف کو کوئی دھمکی دی تھی۔ جزل کا کڑ کے ساتھ اس وقت جزل جاوید اشرف گئے تھے۔ جزل قلی نے کہا کہ نواز شریف کو ہر وقت ان کے قریبی لوگ پنھانوں سے ڈراتے بھی رہتے تھے اور ایک پروپیگنڈہ جاری رہتا کہ پنھان دھمکی لوگ نہیں ہیں اور ان سے ڈریل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر









بہ طرف کہا جائے۔  
 جلی نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ان کے پاس اس طرح کی رہائش بھی نہیں کہ جب  
 بڑی مشرف آئی تالیف ہے اور انہوں نے تلف کور کے اور سے کیے تو بہت سارے فوجی المیران نے  
 اٹھیں یہ کیا تھا کہ وہ نواز شریف کو اپنے ساتھ وہ سب بکھڑے کرنے کی اجازت نہ دیں جو انہوں نے جنرل  
 جہاگیر کرمت کے ساتھ کیا تھا۔ یہی وہ تھی جب 12 نومبر کو جنرل مشرف کو اس میں کیا گیا تو ان کے  
 ذہن میں اپنے ان فوجی المیروں کا یہ مطالبہ ضرور ہوگا۔

میں نے جنرل جلی سے پوچھا کہ آپ فوج سیاست میں کیوں مداخلت کرتی آئی تھی تو وہ بولے  
 کہ ان کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ فوج کو سیاست میں نہیں بڑھانا چاہیے چاہے اس کے پیچھے کتنی بڑی وجہ  
 ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم جلی نے کہا کہ جب بھی فوج نے کسی بھی سولین حکومت کو گرایا تو اس وقت کی سیاسی  
 لیڈر شپ نے ہاتھ دھو کر انہیں اس کے جواز پیش کیے۔ جو مسائل سیاسی انداز میں حل ہو سکتے تھے وہ  
 سیاسی لوگ فوجی لیڈروں کے سامنے لے کر آتے تھے اور یہ بہت لگا ہوا ہوتا تھا۔ جنرل جلی کا خیال تھا  
 کہ سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کو استعمال کرتے تھے جس سے فوجیوں کو بھی یہ بہانہ ملتا تھا کہ وہ  
 سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ جلی نے انکشاف کیا کہ جب وہ ای بی ایم آئی تھے تو بہت  
 سارے سیاستدان ان سے ملنے بیٹھ کر بات کرتے اور وہ چاہتے تھے کہ فوج اس وقت کی حکومت کو گرانے  
 میں رول ادا کرے۔ تاہم جلی کے بقول سولین حکومتوں کو گرانے کے لیے یہ وجوہات مناسب نہیں  
 تھیں۔ جلی کا خیال تھا کہ اگر فوجی قیادت کے پاس کسی سیاسی حکومت کو ہٹانے کی کئی ہی ضروری وجوہات  
 کیوں نہ ہوں پھر بھی فوجی طور پر ملک میں سٹے اٹھانے کے لئے اقدام کرنا ہونا چاہیے۔  
 چاہیے کہ ملک پر نگرانی کرنا فوج کا کام نہیں ہے۔ جنرل وحید نے ہالک لیکن کام 1993ء میں کہا تھا  
 جب انہوں نے سٹے اٹھائے تو ان کے اگلے ارٹیکل لیا کہ وہ ان کے سامنے کر دیا۔ جوں ملک میں جمہوریت  
 قائم رہی۔ جلی نے کہا کہ پاکستان میں فوجی مداخلتوں سے نہیں بلکہ جمہوریت کے مسلسل پھلنے رہنے سے  
 ہی جمہوریت آئے گی۔ جمہوریت ایک مکمل نظام ہے اور اسے پھلنے دینا چاہیے۔ آزادی کو 2000ء میں  
 نگرانوں اور پارلیمنٹ کے بیچ 1999ء چاہیے کیونکہ اس وقت انہاں میں جمہوریت ہی ایک ایسا نظام ہے  
 جس کے تحت کسی بھی ملک کو چھایا جاسکتا ہے۔

### شاہد حامد

یہ پندرہ اگست 2003ء کا دن تھا۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں نے گھر پر رو کر سالگرہ منانے کی  
 بجائے تھیانگلی جانے کا فیصلہ کیا۔ دو دن قبل اسلام آباد میں واقع فرانس کے سفارتخانے میں میری  
 پنجاب کے سابق گورنر اور فاروق لغاری کے انتہائی قریبی دوست اور ان کے ایڈوائزر شاہد حامد سے  
 ایک کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے چوہدری شجاعت والے تھیلک ٹیڑ پر فائنل انٹرویو  
 کے بعد ان تمام لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا جو میرے خیال میں اس وقت بعض اہم شخصوں پر مشتمل  
 تھے جب اس ملک میں باقوساد میں ہو رہی تھی یا سیاسی نظام کی بساط کھینچ رہی تھی۔ میں شاید کئی شاہد  
 حامد کے بارے میں نہ سوچتا لیکن انہیں فرانس کے سیر کے گھر کے سربراہ شاہد اب لان میں اٹھتی ہوئی  
 شام میں اپنی خوبصورت روی کے ساتھ گھر سے اچھڑ کر رہ گئیں کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ  
 مجھے اس شخص سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ بڑے اعلیٰ طبقے سے ہے ان تمام اہمیتوں سے پرور اٹھ سکتے ہیں کہ  
 کیے اور کی حالت میں 1998ء کو وزیر اعلیٰ ہما کی حکومت ان کے 11 سے فاروق لغاری نے آزادی  
 اور آزادی شریف جہاگیر کرمت کا اس میں کیا کر دیا تھا۔ چیف جسٹس جہاگیر شریف نے کہا کہ یہ ہے۔  
 اور شریف کے ساتھ جسٹس کے معاملات کیے اور ان کے کہہ ہاتھ اس سے بڑھ کر فاروق لغاری  
 نے ان حالات میں ملک کی صدارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ اگر

شہد عامہ کیسے اپنے پرانے دوست فاروق لغاری کو اپنا چھوڑ کر پیٹنے سے قزاقی کر کے شہد عامہ کو اپنے دوستی کے بعد شہد عامہ کے کورجیڑے سے نکالے۔

شہد عامہ نے شہد عامہ کو اپنا مخالف کر دیا اور اپنی اس قزاقی کا اعتراف کیا کہ میں ان کا اپنے اہل و عیال کے لیے اندرونی کرنا چاہتا ہوں تو مجھے بہت ٹوٹنا پڑتا ہے کہ شہد عامہ سے زیادہ ان کی تعمیر نے بڑے بڑے بڑے انداز میں ان آئیڈیل کے لیے نہ صرف تیرہ لاکھ اس سے پہلے کہ شہد عامہ کوئی مثبت پانچویں باب دیتے ہوں نے وہ ان کے وقت سے زیادہ انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ اگر میں ان کا اندرونی کرنا چاہتا ہوں تو مجھے تھیانگلی آنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت کے وزیر خارجہ نور شہد محمود قصوری کی معاونت میں اپنی بیوی اور نواسے نواسیوں کے ساتھ چھپایاں مٹانے گئے ہوتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مہذب اور اعلیٰ کلاس کرنے والی بیگم شہد عامہ چاہتی تھیں کہ ان کے یہاں وہ بارہ پاکستانی سیاست میں شامل ہوں اور ان کی ہاتھ پوری ٹیلی کو ایک سے سرے سے سیاسی احوال سے بے خبر نہ رہیں۔

وہ ان بعد میں نے اپنے ایک پیارے دوست ڈاکٹر ظفر الطاف سے کازی اور ڈرائیور مانگا اور تھیانگلی چلا گیا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اچھے، خوبصورت اور محمود کر اپنے والے ماحول میں کبھی کسی کا اندرونی نہیں کیا جو نور شہد قصوری کی کوٹھی کے عقب میں واقع ہالکونی میں بیٹھ کر وہی وہی ہارٹ اور بدن سے مگر اتنی سرد ہوا میں بیٹھ کر شہد عامہ کا کیا تھا۔ یہ نہیں کیا بات ہے کہ اس ہالکونی میں بیٹھ کر وہی وہی سرسبز و شاداب وادی جسے گہرے ہالوں میں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، میں کبھی نہیں سمجھا۔ کادور میں دنیا میں جہاں بھی گیا وہاں اس گھر میں گزرے ہوتے چند گھنٹے میری یادوں میں ہمیشہ شامل رہے ہیں۔

پانچ گھنٹے بعد جب میں اس گھنٹے سے اور خوبصورت موسم میں سری کے پھاڑوں پر ذہنی شام میں اسلام آباد کی طرف واپس رہا تو مجھے احساس ہوا کہ اس ملک میں رہنے والے مجھ جیسے عام لوگ اپنے سفر ان اور ان کی سازشوں اور ٹوٹاؤں کی قیمت کیسے ادا کرتے آتے ہیں۔ جیتن جاپے اگر میں شہد عامہ سے نہ ملتا اور وہی بڑی ایمانداری سے مجھے بیٹھیر بھنڈا، فاروق لغاری، نو شریف، ریچیف ایس جہاں شہد عامہ اور جنرل جہاںگیر کراچی کی اندرونی باتیں نہ بتاتے تو شاید میں اس ملک کی سیاست کو

تھے اس کے بعد ان میں تگ و پھل کا آج میں کہہ سکتا ہوں۔

یہ بڑا خوب سا اتفاق ہے کہ شہد عامہ کے والد جنرل عامہ نے پاکستان کے سرے آئی ایک بھڑکے جنرل شہد عامہ کے دور میں اس عہدے سے تیار ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک بھڑکے پادری سے تھا اور وہ اپنے آپ کو بھنڈا کا 100 روپے کرتے تھے۔ وہ ہم وقت کیسے بدلتے ہیں کہ انہیں انسان کیسے بدلتے ہیں کہ ان جنرل عامہ کے بیٹے شہد عامہ نے 5 نومبر 1998ء کی رات اسی بھڑکی نئی بھڑکی حکومت کوڑنے کے لیے اپنے دوست فاروق لغاری کو ایک عداوتی حکم نامہ تیار کر کے دیا۔ شہد عامہ کے اراکین کے ہونے اس عداوتی حکم نامے نے اس ملک کی تاریخ ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھی تھی کیونکہ اسی کی بدولت آصف زرداری قتل میں گئے جہاں سے وہ 2004ء میں تقریباً دس سال بعد ہوا کہ ملک چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے بیٹھیر بھنڈا مارچ 1999ء میں ملک چھوڑ کر ہلا وطن ہو گئے اور جب آٹھ سال بعد وہ ملک لوٹیں تو راولپنڈی کے بازار میں سرعام ماری گئیں۔ اگر اس رات بے نظیر بھٹو کی حکومت نہ توڑی جاتی تو شاید یہ سب کچھ مختلف ہو سکتا تھا۔

نور شہد قصوری کی درختوں میں گھری اس خوبصورتی کوٹھی کے عقبی حصے کی ہالکونی میں بیٹھے ہارٹ کے قطرہوں کی وہی وہی سرسبز و شاداب میں شہد عامہ کو ابھی بھی وہی 5 نومبر کی رات سات سال بعد بڑی اچھی طرح یاد تھی جب ہر پانچ منٹ بعد فاروق لغاری ان کے کمرے میں آتے اور کہتے "شہد جہی اب اہم خانگی کے آرڈر ز جلدی تیار کرو۔"

یہ شاید اس خوبصورت ماحول کا اثر تھا جس نے مجھے چاروں اطراف سے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا یا پھر شہد عامہ جیسا ایک نہیں لیکن ذہنی انسان اپنا دل کھولنے پر تیار ہوا تھا یا پھر فاروق لغاری کے اس ہانے دوست کو اس بات کا احساس تھا کہ رؤف اسلام آباد سے اتنی دور صرف اس کا اندرونی کرنے آیا ہے لہذا اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ بہر حال، جو بھی وہ تھی شہد عامہ نے بڑی ایمانداری سے اس دور کے اہم واقعات کو بڑی تفصیل سے میرے سامنے ایک ایک کر کے بیان کرنا شروع کیا اور میں نے اپنے آپ کو اس شخص کی طرح محسوس کیا جسے وقت بڑی تیزی سے سات سال پیچھے لے گیا ہو جب کچھ عاقبتوں لوگ محض مزید طاقت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور آج وہ اس عالم ہرنی کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کی جگہ جنرل مشرف صدر اور جمالی وزیر اعظم ہیں۔



جس دن فاروق لغاری اس ملک کے صدر بنے انہوں نے اسی لمحے اپنے انجمن کھیل کے

دوست شاہد حامد کو اپنے وزیر مقرر کر لیا۔ فاروق لغاری نے شاہد حامد سے جو کئی ایگل ایڈوائس لی وہ  
پریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں قومی جس میں ملکوں کی سینیارٹی کا فیصلہ دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو  
پریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل کرنے کو چاہتے تھے۔ بینظیر بھٹو، فاروق لغاری نے ایک اہم بیننگ  
مجلس کی قومی جس میں یہ نکتہ ہوا تھا کہ پریم کورٹ کے فیصلے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔ اس اہم  
بیننگ میں فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو کے علاوہ صدر کے پرنسپل ایگزیکٹو شمشیر علی خان، شاہد حامد، رضا  
ربانی، مرحوم جسٹس منیر اور ڈپٹی چارٹی جرنل بھی موجود تھے۔ بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو صاف  
لفظوں میں بتا دیا کہ وہ چیف جسٹس سہاگلی شاہ کو برطرف کر دیں۔ فاروق لغاری نے بینظیر کی بات سن  
کر شاہد حامد کی طرف دیکھا اور اس کی رائے مانگی۔ شاہد حامد نے بتایا کہ ملکوں کی سینیارٹی کا کیس مختلف  
معدوں پر چلایا گیا ہے اور تمام ملکوں پر عملدرآمد چاہتے ہیں لہذا یہ کوئی بھگداری کی بات نہیں ہوگی اگر ہم  
نے پریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے کی بجائے چیف جسٹس کو بتا دیا۔

صدر لغاری نے شاہد حامد کی اس ایڈوائس سے پورا اتفاق کیا اور بینظیر بھٹو کی اس بات کا لشکر ادا کیا  
کہ وہ چیف جسٹس کو فارغ کر دیں۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ایسی  
کھلی مائل کر دی تھی جو آڑکار بینظیر حکومت کے نوٹے اور کچھ ماہ بعد فاروق لغاری کے استعفیٰ دینے  
پر ختم ہوئی۔

دینی یادوں میں گھومے شاہد حامد نے یاد کیا کہ یہ اگست 1996ء کی بات ہے۔ وہ اسی گھر میں  
بھلیاں منانے آئے ہوئے تھے جب صدر پاکستان فاروق لغاری نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ  
فوری طور پر اسلام آباد آجائیں۔ وہ جو کئی اسلام آباد پہنچے تو فاروق لغاری نے شاہد حامد کو چیف  
جسٹس سہاگلی شاہ کا ایک خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اب  
تک ملکوں کی سینیارٹی والے کیس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس خط میں چیف جسٹس سہاگلی شاہ نے یہ بھی  
دار لکھ دی تھی کہ ان کی فیصلے پر عمل نہ کرنے سے ایک بہت بڑا آئینی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس خط  
کے ملنے کے بعد فاروق لغاری بڑے پریشان تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹس سہاگلی شاہ اس

ملک کے ذریعے انہیں کیا بیچا سمجھنا پتا رہے ہیں۔

شاہد حامد نے لغاری کو بتایا کہ چیف جسٹس انہیں بلا سے واضح الفاظ میں یہ بات بتا رہے ہیں کہ  
ملک کو آئینی طور پر نہیں چھایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے صدر پاکستان کو ان کی آئینی ذمہ داریوں پر  
والی ہیں جو ان کو انتہائی شہزادہ شیخ 59(2)ب کے تحت حاصل ہیں۔ اس آئینی شیخ کے ذریعے صدر منتخب  
حکومت اور اس کی توڑ سکتا تھا۔ لغاری نے شاہد حامد سے پوچھا کہ دو چیف جسٹس کے اس خط پر کیا رد عمل  
ظاہر کریں۔ شاہد حامد نے لغاری کو مشورہ دیا کہ وہ پریم کورٹ کو ایک ریفرنس بنا کر بھیجیں جس میں ان  
سے یہ رائے لی جائے کہ ان حالات میں کیا صدر پاکستان کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔

فاروق لغاری کو شاہد حامد کی یہ تجویز بہت پسند آئی اور فوری طور پر انہیں کہا گیا کہ وہ پریم  
کورٹ آف پاکستان کو ایک ریفرنس بھیجنے کی تیاری کریں۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب بینظیر بھٹو کو فاروق لغاری کے اس فیصلے کے بارے میں معلوم  
ہوا کہ وہ پریم کورٹ کو ریفرنس بھیجنے والے ہیں تو وہ بڑے شدید دباؤ کا شکار ہو گئے اور انہوں نے فوری  
طور پر چوکیس کے فیصلے پر عمل کر دیا۔

تاہم، فاروق لغاری مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بینظیر بھٹو حکومت کی خراب کارکردگی سے  
باخوش تھے۔ صدر لغاری کے خیال میں اگر بینظیر بھٹو کی حکومت زیادہ دیر تک چلنے دی گئی تو پاکستان  
معاشرتی و بالیہ پن کا شکار ہو جائے گا۔

آخر ایک دن صدر لغاری نے شاہد حامد کو بلایا اور پہلی دفعہ یہ اظہار کیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کو  
برطرف کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ بات سن کر شاہد حامد چونک گئے اور انہوں نے صدر لغاری کو بتایا  
کہ بینظیر حکومت کو توڑنے کے لیے محض ایک وجہ نا کافی ہے۔ پریم کورٹ کبھی بھی صدر لغاری کے  
حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو قبول نہیں کرے گی محض اس بنیاد پر کہ صدر کا نشانہ  
بینظیر بھٹو ہیں۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ اگر ریاست کے ایک سے زیادہ ادارے گریڈیشن میں ملوث ہیں تو پھر  
بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کی بہت ساری وجوہات کورٹ کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں۔

شاہد حامد نے صدر لغاری کو یہ تجویز 1988ء سے لے کر 1993ء تک برطرف ہونے والی  
حکومتوں اور ان کے عدالتوں میں چلنے والے کیسوں اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں دی تھی۔ 1988ء







میرے خیال میں فاروق لغاری چاہتے تھے کہ ان تمام صحابیوں کو کابینہ میں وزیر بنایا جائے جن کی کرپشن تھی اور جو بینظیر بھٹو حکومت سے کرپشن کی وجہ سے نکلے گئے تھے اور سب سے بڑا کردہ اپنے اخبارات و جرائد میں مسلسل حکومت کی نااہلی کے خلاف مضمون لکھتے رہے تھے اور فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت کو ایک سبھا کے طور پر پیش کرتے رہے تھے۔ نجم سیٹھی اور ارشاد احمد حقانی تو اس بھٹائیے میں آگے تاہم عارف لکھانی زیادہ پریشانی اور ایجاباً اور صحافی ثابت ہوئے اور انہوں نے فاروق لغاری اور شاہ جامد کی دی ہوئی یہ سیٹھی کوئی کھانے سے انکار کر دیا۔

تھیانگلی کی لٹنڈاؤں میں لٹنڈاؤں کا سنی شروع ہوئی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ ابھی شاہ جامد سے بہت کچھ سننا اور پوچھنا ہے۔ میں نے ایک کے سرے سے سوالات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ بینظیر بھٹو کی برطرفی سے پہلے آخر کابینہ کے ناموں کو کس نے بیٹھ کر تھی شکل دی تھی۔

شاہ جامد نے بتایا کہ وہ سب سے فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں کابینہ کے ان ذریعوں کی فہرست بنا چکے تھے جنہیں انہوں نے سبک دیا تھا۔ تاہم کچھ ناموں کا فیصلہ برطرفی آدھار پر چھوڑ دینے کے بعد کیا گیا۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد فاروق لغاری نے ورلڈ بینک کے ایک ملازم شاہ جامد کو روکی کو طوائفی فون کیا اور انہیں ملک کا وزیر خزانہ بنانے کی پیشکش کی۔ ورلڈ بینک کے صدر مسز ڈاکٹر سٹون پانچواں دن کے صدر لغاری کو پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت برطرف کرنے پر ہمارا کہہ چکے تھے۔

شاہ جامد کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ جہاں نواز شریف، عابد حسین، شہباز شریف، رحیم یار، شامی خان اور آرمی چیف جہانگیر کرامت بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کی سلاش میں شامل تھے وہاں حالی صورت میں بھی ہر آدمی اپنا رول ادا کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے بینظیر بھٹو اور کے افغان وزیر اور کراچی پورٹی نے یہ بتایا تھا کہ حاصل ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف بینظیر بھٹو کو ہوا جس بارے میں کہہ سکتے ہیں ان میں علی ایس کے ذرا سا حاکم۔ تاہم بینظیر بھٹو نے ان کی یہ شراکتہ دہانے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ایس ایم ایف کے ساتھ ساتھ ایس ایم ایف کے ساتھ ساتھ ورلڈ بینک اور اس

کے ملازم بھی پیش پیش تھے۔

بینظیر بھٹو حکومت برطرف ہونے کے بعد بہت سارے لوگوں کی الٹری کھل گئی تھی۔ شاہ جامد کو نہیں اہم وزراء تو اس کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں سوچا کچھ وزارت وفاق، قانون اور ایگرا سٹریٹجی کی وزارتیں دی گئیں تاکہ وہ فوج، عدلیہ اور سول سروس کو اپنی حق میں کر سکیں۔ صدر لغاری چاہتے تھے کہ سیاسی جماعت سے ان کے دو نمائندے بھی کابینہ میں لیے جائیں۔ عابد حسین اور شفقت محمود کے ناموں پر بھی غور کیا گیا۔ کچھ ناموں کا فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ تاہم صحابیوں نجم سیٹھی اور ارشاد حقانی کو بھی وزیر بنایا گیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے بینظیر بھٹو کے خلاف صدر لغاری کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک معراج خاں لاہور میں واقع اپنے گھر میں سو رہے تھے جب آدمی رات کو انہیں ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ انہیں ملک کا گورنر وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ شاہ جامد نے یہ دعویٰ کیا کہ معراج خاں کو بینظیر بھٹو کی برطرفی کے منصوبے کا سرگرم نہیں تھا۔

تاہم مجھے یہ کچھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایک دوسرے کے دشمن لغاری اور نواز بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے ایک کتنے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔

شاہ جامد نے گہرا سانس لیا اور مجھے بتایا کہ دراصل پہلے دن سے ہی لغاری اپنی حیثیت صدر پاکستان کے طور پر منوانا چاہ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں صدر پاکستان سمجھیں نہ کہ بینظیر بھٹو کی حکومت کا جیٹا ایسی وجہ تھی کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ بھی رابطہ کرنے کی کوئی صورت ڈھونڈ رہے تھے۔ تاہم نواز شریف زیادہ سمجھدار تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر فاروق لغاری اور ان کے درمیان کوئی طاقت ہو تو اس میں کوئی اہم باتیں یا ایجنڈا الٹا نہیں ہونا چاہیے۔ محسوس ہونے لگا کہ ان کے لیے اس طاقت نہیں کریں گے۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں اطراف سے پہلے ایک ٹیم بنائی جائے جو نواز اور لغاری کے درمیان طاقت کے ایجنڈے کے لیے چھاری کرے۔ شاہ جامد کو صدر لغاری نے ہاتھ دیا کہ وہ نواز شریف کی ٹیم سے مذاکرات کریں گے جبکہ نواز شریف نے سر جان مزید جنرل مجید ملک، رحیم یار، شامی خان اور شہباز شریف کو اپنی طرف سے ہاتھ دیا۔ یوں ان لیڈروں کی ملکی طاقت عابد حسین کے اسلام آباد میں واقع گھر میں ہوئی۔ شاہ جامد عابد حسین کے گھر گئے جہاں نواز شریف کے علاوہ رحیم یار، عابد حسین اور شہباز شریف موجود تھے۔ طاقت کے اور ان شاہ جامد نے یہ



جوزیوی کو نواز شریف کو لغاری سے ملنا چاہیے۔ تاہم، سیاسی طور پر سمجھدار نواز اور ان کے ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گزبڑ ہے لہذا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو سے 1993ء میں نواز شریف کے بھائے اسحاق خان کا ساتھ دینے پر اسے مزادینے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آ رہا تھا۔ لہذا نواز اور ان کے ساتھیوں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ اگر ان کی فاروق لغاری سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے بدلے میں انہیں کیا ملے گا۔ شاہد حامد نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو نواز نے بتایا کہ سب سے پہلے لغاری کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے بینظیر بھٹو حکومت کے خلاف لیے گئے سینڈ کی تائید کرنی چاہیے۔ اگر ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی ہو تو اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نکھنا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان میں سے کسی نے شاہد حامد سے یہ پوچھ لیا کہ کیا ان کے پاس واقعی فاروق لغاری کی اتنی اتھارٹی موجود ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم فیصلے بینظیر بھٹو سے ڈسکس کر سکیں۔

اس خفیہ ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواز شریف شاہد حامد سے چند مضبوط یقین دہانیاں لینے کے بعد صدر لغاری سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ شاہد حامد نے صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے سب سے بڑی گارنٹی یہ دی کہ اس ملک میں جب بھی الیکشن ہوں گے وہ آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔ میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب عابد حسین کے گھر پر یہ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو کیا ان میں یہ بات بھی چھپی گئی تھی کہ اگر الیکشن کے بعد نواز شریف اس ملک کے وزیر اعظم بنتے ہیں اور ان کی ٹرم کے دوران ہی فاروق لغاری دوبارہ صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار بنتے ہیں تو کیا مسلم لیگ نواز انہیں سپورٹ کرے گی۔

شاہد حامد نے جواب دیا کہ جب نواز اور لغاری کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی تو اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ تاہم، شاہد حامد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ جب نواز شریف کے ساتھی صدارتی نمائندوں کے ساتھ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کے لیے صلاح مشورے میں مصروف تھے تو انہوں نے یقیناً صدر لغاری کو دوسری دفعہ صدر بنانے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ چوہدری ثار علی خان اور شہباز شریف دونوں نے ہا قاعدہ طور پر فاروق لغاری کو صدر بنانے کے حوالے سے شاہد حامد کو آفر کی تھی۔ اس کے بعد جب لغاری اور نواز شریف کی مزید ملاقاتیں ہوئیں تو نواز شریف نے براہ راست بھی

فاروق لغاری کو خود پیشکش کی تھی۔ تاہم، فاروق لغاری نے ہر دفعہ دوسری ٹرم کے لیے صدر بننے سے انکار کیا۔ لغاری کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کو آئینی تقاضوں کے مطابق چلایا جائے۔ شاہد حامد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے بعد عابد حسین خود ایک پیشکش لے کر آئی تھیں کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نے انتخابات میں فاروق لغاری کے امیدواروں کو 20% ٹکٹیں دینے کے لیے تیار تھی۔ تاہم، لغاری نے انکار کر دیا۔

میرا اپنا یہ خیال تھا کہ نواز شریف، شہباز شریف اور چوہدری ثار علی خان صدر لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے جو بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری اور آفتاب شیر پاؤ کے ساتھ مل کر 1993ء میں اسحاق خان کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب نواز شریف اور اسحاق خان میں اقتدار کے لیے گفتگو ہوئی تو دونوں نے اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا کیونکہ یہ طے تھا کہ جس کے چلنے میں بینظیر بھٹو اپنا وزن ڈالیں گی وہ جیت جائے گا۔ بینظیر کو نواز شریف یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ ان کی حکومت ڈس مس کرانے میں حصہ دار نہ بنیں تو ان پر اور آصف زرداری پر قائم ہونے والے مقدمات جو 1990ء میں اسحاق خان کے کہنے پر قائم کیے گئے تھے انہیں ختم کر سکتے ہیں اور ایک نیا آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا جاسکتا ہے تاکہ جب نواز شریف کے پانچ سال پورے ہوں تو انتخابات آزاد اور شفاف ہوں۔ دوسری طرف اسحاق خان اپنے داماد انور سیف اللہ کے ذریعے یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ قومی اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں جو صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا جواز فراہم کریں گی تو وہ نئے الیکشن کے بعد انہیں دوبارہ وزیر اعظم قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس کے بدلے میں بینظیر بھٹو سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ 1993ء میں ان کی صدارتی معیاد ختم ہو رہی تھی لہذا انہیں پانچ سال کے لیے مزید صدر بنایا جائے گا۔ صدر اسحاق اور نواز شریف میں اختلافات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف صدارتی انتخابات سے چھ ماہ پہلے ہی باقاعدہ یہ اعلان کر دیں کہ وہ ان کے صدارتی امیدوار ہوں گے۔ نواز شریف حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد نے بھی یہ بات مجھے خود بتائی تھی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل اختلافات اسی بات سے شروع ہوئے تھے کہ وزیر اعظم اسحاق خان کو پانچ سالوں کے لیے مزید صدر بنانے کی گارنٹی دینے کو تیار نہ تھے۔ یوں غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو مزادینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لیے وہ بینظیر



جہاں تک تھی۔ اپنے داماد انور سیف اللہ کے ایف سیون میں واقع گھر میں بیٹھ کر اس زمانے کی بے  
 ثباتی، دھوکے بازی اور سیاسی چال بازیوں کو روک رہے۔ تاہم، وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے ساتھ وہی  
 کچھ ہوا تھا جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ سیاست کے سینے میں شہل ہوتا ہے اور نہ خون  
 کے رشتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ تو چالیس ہوتی ہیں۔ جو چل گیا وہ جیت گیا جو پیچھے رہ گیا وہ اپنی باری کا  
 اٹھار کرے یا پھر پشاور میں واقع اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر انسانی کا مشہور ناول War and  
 peace کو سلسلے سے پڑھے اور اپنی یادداشتوں کو قوم کی امانت سمجھ کر قلمبند کرنے کی بجائے ایک  
 رات خاموشی سے اپنے بستر میں خدا کو پیارا ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نواز شریف بھی فاروق لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے۔ تاریخ اپنے  
 آپ کو دہرا رہی تھی۔ لغاری کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو انہوں نے اسحاق خان کے ساتھ ہوتے  
 ہونے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ تاہم، انسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ انہی  
 حالات میں برائسی اور شخص کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا یا اپنے اوپر بڑھتے ہوئے غیر  
 ضروری اعتماد کا یہ نتیجہ نکھتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے طاقتور شخص سمجھنا شروع کر دیتا  
 ہے اور جب منہ کے بل کرتا ہے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی کچھ نواز شریف کے  
 وزیراعظم بننے کے بعد فاروق لغاری کے ساتھ ہوا۔ وہی نواز شریف جو بینظیر حکومت گرانے کے لیے  
 فاروق لغاری کو دوسری مرتبہ صدر بنانے کے لیے تیار تھے، ان ہی شاہد خاں کے ہاتھ انہوں نے پیغام  
 بھجوایا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں مگر نہ پارلیمنٹ کے ذریعے ان کا احتساب کر  
 کے انہیں گھر بھیج دیا جائے گا۔

صدر غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایک بات بھول گئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ  
 بات طے تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے جنہوں نے انہیں صدر بنوایا تھا تو بھلا ان  
 سے دوسرے لوگ وفا کی کیا توقع رکھیں۔ شاید یہ بات چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بغداد  
 شہر کے حکمران کے خلاف چند لوگوں نے اس کے فوجیوں کی مدد کی اور فتح کے بعد ایک قطار میں کھڑے ہو  
 کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگے تو اس نے ایک تاریخی فقرہ کہہ کر ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا تھا  
 کہ جو لوگ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے وفادار نہیں وہ بھلا کسی اور کے کیا وفادار ہوں گے۔

بھونکی دہا جتے تھے۔ بینظیر بھٹو کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف اگر  
 وہ صدر اسحاق کا ساتھ دیتیں تو نہ صرف نواز شریف کو 1990ء میں ہی صدر اسحاق، اسلم بیگ اور جنرل  
 میدگل کے ساتھ مل کر ان کی 8 اگست کو حکومت پر طرف کرانے پر نہ صرف اب ان کی حکومت اس مس  
 کر کے سزاوی جاسکتی تھی بلکہ نئے انتخابات کی وجہ سے وہ فوری طور پر ملک کی وزیراعظم بھی بن سکتی تھیں  
 اور آصف زرداری بھی فوری طور پر رہا ہو سکتے تھے جبکہ نواز شریف کا ساتھ دینے میں بینظیر کو دو سال  
 مزید انتخابات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صدر اسحاق کا ساتھ دے کر ایک  
 تیر سے کئی لاکھ کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اسحاق خان کا ساتھ دینے کا مطلب  
 یہ ہوگا کہ میڈل پارٹی نے اصولوں پر کھمبہ کر کے ایک ایسے شخص کا ساتھ دیا جس نے بینظیر بھٹو اور آصف  
 زرداری کو کرپشن چارجز پر طرف کر کے ٹیل میں ڈال دیا تھا۔ کسی سیاست نے مشورہ دیا کہ اتنی معمولی  
 سی بات کو اتنے بڑے کار کے سامنے رکاوٹ نہ بنے اور یوں یہ طے پایا کہ اسی کرپٹ شخص کو صدر  
 اسحاق خود اپنی کاہنہ کا مہربنا کر اور اس سے حلف لے کر ایک طرح کی اسے کلین چٹ فراہم کر دیں  
 گے۔ یوں آسمان نے یہ نکارہ بھی دیکھا کہ جس آصف زرداری کو اسحاق خان کے کہنے پر کرپشن  
 الزامات میں تین سال ٹیل میں رکھا گیا تھا اسی صدر نے اسے اپنے ہاتھوں سے حلف دیا۔ ان مذاکرات  
 کے درمیان صدر اسحاق یہ گارنٹی چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ صدر بنایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے بھی یہ گولی  
 صدر اسحاق کو دیدی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر منتخب کریں گی۔ صدر اسحاق بھی یہ گولی اس لیے نکل گئے  
 کیونکہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نواز اور نصر اللہ خان کے مقابلے میں انہیں اپنا صدیقی امیدوار بنا چکی  
 تھیں لہذا ملک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم، صدر اسحاق خان یہ بات بھول گئے تھے کہ ان پانچ سالوں  
 میں بینظیر بھٹو نے بھی بہت کچھ سیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ انہیں بھی اب سیاست کے کڑے آگئے تھے۔ اسحاق خان  
 یہ بھول گئے تھے کہ 1988ء میں جنرل اسلم بیگ اور جنرل میدگل پاکستان کو چلا رہے تھے اور پانچ سال  
 بعد پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اگرچہ اسحاق خان کو یقین تھا کہ فوج کے ایک پٹھان  
 سپہ سالار عبدالوحید کا کڑا اپنے ایک پٹھان بھائی غلام اسحاق خان کا ساتھ دیں گے تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا۔  
 یوں نواز شریف کی برطرفی اور ملک میں نئے انتخابات کے بعد جب نئے صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا  
 اور غلام اسحاق خان پشاور سے دوڑے دوڑے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرانے آئے تو پتہ چلا کہ



تہاگی کے فوجی دستوں اور یہاں پر سے دھیرے دھیرے گزرا ہوا تھا اور اس کی بھی  
اس نقش کا ذکر تھا کہ آخر فاروق لغاری ملوث ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور بیٹھنے بیٹھنے کہتے  
تھے پھر بھی وہ کیونکر ایسا اقدام کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے اپنے مخصوص حصے انداز میں مجھے بتانا شروع کیا کہ ماضی کے ان دنوں پرانے  
دوستوں کے درمیان اختلافات کی کوئی ایک چیز نہیں تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے صدر لغاری کے دماغ میں یہ  
بات بیٹھ گئی تھی کہ عمران بیک اسکیٹل کے پیچھے آصف زرداری کا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے ان کا موامہ کی  
آنکھوں میں ہوا ایک صاف سترا نیچ تھا اور یہی طرح ماثثر ہوا تھا۔ وہ انکوٹری کمیشن جو اس اسکیٹل کی  
تحقیقات کر رہا تھا اس نے فاروق لغاری کو ٹیکہ قرار دیا تھا لیکن اس کمیشن کی رپورٹ بھی میڈیا یا  
عوام کو ریلیز نہیں کی گئی۔ اس سے یہ پتا چلا کہ بیٹھنے حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لغاری پر لگنے والے  
کرہڑوں، وہ اپنے کے اس دماغ کو صاف کیا جائے۔ فاروق لغاری اس وجہ سے بھی بیٹھنے بیٹھنے سے بچا تھے  
کہ جب بھی انہوں نے محرمہ سے ان کی حکومت پر لگنے والے کرہڑوں کے الزامات پر بات کرنی چاہی تو  
وہ شہید ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا۔ محرمہ نے فاروق لغاری پر اتنا ٹیکہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ انہوں نے  
تو مسلم لیگ ق کے لیڈر ہونے کا قصور یہ اسکاٹات جاری کیے تھے کہ وہ ان کی ایازت کے بغیر صدر سے ملاقات  
نہیں کریں گے۔ تاہم ان اختلافات میں خرابی اس وقت آئی جب بیٹھنے بیٹھنے نے سپریم کورٹ کے ججز  
سیڈائی نہیں رہ گئے کہ اس سے بچا کر لیا تھا۔ کہانی میں سر قلمی ہونے کے قتل نے وہی کسی کس پوری کر دی  
جب بیٹھنے نے صدر کو استعفیٰ دے دی یہ وہی لکھا گیا کہ وہ سر قلمی کو قتل کرنے کی سازش میں شریک  
تھے۔ بیٹھنے ہونے کے اس قتل کا الزام ہے ان صدر کے کہنے کی جہازیں اس امر کو بتاتی ہیں۔ شاہد حامد  
کے قتل کی بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے ان صدر پر لگایا تو وہ خود بھی بہت پریشان ہو گئے  
تھے کی بیٹھنے کے قتل کے بعد سے ان کے دل میں ہی اس وقت بیٹھنے ہونے کی حکومت اس میں  
ہوئے کہ بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے ان صدر کے کہنے کے کہنے میں بیٹھنے ہونے کے قتل  
یا بیٹھنے کے قتل کے قتل کا قصور ہے ان صدر کے کہنے کے کہنے میں بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے  
ان کی بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے ان صدر کے کہنے کے کہنے میں بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے  
بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے ان صدر کے کہنے کے کہنے میں بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے

بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے ان صدر کے کہنے کے کہنے میں بیٹھنے ہونے کے قتل کا قصور ہے  
کرہڑوں کی جو فائیس دی گئی تھی وہ کس نے فراہم کی تھی۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ اگر آری چیف  
جہا تکیر کرامت صدر لغاری کے ساتھ تھے تو پھر بیٹھنے یہ ٹیکہ فریضہ آئی ایس آئی نے سرانجام دیا ہوگا۔  
جو بیٹھنے پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو پنجاب سے بیٹھنے پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کے  
فون آنے شروع ہو گئے۔ وہ سب فاروق لغاری کا ساتھ دینا چاہ رہے تھے۔ تاہم فاروق لغاری نے  
ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ انہی دنوں میں گلزار پارٹی بنانے کی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔  
باتوں باتوں میں شاہد حامد نے ایک اور انکشاف کیا کہ جہاں تکیر کرامت 1997ء کے  
اپنی بیٹھنے کرانا چاہ رہے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جہاں تکیر کرامت نے لغاری کو  
یہ بھی بیٹھنے دیا تھا کہ اس کے کوڑکھاڑے اس بات کے حق میں تھے کہ پہلے ملک میں سیاستدانوں کا بے  
رحمان افسانہ کیا جائے اور اس کے بعد انکیشن کرانے جائیں۔

ابھی میں اس شاک سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ جہاں تکیر کرامت بھلا کیسے اس طرح کی بات کر  
سکتے تھے کہ شاہد حامد نے میرے سر پر ایک اور ہم مارا کہ جہاں تکیر کرامت کو تو پھوڑیں، سپریم کورٹ کے  
جج جسٹس جہاں علی شاہ بھی نے انتخابات کے خلاف تھے۔ موصوف نے تو صدر لغاری کو ایک خط بھی لکھا  
تھا کہ "ادب صدر کیا آپ نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ سپریم کورٹ سے رابطہ کر کے مگر ان حکومت کا  
بے رحمی سے چلایا جائے۔"

شاہد حامد کی بات سے یہ بیٹھنے واضح تھا کہ اس وقت کے آری چیف اور جج جسٹس جہاں علی  
کہ پاکستان میں سیاسی نظام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور اس کام کے لیے انہوں نے فاروق  
لغاری کو استعمال کیا تھا۔ لیکن لغاری بھی ایک حد تک استعمال ہونے کے بعد ان بیٹھنے کے ہاتھوں حریف  
استعمال ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

لغاری کو یہ بھی رہنمائی کر دیا جہاں تک کہ ملک میں جی مردم شماری کرانے کے کام پر انتخابات  
مخفی کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم لغاری نے یہ تمام تجویزیں مسترد کر دیں۔ فاروق لغاری اس بات سے خوش ہوا  
تھا کہ انہوں نے مگر ان حکومت کے قیام کا اور اس پر حاویا تو سیاسی بعد انہیں اس پر اپنا شکر یہ بھی  
کاہل کر لی۔ لغاری اس بات سے بھی خوش ہوا تھے کہ اگر ملک میں انتخابات نہ ہوتے تو یہ بھی ممکن تھا کہ

حکومت سے بعد فوج آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ یہاں یہ بتایا جائے گا کہ فاروق لغاری کی کزور کا بیڑہ کسٹ سیاستدانوں کا احتساب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

جہاں ایک طرف آرمی چیف اور چیف جسٹس ملک میں انتخابات ملتوی کرنا چاہ رہے تھے وہاں کاہنہ کے چند وزیروں اور صوبائی گورنریں بھی فاروقی پر مسلسل یہ زور ڈال رہے تھے کہ وہ انتخابات نہ کرائیں بلکہ پہلے احتساب کیا جائے۔ فوجی قیادت بہت زیادہ بے چین تھی اور وہ ہر صورت ملک میں انتخابات ملتوی کرنا چاہ رہی تھی۔ جب لغاری پر دباؤ بڑھ گیا تو ایک دن فاروق لغاری کو جی ایچ کیو بلا دیا گیا جہاں انہوں نے کارکنانوں کو پانچ گھنٹے تک اس بات پر دلائل دیئے کہ ملک میں وقت پر انتخابات ہونا کتنے ضروری تھے۔ مول اور مشرعی حکمرانوں کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر پیشکش کی گئی تو نیشنل کا آئیڈیا سامنے آیا۔ جلال فاروق لغاری اس ملک کے پہلے صدر تھے جنہوں نے فوج کے سیاست میں باقاعدہ دخل کو تسلیم کیا۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھا ہی لیا کہ اگر بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور پارلیمنٹ کے وہ تمام ارکان جنہوں نے فاروق لغاری کو ووٹ دے کر صدر بنوایا تھا وہ کس وقت تھے تو پھر فاروق لغاری نے خود استعفیٰ کیوں نہیں دیدیا۔ اگر انہیں ووٹ دینے والے کرپٹ تھے تو پھر انہیں بھی اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا فاروق لغاری پر اخلاقی اور سیاسی طور پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے تمام کرپٹ ساتھیوں کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ انہوں نے ایک عجیب روایت قائم کی کہ جنہوں نے ان کو صدر بنوایا تھا وہ تو کرپٹ تھے اور موصوف خود اپنے آپ کو بہت ایماندار سمجھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہد حامد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

شاہد حامد اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے بولتے رہے۔ بینظیر بھٹو حکومت ختم ہو چکی تھی۔ نئے نئے منصوبے بن رہے تھے کہ اچانک ایک دن پتہ چلا کہ فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی برطرفی پر ہم کو رٹ میں پہنچ کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے متوقع فیصلے سے ایک دن پہلے بحث کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت بھی شریک تھے۔ اس میٹنگ کا ایک ہی باث موضوع تھا کہ سپریم کورٹ کی فیصلہ دے گی۔ سب کی نظریں شاہد حامد کی طرف اٹھیں کیونکہ ان دنوں وہ اس کیس کو براہ

دست اڑل کر رہے تھے۔ شاہد حامد نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں ایک ووٹ سے بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے فیصلے کو برقرار رکھے گی۔

میٹنگ کے شرکاء میں سے اچانک کسی ایک نے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھ لیا کہ اگر سپریم کورٹ نے بینظیر بھٹو حکومت کو بحال کر دیا تو کیا ہوگا۔ ابھی سوال پوچھنے والے کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ فاروق لغاری نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ پھر وہ کل صبح ہی صدارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ فاروق لغاری کی اس بات نے اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو سخت حیران کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی ان سے اس طرح کی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ فاروق لغاری نے ان سب لوگوں کو ایک بہت بڑا واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ ان سب کو انتقام سے بھری بینظیر بھٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فوراً پارٹی چھوڑ کر گھر لے جائیں گے۔ اس میٹنگ کے شرکاء کو یہ احساس ہوا کہ فاروق لغاری ایک خود فرض انسان ہیں اور آنے والے دنوں میں ان کے دوستوں کے درمیان اسی ایک بات سے پیدا ہونے والے اختلافات شدید ہوتے گئے اور آخر ایک دن وہ ایوان صدر میں اتنے تہوارہ گئے کہ نواز شریف کے ایک پیغام پر انہیں استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑا اور شاہد حامد سے پوچھا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کو ہرانے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی۔ شاہد حامد نے مجھے ایک عجیب سی بات بتائی۔

انتخابات کے نتائج نے ایوان صدر کے مکیٹوں کو بھی حیران کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے کر الیکشن جیت جائیں گے۔ اس حیرانی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ الیکشن سے کچھ دن پہلے آئی ایس آئی نے اپنی ایک رپورٹ ایوان صدر بھیجی تھی جس میں جعفری 1997ء کو ہونے والے انتخابات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے ہارنے اور جیتنے پر یقین گویاں کی گئی تھیں۔ آئی ایس آئی کے بقول نواز شریف کی پارٹی کو توڑے اور سو کے درمیان جبکہ بینظیر بھٹو کو پچاس اور سانحہ کے درمیان سینٹیں ملنے کی توقع تھی۔ تاہم، جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو ایوان صدر کے مکیٹ آہستہ آہستہ حیران اور پھر پریشان ہونا شروع ہو گئے کیونکہ وہ تو یہ توقع کر کے بیٹھے تھے کہ آئی ایس آئی نے جو کہ دیا تھا وہ قائل تھا۔ ایک بات واضح تھی کہ پیپلز پارٹی کے بائوس کارکن



ہوتے تھے کے لیے اپنے گمراہوں سے نہیں نکلے تھے۔

میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے شاہد حامد سے پوچھا کہ جب نواز شریف وزیراعظم  
میں تھے تو پھر لغاری اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ شاہد حامد بولے کہ شروع میں دونوں  
کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک پرائیویٹ ڈانر کا اہتمام کیا گیا جس میں فاروق لغاری، پرائم  
مشنر نواز شریف اور شاہد حامد شریک ہوئے۔ صدر لغاری نے نواز شریف کو اکانومی پر برسٹنگ دی۔ شاہد  
جاوید برکی نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ ملے پانے والے معاہدوں کی تفصیلات بتائیں۔  
نواز شریف چاہتے تھے کہ شاہد جاوید برکی ملک کے وزیر خزانہ کے طور پر کام کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک  
کے اس ملازم نے انکار کر دیا۔ اسی ڈنر پر شاہد حامد نے نواز کو دفاع اور قانونی معاملات پر برسٹنگ دی۔  
نواز نے شاہد حامد کو بھی اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ تاہم، فاروق لغاری چاہتے تھے  
کہ وہ پنجاب کے گورنر بن جائیں۔ جب کہ شاہد حامد کی یہ خواہش تھی کہ وہ فیڈرل مشنر بن جائیں تاکہ وہ  
نواز اور لغاری کے درمیان ایک ہل کار رول ادا کر سکیں۔ شاہد حامد نے محسوس کیا کہ فاروق لغاری کی  
شخصیت میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جس کا نام ڈیرہ غازی خان کی مقامی سیاست تھا۔ اب ان صدر  
میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے ملنے کی پھوٹی موٹی سیاست میں ملوث رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈیرہ غازی  
خان ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو لغاری نے ذاتی طور  
پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے یہ درخواست کی تھی کہ ڈیرہ غازی خان ان کو اپنی مرضی کے  
مطابق چلانے کی اجازت دی جائے۔ جب ایک دن فاروق لغاری کی مقامی سیاست کے حوالے سے  
پھوٹی موٹی باتوں پر شاہد حامد قصور سنا سمجھا لہذا ان کا انکار ہوئے تو صدر صاحب نے انہیں ایک طعنہ مارا:  
"شاہد حامد صاحب آپ چونکہ اقتدار میں کسی سیاسی جدوجہد یا عمل کے ذریعے نہیں آئے لہذا آپ کو  
اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جب تک مقامی سیاست میں اس طرح کی پھوٹی موٹی چیزیں نہ کی  
جائیں انتخابات نہیں جیتے جاسکتے۔"

شاہد حامد اپنے پرانے دوست کے احرام میں خاموش تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ بات کہتا  
چاہ رہے تھے کہ کس طرح اب ان صدر میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو حکومت کو کرپشن اور بیڈ گورننس کے الزامات پر  
بے طرف کرنے والے مہسوف کس طریقے سے اپنے گناہین کو تھکان پکھری اور جانوروں کے ذریعے بچ کر

کے دوت بچے کرتے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم، لگتا ہے کہ گناہین کو ذلیل کرنے کے بارے میں بھی  
فاروق لغاری اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو اپنے ملنے میں نہیں سمجھا سکا اور 2008ء کے الیکشن میں وہ  
فصل ج 1988ء میں بینظیر پارٹی کے ٹکٹ پر ایک لاکھ سے زائد ووٹوں کی لینے سے جیتا تھا۔ وہ بے مشکل تین  
دفعہ اپنے ملنے میں ووٹ دو بارہ گنوا کر ایم این اے بن سکا۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو فاروق لغاری خود چاہتے تھے کہ  
صدر کے اسٹیبل توڑنے کے اختیارات کو ختم ہونا چاہیے۔ شاید لغاری یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ایک صدر  
صرف ایک دفعہ اسٹیبل توڑ سکتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہ کوشش کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو غلام  
اسحاق خان کا ہوا تھا۔ جب 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت توڑی تھی تو  
فوج، عوام، میڈیا اور سیاستدانوں نے زیادہ رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید بینظیر بھٹو کا زیادہ قصور تھا۔  
تاہم، جب تین سال بعد مارچ، اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خان نے وہی کام نواز شریف کے  
ساتھ کیا تو پھر سب نے یہی سمجھا کہ صدر کے ساتھ ہی کچھ مسئلہ ہے جو سیاسی حکومتوں کو نہیں چلنے دے  
رہا۔ جب تک اس کی چھٹی نہیں ہوگی ملک کا نظام آگے نہیں چلے گا اور یوں غلام اسحاق خان کو سول مشنری  
بہرہ ور کر سکی کی تمام تر حمایت کے باوجود استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا تھا۔ یہی بات شاید فاروق لغاری  
کے ذہن میں بھی تھی کہ وہ اپنا اختیار ایک دفعہ استعمال کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ ان کے ساتھ کوئی کھڑا  
نہیں ہوگا۔

جب فاروق لغاری نے اپنی اس خواہش کا اظہار جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کیا تو صدر  
صاحب بڑے حیران ہوئے جب آرمی چیف نے یہ فرمایا کہ جناب آپ کو یہ 58-2b ختم کرنے کی اتنی  
جلدی کیوں ہے۔ صدر لغاری کے لیے یہ پیغام بڑا واضح تھا کہ جناب آپ کے لیے استعمال کرنے کا  
وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آرمی چیف شاید بینظیر کی طرح نواز شریف کی چھٹی بھی صدر لغاری کے  
ذریعے کرانا چاہ رہے تھے۔

نواز شریف صدر لغاری کے اس اختیار کو بڑے احسن طریقے سے ختم کرانے کے سوڈ میں تھے۔  
لگتا ہے کہ انہوں نے چوٹی زبیریں جا کر صدر لغاری کو ان کی اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات ختم  
کرنے کے سبب پر اصرار میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جب میننگ شروع ہوئی اور نواز شریف نے یہ بات لغاری



کے آگے رکھی کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر صاحب کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کرنا چاہتا رہے ہیں تو لغاری صاحب نے فوراً کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ نواز شریف نے اسلام آباد واپس آ کر پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس کا ذکر ختم کر کے لغاری صاحب کے ہاتھ سے آرمی چیف اور دیگر اہم تہیاریوں کرنے کی پاور اپنے ہاتھ میں لے لی تو یکدم سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ لغاری صاحب اور نواز شریف میں تعلقات کافی بگڑ چکے ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف چینی زیریں جا رہے تھے تو گورنر شاہد حامد بھی ان کے ساتھ تھے۔ راستے میں نواز شریف نے شاہد حامد کو بتایا کہ آپ لغاری صاحب کو یہ بات بتائیں کہ ہم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوسری دفعہ بھی ملک کے صدر بنیں۔ تاہم، لغاری صاحب کے ساتھ ہونے والی بیٹنگ سے پہلے شاہد حامد نے نواز شریف کو بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آرمی چیف کون مقرر کر رہا ہے صدر یا وزیراعظم کیونکہ جو بھی ایک جنرل آرمی چیف بنتا ہے تو وہ فوری طور پر چیف آف آرمی سٹاف بن جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پھر اپنے ادارے کے ساتھ ہوتی ہیں نہ کہ صدر یا وزیراعظم کے ساتھ۔

شاہد حامد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ 58-2b کے ختم ہونے سے صدر اور وزیراعظم کے اب تک اچھے تعلقات میں بھی فرق پڑا۔ شاہد حامد کو اس بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ نواز شریف اور لغاری کے درمیان اس کا خاتمہ بالآخر آنے والے دنوں میں دونوں کے درمیان شدید اختلافات اور صدر لغاری کے استعفیٰ پر ہوا۔

شاہد حامد نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ الیکشن ہونے سے پہلے فاروق لغاری نے نواز شریف کو بہت بڑی غور کی تھی، یعنی جب امیدواروں کی قابلیت کے مسئلے پر چند چیزیں جو نواز شریف کو الیکشن لڑنے سے روک سکتی تھیں، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف اور خالد انور نے شاہد حامد سے یہ بات کی تھی کہ فاروق لغاری کو کہیں کہ وہ کسی امیدوار کی الیکشن لڑنے کی شرائط میں سے یہ بات نکال دیں کہ وہ تمام لوگ انتخابات لڑنے کے اہل نہیں تھے جو کسی ایسی بل یا کمیٹی کے مالک تھے جو کسی بینک کی مقروض ہو۔ نواز شریف یہ چاہتے تھے کہ اس قانون میں سے کنٹرول اور بل مالک کے الفاظ نکال دیے جائیں۔ جب یہ بات عمران کاہنہ کے سامنے رکھی گئی تو تمام وزیر و دعوٰیوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وزیروں کا خیال

تھا کہ نواز شریف بڑے لیڈر تھے لہذا ان کی یہ بات مان لی جانی چاہیے تاکہ وہ الیکشن لڑ سکیں جبکہ باقی وزیر اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اگر صرف نواز شریف کے لیے اس قانون میں تبدیلی کی گئی تو فاروق لغاری اور ان کی مگر ان کا سینہ کی ساکھ بڑے طریقے سے ٹراپ ہوگی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف خود اس کاڑ سے بڑے طریقے سے متاثر ہوں گے۔ نواز شریف کا جواب سن کر شاہد حامد حیران رہ گئے۔ نواز نے انہیں بتایا کہ دراصل اس کاڑ سے انہیں ذاتی طور پر تو کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر اسے نہ ہٹایا گیا تو چوہدری شجاعت حسین الیکشن نہیں لڑ سکیں گے۔

صدر لغاری نواز شریف کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور "اصولوں کی بنیاد" پر ان تمام لوگوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کمپنیوں یا ملوں کے مالک تھے جن کے ذمے بینکوں کے کروڑوں یا ارب روپے کے قرضے واجب الادا تھے۔

الیکشن ہو گئے تھے۔ نواز شریف وزیراعظم بن چکے تھے۔ 58-2b کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب سیاسی انتشار ختم ہو چکا ہے۔ تاہم، کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ صدر لغاری کے نواز شریف سے بھی عدلیہ کے مسئلے پر اسی طریقے کے اختلافات شروع ہونے والے تھے جیسے کہ بینظیر بھٹو سے ہوئے تھے جو پہلی پارٹی حکومت کی برطرفی پر جا کر ختم ہوئے۔ دھیرے دھیرے فاروق لغاری کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ نواز شریف بھی ہمارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہ رہے تھے۔ وہ اختلافات جو دراصل وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان شروع ہوئے تھے اس کی لپیٹ میں فاروق لغاری بھی آ گئے حالانکہ شروع میں فاروق لغاری کا ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نواز شریف اور سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب وزیراعظم نے ملک بھر میں انٹی میرا سٹ کورس بنا کر عدلیہ کے سامنے ایک نیا ادارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو بتایا کہ وہ نئی عدالتیں نہ بنائیں کیونکہ موجودہ قوانین کے تحت بھی دہشتگردوں کو سزا دی جاسکتی ہے۔ ابھی اس مسئلے کی گرد نہیں بیٹھی تھی جب سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد پر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نواز شریف لاہور ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے خلاف











درمیان بڑھتے ہوئے انتہا قات کی کہانیوں سے ہا خیر تھے۔ ایک دن جہانگیر کرامت نے شاہ حامد کو فون کیا اور ان سے ان دنوں کے بارے میں قانونی رائے مانگی جنہوں نے سہادتی شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شاہ حامد نے جہانگیر کرامت کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ اس جہوں کی بغاوت کے بعد سہادتی شاہ کو اب گھر جانا ہوگا۔ شاہ حامد کی بات سن کر جہانگیر کرامت نے کہا کہ میں آج کیوں کیل براٹی نے بھی انہیں یہی رائے دی ہے کہ سہادتی شاہ کو اب جانا پڑے گا۔

فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ چیف جسٹس سہادتی شاہ ان کی جس انداز میں توہین کر رہے ہیں اس کے پیچھے فاروق لغاری کا ہاتھ ہے جبکہ فاروق لغاری کا یہ خیال تھا کہ نواز شریف اور جہانگیر بھٹو کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ دونوں عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

نواز شریف نے آخر ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قراردادوں لاکر ان کی صدارت سے چھٹی کرائیں گے۔ جب شاہ حامد کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھاگے بھاگے پوربوری ٹاور اور شہباز شریف کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ لغاری کے ساتھ یہ سلوک نہ کریں۔ تاہم شاہ حامد یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ جہانگیر کرامت کی بات سنی گئی جنہوں نے فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر گھر جانے سے بچا لیا اور بات لغاری کے استغنیٰ ختم ہو گئی۔

فاروق لغاری کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف نے جنوں پر کام کیا تھا لیکن شاہ حامد کو یہ بات کچھ نہیں آتی تھی کہ بھلا ایک ہی وقت میں ایک شخص دس جہوں پر کیسے کام کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے تھے کہ باقاعدہ ایک فن کورٹ منعقد ہوتی تھی اور سب سے سینئر جج نے اس کی صدارت کی اور حلف لیٹے کے وقت سہادتی شاہ کو جانا کیا تھا۔

جب جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ فاروق لغاری استغنیٰ دینے والے ہیں تو انہوں نے انہیں اس بات سے منع کیا۔ فاروق لغاری نے نواز شریف کو یہ بتا دیا کہ وہ ہم سہادتی کو اس ملک کا قائم مقام صدر بنا دیں جن کا خیر چیف جسٹس سہادتی شاہ کو جاننے کی سہی نہ دیکھا کرتے وقت دسترب نہیں کرے گا۔

فاروق لغاری کے ایمان صدر جس آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے شاہ حامد نے اسے کہا تھا کہ اپنے سے کچھ دن قبل فاروق لغاری نے ان سے قانونی معاملات پر مشاورت بند کر دی تھی۔ اب اس سے کام فریضہ ان کے نئے دوست خواجہ طارق رحیم اور شہزادہ جہانگیر ادا کر رہے تھے۔

شاہ حامد نے گہری سانس لی اور کہا کہ اگرچہ چیف جسٹس کو ہٹانے کے معاملے پر وہ اپنے دوست فاروق لغاری کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں لغاری کو استغنیٰ نہیں دینا چاہیے تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے تھیانگلی کے ماحول میں بڑھتی ہوئی فضا کے درمیان شاہ حامد سے پوچھ لیا کہ جب ان کے دوست فاروق لغاری استغنیٰ دے رہے تھے تو کیا یہ ان کی بھی اخلاقی ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ جو شخص انہیں اتنا اوپر لے آیا تھا، جب وہ کسی صحیح یا غلط وجہ سے استغنیٰ دے رہا تھا تو انہیں بھی اپنے دوست کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر شاہ حامد نے بھی فاروق لغاری کی ذوقی ہوئی کشتی میں بیٹھنے کی بجائے نواز شریف کے جہاز میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا چہیتا ہوا اور تلخ سوال سن کر شاہ حامد نے انکشاف کیا کہ جس دن فاروق لغاری نے صدارت سے استغنیٰ دیا تھا اس دن دوسرے سو بائی گورنروں کی طرح انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا۔ نواز شریف نے بڑی تفصیل سے ان سب لوگوں کو وہ حالات و واقعات بتائے جن کی وجہ سے فاروق لغاری کو آج استغنیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ نواز شریف سے ملنے سے پہلے شاہ حامد ایئر پورٹ سے اترنے کے بعد سیدھے آرڈی چیف جہانگیر کرامت سے ملنے گئے جہاں انہوں نے بیٹھ کر اس نئی صورتحال پر سیر حاصل کشتی کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ جب گورنر سے نواز شریف کی بیٹھ ختم ہوئی تو شاہ حامد نے چپکے سے اپنی جیب سے استغنیٰ نکالا اور نواز شریف کے حوالے کر دیا۔ تاہم نواز شریف نے شاہ حامد کو کہا کہ وہ گورنر پنجاب کے طور پر کام کرتے رہیں۔ نواز نے شاہ حامد کو بتایا کہ وہ انہیں گورنر پنجاب کی پوزیشن سے اس لیے بھی نہیں ہٹائیں گے تاکہ انہیں یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ فاروق لغاری کے آدمی تھے لہذا ان کی بھی چھٹی کرادی گئی۔

جب نواز شریف نے شاہ حامد کا استغنیٰ مسترد کیا تو انہوں نے وزیراعظم کو فاروق لغاری سے لٹی بھرنے والی بیٹنگ کے بارے میں بتایا جو انہیں ابھی جا کر کرنی تھی۔ یہ سن کر نواز شریف نے شاہ





شاہ جلال بھی ماضی میں کھوئے ہوئے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ وہ فاروق اعظمی کے لیے اور کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے ان سے طبعاً پوچھا کہ کیا کبھی فاروق اعظمی نے ان سے کوئی جھگڑا کیا تھا کہ وہ دوستی ان کے تھے جس سے ان سے لڑنے پر انہوں نے ساتھ لڑا شریف کا وہ تھا۔  
وہ نے کہیں فاروق اعظمی نے اس طرح کی شکایت بھی نہیں کی۔

آؤتھراگی پر شاہ جلال نے کہا کہ میرے تمام سوالات ختم ہو گئے تھے۔ تاہم میں نے جاننا چاہا کہ ایک اور سوال ابھی ہے کہ اگر شاہ جلال نے اپنے شہر جلال سے پوچھا تو وہ کیا جواب دے گا اور وہاں کی حالت کیا ہے۔  
انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ وہاں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نے شاہ جلال سے پوچھا کہ تمہیں شریف سے کیا بات ہے کہ شاہ جلال نے تمہیں یہاں سے لے کر اپنے پاس لے گیا ہے۔  
یہاں سے انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔  
یہاں سے انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔  
یہاں سے انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔  
یہاں سے انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں کی حالت اب بھی وہی ہے۔

میں نے اپنے دوست کو کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔

### اسحاق ڈار

اس واقعے کے تقریباً چار سال بعد اسحاق ڈار نے مجھے بتایا کہ میں نے احمد ان اور پریشان بیٹا ان کے ساتھ ایک ایک کر کے ملنے سے منع کر دیا تھا۔  
اس لیے ایک مقامی ادارہ پر نہیں بلکہ جرنل شریف کا تعلق رہتا ہے۔  
اسحاق ڈار بھی ان چند گئے پتے یا سنا تھا ان میں سے ایک تھے جو انکے گھر میں جرنل شریف کے آڈیو پر قید میں رکھے گئے۔

ان دنوں اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی تو اور شریف کی بیٹی سے تیار ہو چکی ہے۔ میں نے انہوں کو بتایا کہ اسحاق ڈار کے پاس جو اس ملک کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے تھے بہت سارے راز ہیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ وہ ان رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھے۔ باقی تو چھوڑیں وہ یہ بات بتانے کے لیے بھی پہلی دفعہ تیار ہوئے کہ تو اور شریف اور جرنل شریف کے درمیان پاکستانی جیل چھوڑ کر جہد کے سرور میں رہنے والی ذیل کی اصل کہانی کیا تھی؟  
ان رازوں سے ہم بعد میں پردہ اٹھائیں گے۔ پہلے آپ کی ملاقات اس اسحاق ڈار سے کراتے ہیں جب وہ ابھی سیاست میں نہیں آئے تھے۔ اسحاق ڈار کے ایک عام چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاکستان کے سب سے طاقتور وزیر خزانہ اور ابو ظہبی کے حکمران شیخ النہیان کے ایڈوائزر بننے تک کی کہانی بھی ایک





میں نے کہا کہ ڈار صاحب ایساں تک تو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ سرتاج عزیز کا اس میں زیادہ قصور نہیں تھا لیکن مجھے ڈرا یہ تو بتائیں کہ آخر اسے بڑے بیکرٹ فیصلے کی بلنگہ کچھ طاقتور لوگوں کو پہلے سے کیسے پہنچا گئی تھی کہ انہوں نے راتوں رات اپنے ذہنوں سے ڈال رکھا کہ باہر شفٹ کر دیے تھے۔ ڈار صاحب بولے کیونکہ وہ اس وقت فنانس منسٹری نہیں چلا رہے تھے لہذا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس طرح کی انفارمیشن کس طرح لیک ہوئی تھی۔ تاہم، ڈار صاحب نے کہا کہ یہ بات ضرور تھی کہ نواز شریف اس بات پر بڑے برہم تھے کہ ان معاشی ٹیم نے فارن کرنسی اکاؤنٹس فریز کرنا کہ ان سے ایک بہت ہی لمبا فیصلہ کر لیا تھا۔ نواز شریف کی یہ برہمی ایک دن سرتاج عزیز کی فنانس منسٹری پوسٹ سے ملنے پر جا کر ختم ہوئی۔ اگست 1998ء میں نواز شریف نے حفیظ پاشا کو سرتاج عزیز کی جگہ اپنا فنانس لینڈ انٹر مقرر کر دیا۔ حفیظ پاشا سے بھی معاملات نہیں سنبھالے گئے اور ڈالر کی قیمت 67 روپے تک چلی گئی۔ ملائیت میں یہ ہاتھ پھیلاتا شروع ہو گئی تھیں کہ دسمبر 1998ء تک ڈالر کی قیمت 100 روپے ہو

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

ڈالر سے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب ایساں تک تو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ سرتاج عزیز کا اس میں زیادہ قصور نہیں تھا لیکن مجھے ڈرا یہ تو بتائیں کہ آخر اسے بڑے بیکرٹ فیصلے کی بلنگہ کچھ طاقتور لوگوں کو پہلے سے کیسے پہنچا گئی تھی کہ انہوں نے راتوں رات اپنے ذہنوں سے ڈال رکھا کہ باہر شفٹ کر دیے تھے۔ ڈار صاحب بولے کیونکہ وہ اس وقت فنانس منسٹری نہیں چلا رہے تھے لہذا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس طرح کی انفارمیشن کس طرح لیک ہوئی تھی۔ تاہم، ڈار صاحب نے کہا کہ یہ بات ضرور تھی کہ نواز شریف اس بات پر بڑے برہم تھے کہ ان معاشی ٹیم نے فارن کرنسی اکاؤنٹس فریز کرنا کہ ان سے ایک بہت ہی لمبا فیصلہ کر لیا تھا۔ نواز شریف کی یہ برہمی ایک دن سرتاج عزیز کی فنانس منسٹری پوسٹ سے ملنے پر جا کر ختم ہوئی۔ اگست 1998ء میں نواز شریف نے حفیظ پاشا کو سرتاج عزیز کی جگہ اپنا فنانس لینڈ انٹر مقرر کر دیا۔ حفیظ پاشا سے بھی معاملات نہیں سنبھالے گئے اور ڈالر کی قیمت 67 روپے تک چلی گئی۔ ملائیت میں یہ ہاتھ پھیلاتا شروع ہو گئی تھیں کہ دسمبر 1998ء تک ڈالر کی قیمت 100 روپے ہو

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ وہ آٹھ الپ ڈالر کا پیش کر کے اور کراچی چکر سے کہہ دیا ہے۔





۱۔ اس میں آپ امریکا کا شمار سے ملتا ہے کہ اس میں اس وقت کے کئی نئے ایئر کرافٹ  
پائپ لائنیں بھی داخل کرنا مستحسن ہے۔

میں کافی اور تک سلسلہ رہ کر اسحاق ڈار کو پختہ ہوا ہے وہ ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانے سے  
بچنے کے لیے چند پائپ لائنیں بھی اس وقت کے ایئر کرافٹ کے راز کو پختہ کرنے میں آئی ہیں اور  
کراہت کو پختہ کرنا ہے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایسے مالی ادارے ایسے پاکستانی ایئر لائن کے معاملات کا  
تھیل لینے ہیں۔ وہی ہمیں نے نوڈل شریف نے فوجی راز افلا کرنے پر اس میں کیا تھا، مشرف حکومت  
میں نگرانی برقرار رکھنے کے بعد سے یہ تجویزات ہوا۔ لیکن ان کا انعام ہوا اور پورا تھا۔

انہوں کی باختمی مہلتی وقت نے اسحاق ڈار کو پختہ کیا کہ وہ امریکہ سے F-16 طیاروں کی رکنی  
ہوئی رقم کی ۱۱ اٹیگیاں کرنے کے لیے بل کھنٹن حکومت پر ہوا ۱۹۹۸۔ ۲ دسمبر ۱۹۹۸ کو نوڈل شریف  
بل کھنٹن سے بات و اس میں ہے۔ ان کے ساتھ مرتاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف اور مشاہد  
میں بھی تھے۔ بل کھنٹن نے نوڈل شریف کو کہا کہ F-16 کے باقی بیسوں میں سے ستر فیصد واپس لے  
لیں۔ باقی تیس فیصد امریکہ اپنے پاس رکھے گا اور اس معاہدے کو بیسوں شتم سمجھا جائے۔ اسحاق ڈار نے  
جب یہ آفر مانی تو وہ تیس فیصد نقصان کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بل کھنٹن سے کہا کہ سراجب یہ  
غیر پاکستان پیچھے کی کہ امریکہ نے پاکستان کے F-16 طیاروں کی تیس فیصد رقم بغیر کسی وجہ کے رکھ لی ہے  
تو اس کا کوئی اچھا اثر ۱۴ مہینوں ہوگا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بل کھنٹن اور نوڈل شریف ایسے دوست ہیں  
اور ایک دوست دوسرے کے ساتھ اس طرح کی بات نہ سانی نہیں کر سکتا۔

بل کھنٹن نے باقی حیرانی سے اسحاق ڈار کی بات سنی اور بولے کہ امریکہ کی سپریم جوڈیشیل  
کونسل نے انہیں جو ایئر وائز دی تھی اس کے تحت وہ اتنا بکھا نہیں آفر کر سکتے تھے اور اس سے زیادہ کا ان  
کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کھنٹن نے بتایا کہ ان کے پاس کاغذ نہیں ہیں بھی اکثریت نہیں تھی جہاں سے وہ  
پریم جوڈیشیل کونسل کے فیصلے کے خلاف پاکستان کو F-16 طیاروں کی سو فیصد رقم کی واپس کا فیصلہ کرا  
سکتی۔

انہوں نے تجویز پیش کی کہ اس کا دوسرا عمل یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو گندم اور کاربن کی بڑی  
شد ضرورت ہے۔ ان دنوں حکومت پاکستان یہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے بینکار کر رہی ہے لہذا

ہر گز ایئر لائنیں کسی معاہدے کے تحت پاکستان کو ملتی ہیں۔ اس سے ملتا ہے۔ اس میں اس وقت  
ان کے لیے امریکہ پاکستان کو ۱۹۹۸ میں ڈالر کی گندم اور کاربن فراہم کرے گا۔

۲۔ یہ راز افلا کرنے کے بعد اس کا راز افلا کر دیا اور پختہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس اس نئی سامان کی  
ریورس کے معاہدے سے بھی آنے لگے جن کے لیے وزارت خزانہ نے ۱۱ اٹیگیاں کرنی تھیں۔ ایک ان  
راہ کو پختہ کرنا کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جہاگیر کرامت سوئٹزر لینڈ سے پانچ اٹی ایئر  
کرافٹ گنو لینا چاہ رہے ہیں۔ جس کے ساتھ پاکستان کا ایک بہت بڑا پروڈکٹول وہاں موجود ہے جس  
کے تحت دونوں ممالک مشترکہ طور پر انٹی ایئر کرافٹ گنو تیار کریں گے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس لیے  
ہی زیادہ تھی کیونکہ سوئٹزر لینڈ کے ایک مینوفیکچر نے حال ہی میں ترکی اور چین کے ساتھ اس طرح کے  
معاہدے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروڈکٹول کے تحت اگر پاکستان اس مینوفیکچر کو پانچ اٹی ایئر  
کرافٹ گنو مینوفیکچر کرنے کا آرڈر دیتا تو وہ پاکستان میں بھی ان گنو کی تیاری شروع کر سکتے تھے۔  
اسحاق ڈار کا خیال تھا کہ اگر اس معاہدے کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں انٹی ایئر کرافٹ گنو کی  
تیاری شروع کر دی جاتی تو بڑے آرام سے اس فوجی اسٹیل کو چین اور ترکی جیسے ملکوں کو ایکسپورٹ کر کے  
کئی بلین ڈالر کمائے جاسکتے تھے۔ اسحاق ڈار نے سب سے پہلے سعودی عربیہ کے ساتھ بات کرنے کا  
فیصلہ کیا۔ کراؤن پرنس عبداللہ اور ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد سے بات چیت کی گئی۔ ان دونوں نے  
انہماکی مثبت جواب دیا اور کہا کہ اگر پاکستان میں انٹی ایئر کرافٹ گنو کی تیاری شروع ہو گئی تو وہ یقیناً  
پاکستان کو بلین ڈالر کے آرڈر دے دیں گے۔

جب ڈار نے یہ ساری بات چیت سعودی عربیہ اور ملائیشیا سے شروع کی تو اس کے بعد  
جہاگیر کرامت اب کسی غیر ملکی مینوفیکچر کو انٹی ایئر کرافٹ گنو تیار کرنے کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے لیکن  
ساتھ ہی افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جنرل جہاگیر کرامت نے ان گنو کی تیاری کا آرڈر ہیوی میکیچرکل  
کونسل کو بھی نہیں دیا جس سے پاکستان کو اچھا خاصا نقصان ہوا کیونکہ ان گنو کو سوئٹزر لینڈ کی مدد سے  
تیار کر کے سعودی عرب، ملائیشیا اور دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا جاسکتا تھا۔

میں ڈار سے پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر کارگل آپریشن پر کون جھوٹا اور کون سچا تھا۔  
سوسائٹی پہلے جو ہری شہادت نے مجھے ہی ایک انٹرویو دے کر پاکستانی سیاست میں ایک نئی بحث

بلاوی جی کہ کارگی آج ہاں کا اور ہر کون تھا۔ شہادت کے بقول بلزل شریف نے یہ آپریشن  
17 شریف سے اہل حق سے کیا تھا۔ میں نے یہ سوال اسحاق اسحاق سے کیا تھا کہ وہ اس وقت اس  
جگہ کے وار لائن تھے اب کارگی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔

اس نے مجھے بتا کر ان کارگی کے 20 کے مقابل بہت بڑے ہتھیاروں سے اس تمام علاقے سے  
آگ لگائی تھی اور اس وقت فوج اور پولیس اہل کار تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت سے  
پہلے انہوں نے یہ علاقہ لاکھ لاکھ بھڑائیوں کو مارا ہوا تھا جس کے ساتھ قتل و گروہاں ہوتے تھے  
انہوں نے کہا کہ اس وقت تک وہ علاقہ ہاں تھا۔ اسحاق اسحاق نے کہا کہ وہ اس وقت سے  
اپنی جگہ ہیں انہوں نے کہا کہ باقی صرف یہاں تک کہیں کو تھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت سے  
معاذ میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ 1999 میں بلزل شریف نے ایک دن اسحاق اسحاق اور اسحاق  
فرانز کو اس وقت اور شہادت تھی۔ جی ایچ کے بلزل آج ہاں روم میں ایک بڑی جنگ دی۔ اس کے  
بعد انہوں نے ایک کھلی کی آبی ہتھیار لگی تھی اور جن میں نواد شریف کی سربراہی میں ملحقہ کی گئیں جن  
میں بلزل اور ملک، سر ظفر الحق اور صاحبہ حسین کے علاوہ اس کھلی کے مستقل ممبران نے بھی شرکت کی  
جس میں آری جیٹ، امداد جیٹ اور ایف جیٹ بھی شامل تھے۔ سب یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواد شریف 4  
رواتی کو ذریعہ طور پر امریکہ ہائی کے جہاں وہ مل گئے تھے سے نکالت کر کے بھارت سے متوقع ایک  
جہاز تک اور کئی کوشش کریں گے تو اس سارے معاملے پر گفتگو کے لیے وہ اہم مہنگی کی گئیں۔

اس کے لیے میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواد شریف صرف فوج کو بچانے کے لیے امریکہ گئے  
تھے۔ بلزل شریف برقیہ پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگی سے پیدا ہونے والی صورتحال کو  
سننے کے لیے امریکہ کی وائٹ ہاؤس گئے تھے۔

میں نے کہا کہ اس صاحبہ ایہ بات تو ہم میں کریں گے۔ پہلے یہ بتائیں کہ کیا نواد شریف کو  
کارگی آپریشن کے بارے میں پتہ ہے ان سے یہ پتہ نہیں۔

اس نے بڑی جھنجھی سے کہا کہ نہیں

اور اسے باقی بات تو پھوڑی۔ جی کہ فوج کے کمانڈر ایف جیٹ اور بلزل جیٹ کو بھی کارگی  
آپریشن کی ایک کھلی ہائی تھی۔ نواد شریف اس کی جگہ پر 17 مئی کو اس آپریشن کے بارے

میں اللہ جی کی جھنجھی۔

اور نے انہوں نے کہا کہ کارگی آپریشن شروع کرنے سے کی وہ پہلے کبھی اس میں ایک بڑی جنگ  
انہوں نے کہا کہ انہوں نے کسی صورت میں نہیں کیا اور شریف سے کارگی آپریشن کی اطلاع پھر انہوں نے لیا تھا۔  
کارگی آپریشن کو پھر کسی کو ذریعہ اور منصوبہ بندی کے بلزل شریف نے شروع کیا۔ انہوں نے اپنی بیانی  
بہادت سے صرف اس وقت سنا لیا گیا کہ اب کارگی آپریشن کی خبریں 1999 شروع ہو گئیں۔ اسحاق اسحاق  
نے کہا کہ اس وقت کوئی ماہر کھال کر ان کی وادی کے بلزل شریف سے ایک بڑی جنگ لڑی تھی  
اور ان سے نواد شریف نے پہلا سوال یہ کیا کہ بلزل صاحبہ اپنی آپریشن کے بارے میں کیا آپ نے  
مجھے اس آپریشن کے بارے میں کون کون سے بتائے تھے۔

اس نے کہا کہ نواد شریف صرف اور صرف بلزل شریف کی اہلی و عیال سے اس بار یہ خبر کی  
گئی تھی۔ یہی وہ جھنجھی کہ وہ نواد شریف کو نواد چھوڑنے کے لیے اس وقت اور شریف پہاڑ تھے۔ نواد شریف  
نے انہوں نے سمجھنے اور غلطوں سے فوج کی عزت بچانے کی کوشش کی تھی۔ نواد شریف ان تمام بین کو بھی  
بہا ہوا ہے جے کارگی کے حوالہ لارہے تھے۔ انہیں کرتے کرتے اسحاق اسحاق پاگ بک گئے۔  
انہوں نے کہا کہ اگرچہ انہوں اس بار سے میں بہت کچھ علم تھا لیکن وہ کارگی پر اس سے زیادہ گفتگو نہیں  
کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ باقی باتیں وہ کسی جوڈیشیل کیمپن کے سامنے کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح  
کے راز انہیں طرح افشا کیے گئے تو شاید پاکستان کے مذاہم میں نہ ہوں۔

میں نے کہا کہ اس صاحبہ ایہ تو بتائیں کہ بلزل شریف کو آری جیٹ کے عہدے سے کیوں ہٹایا  
جا رہا تھا؟

اس نے گہری سانس لی اور بولے کہ نواد شریف کی بلزل شریف سے فحشی کے چھپتی جیٹ  
تھے۔ ایک دن کر انہوں نے اس عہدہ نواد شریف کی درخواست پر پاکستان شریف لائے۔ نواد شریف نے  
اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان سے فوجی سارا سامان خریدیں۔ کر انہوں نے اس کے لیے ایک  
بٹیک کا حکم کیا گیا۔ اس میں اسحاق اسحاق بھی شامل تھے۔ جیٹ آف آری جیٹ شریف نے ایک  
نکتہ جنگ دی جس کا نتیجہ اسکا کہ پاکستان سعودی عرب سے اس بات پر قائل نہیں کر سکا کہ وہ  
بہتھیار لڑنے کا آرڈر ہے۔ شریف نے سعودی بادشاہ کو بتایا کہ پاکستان نے پچھلے ایک سال میں











ابھی گھر سے نکلے وقت سکول جانے سے پہلے عیاشی کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ گھر کی خواتین کے ساتھ  
بھی جی سلوک کیا گیا۔

”کیا میں خدا تھا“ اسحاق ڈار نے بڑی عیاشی سے مجھ سے سوال پوچھا۔

میں پپ ہا۔

25 اپریل سے لے کر 6 دسمبر 2000 تک فوج نے اسحاق ڈار سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے  
گھر میں قید رہے۔ آخر ایک دن یٹینٹ جنرل محمود ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر لاہور آئے۔  
جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ جنرل مشرف کے بعد اگر کوئی سب سے مصروف شخص تھا تو وہ تھے  
لیکن پھر بھی وہ ان سے ذاتی طور پر ملنے لاہور آئے ہیں۔ جنرل محمود نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ آرمی کی  
ہاپ لیزر شپ ان کی ملک کے لیے کی گئی خدمات کو مرادتی ہے اور وہ جانا چاہتے تھے کہ ڈار صاحب  
کے آپ سیاسی مسئلے کیا ہیں۔ اسحاق ڈار نے بڑے طرہ بے لگے میں جنرل محمود کو جواب دیا کہ جی ہاں  
آپ درست فرماتے ہیں اس ملک کے لیے اتنی خدمات دینے کا انعام مجھے 12 اکتوبر کے بعد قید میں  
رکھا کر پیلے ہی رہا گیا تھا۔

جنرل محمود نے وضاحت کی کہ اسحاق ڈار صاحب کو ڈار شریف کے سب سے زیادہ قریب سمجھا  
جاتا تھا۔ ایک طرف سے اسٹیٹ بینک منسٹر تھے۔ دوسری طرف سب کا خیال تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ  
اسحاق ڈار نے نواز شریف اور ان کی سبکی کھائی کرانے سے بددعا نہ کی ہو۔

ڈار صاحب نے جنرل محمود کو بتایا کہ 2000 اپریل کو جنرل احمد نے انکی طرف ایک ٹیکس چٹ دی  
تھی۔ اب یہ اتنی اتنی لاش آئی ہے یہ وہ چاہتے تھے کہ اتنی لاش آئی جس کے بعد وہ چھوڑنے  
اور یہ سب سب کے خلاف کی جنت کھلے لیے تھے۔

جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے اس وقت آئے ہیں جب ان کے  
خلاف یہ سب سب کی جنت کھلنے لگی تھی۔ اس وقت تک انکی جنت کھلنے سے پہلے کوئی طرح نہیں کہ  
اسحاق ڈار کے خلاف نہیں کوئی ایک بھی لکچر نہیں لکھی جس پر وہ کوئی اعتراض کرتے۔ اسی لیے وہ  
ذاتی طور پر ملنے کے لیے نہ گھر آئے ہیں۔ صرف جنرل مشرف کو اس پر شک کا علم ہے۔

جنرل محمود نے ڈار صاحب سے پوچھا کہ نواز شریف کو پھونکا دینا۔

25 دسمبر 2000 کو آئی ایس آئی پنجاب کے چیف نے ڈار صاحب کو مطلع کیا کہ 27 دسمبر کو  
انہیں اور مشاہد حسین کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈار صاحب کو کہا گیا کہ وہ یہ بتائیں کہ 28 دسمبر کو عید کی نماز  
کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سکیورٹی کا انتظام کیا جاسکے۔

کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سکیورٹی کا انتظام کیا جاسکے۔  
اگلے دن 26 دسمبر کو ایک آئی ایس آئی آفیسر میاں محمد اعظم کو ان سے ملوانے کے لیے لے  
آئے۔ اسحاق ڈار کو یوں محسوس ہوا کہ ملک کا وزیر اعظم ان سے ملنے کے لیے گھر آیا ہے۔ میاں اعظم کو  
اس طرح پر وہ تو کول دیا گیا جا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ملک کے وزیر اعظم ہوں۔ میاں اعظم بھی ایسے ہی  
ایجنٹ کر رہے تھے جیسے وہ واقعی بغیر ملک اٹھائے اس ملک کے وزیر اعظم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں  
وقت ضائع کیے بغیر میاں اعظم نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ جنرل مشرف کے زیر سایہ بننے والی سیاسی پارٹی  
میں شامل ہو جائیں۔ اسحاق ڈار نے انکار کیا اور میاں اعظم کو یاد دلایا کہ ان دونوں کو سیاست میں لانے  
والے نواز شریف تھے اور اس وقت نواز شریف کو پھونکا جانا مناسب نہیں ہوگا۔

اسحاق ڈار کا انکار سن کر میاں اعظم نے ایک لمبی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے نواز شریف کو  
کیوں پھونکا تھا۔ میاں اعظم نے ڈار کو بتایا کہ ان کے پاس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ جنرل مشرف  
انکی ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔ میاں اعظم نے جب بات بننے نہیں دیکھی تو انہوں نے اسحاق ڈار پر  
عزایا کہ جناب ڈار صاحب نواز شریف ڈیل کر کے سعودی عرب جا رہے تھے تو ایک لمبے کے لیے بھی انہوں  
نے اسحاق ڈار اور دیگر ساتھیوں کا ٹیکس سوچا اور آج وہ بیٹھے نواز شریف سے وفا داری کا اصول پرست  
رہے ہیں۔ میاں اعظم وہ کھٹے تک اسحاق ڈار کے ساتھ رہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے  
رہے۔ بات ٹھیک ہی تو کوٹ گئی۔

میاں اعظم نے جا کر جنرل مشرف کو ان کے خلاف اہلانی ٹیکس رپورٹ پیش کی۔ فروری  
2001 میں ڈی نیوز کے انٹرنل کو رپورٹس طارق ریٹ نے یہ ساری رپورٹ اخبار میں شائع کر دی۔

یہ رمضان کا آخری روز تھا۔ ڈار صاحب ابھی انٹرویو سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپریشن نے  
انکو بتایا کہ ان کے لیے بدو سے ٹیلی فون کال ہے۔ فون پر دوسری طرف نواز شریف تھے۔ نواز شریف  
نے جنرل محمود کے خلاف سخت لفظ استعمال کیے اور ڈار صاحب کو بتایا کہ اس پنجابی جرنیل نے ان کے  
نقابہت و سلوک کیا ہے۔ ڈار نے بھی نواز شریف کی ہاں میں ہاں ملائی۔



اسحاق ڈار کو پتہ نہیں تھا کہ ان کی ٹیلی فون پر ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ نواز شریف کی اس کال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں اس رات رہا کرنے کے بجائے مزید آٹھ مہینے تک گھر پر قید رکھا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنرل محمود کو نواز شریف اور اسحاق ڈار کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ٹرانسکرپٹ پیش کیا گیا تھا۔ ڈار کے خیال میں ان کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کے ذمہ دار جنرل محمود تھے اور نہ انہیں جنرل امجد کے ساتھ 20 اپریل کو ہونے والی میٹنگ کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسحاق ڈار نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل امجد کو فون کیا جو اس وقت لیب سے بنا کر کور کمانڈر مٹان لگا دیے گئے تھے۔ اسحاق ڈار نے انہیں تلخ لہجے میں بتایا کہ قیامت والے دن خدا کے سامنے ان کا گریبان پکڑ کر ضرور انصاف مانگیں گے کیونکہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار تھے۔ جنرل امجد یہ بات سن کر تھوڑے سے نرم ہوئے۔ انہوں نے اسحاق ڈار کو مٹان آنے کی دعوت اور ساتھ یہ بھی کہا کہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے ذمہ دار نہیں تھے۔

جب اسحاق ڈار قید میں تھے تو انہیں کچھ سینئر فٹنری آفیسروں نے یہ مشورے دیئے تھے کہ وہ عدالت کا دورہ نہ لکھتے ہیں۔ ڈار صاحب کا خیال تھا کہ جنرل محمود ان کے اور چوہدری نثار کے خلاف دل میں کوئی ذاتی بغض رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کی رہائی نہ ہونے میں ان کا اہم کردار تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ اسحاق ڈار کے بیٹے کی سٹیجی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ ہوئی تھی لہذا اگر کوئی شخص یہاں صاحبان کے قریب ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ ڈار صاحب تھے۔ لہذا اندر کی باتیں یقیناً انہیں پتہ ہوں گی۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب آفری نواز شریف اور جنرل شرف کے درمیان یہ ڈیل کیسے اور کیسے ہوئی تھی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈار صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

سوڈی کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ عبداللہ کی نواز شریف کے لیے پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریاض

میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران کراؤن پرنس نے نواز شریف کو اپنی بھائی کہہ کر بلا دیا تھا۔ دوسرے دن آج بھی سوڈی عربیہ خصوصاً اور باقی مسلم دنیا خصوصاً زور اتھارٹیٹی بھی کو بھائی سے نہ جاننے پہ اپنے آپ کو بزم سمجھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواز شریف کا ایہام بھی بھائی کی طرح ہو۔ سوڈی عربیہ نے پہلے قطر کے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ جنرل شرف کی فوجی حکومت سے رابطہ کریں اور نواز شریف کی رہائی کے لیے مذاکرات شروع کریں۔ قطر کے وزیر خارجہ نے سوڈی عرب کو بتایا کہ جنرل شرف کی حکومت نواز شریف مذاکرات شروع کریں۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لہتان کے وزیر اعظم، فٹنری نثار کو رہا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لہتان کے وزیر اعظم، فٹنری نثار سے بات کی اور ساتھ میں اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ لگایا کہ وہ پاکستان کی فوجی حکومت سے کوئی ڈیل طے کریں۔ تاہم، بات پھر بھی نہیں بن رہی تھی۔ جب سوڈی قیادت نے یہ دیکھا کہ جنرل شرف کسی حوالے سے بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو آخر ایک دھمکی اسلام آباد کو بھیجی گئی کہ آج کے بعد دو ارب ڈالر اسفٹ میں دیا جائے والا تیل بند کر دیا جائے گا اگر انہوں نے نواز شریف کو رہا نہ کیا۔

جو کام قطر کا وزیر خارجہ، لہتان کا وزیر اعظم اور سوڈی شاہ کے اپنے بیٹے بھی نہیں کر سکے تھے وہ دو ارب ڈالر کی اس دھمکی نے کر دکھایا۔

ان مذاکرات میں پہلی کامیابی اس وقت ہوئی جب جنرل شرف نے سوڈیوں سے کہا کہ وہ شریف فیملی کے چاروں افراد سے یہ کہیں کہ وہ ملک سے اپنا میڈیکل علاج کرانے کے لیے جانا چاہتے ہیں اور اس درخواست پر نواز شریف اور ان کی فیملی کو میڈیکل گراؤنڈز پر ملک سے باہر بھیجا گیا۔

برسوں بعد جب اسحاق ڈار نواز شریف سے جدہ میں ملے تو نواز شریف نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنرل شرف سے کوئی براہ راست ڈیل نہیں کی تھی۔ جنرل شرف ابھی بھی سوڈی حکمرانوں سے یہ درخواست کرتے رہتے تھے کہ وہ شریف فیملی کو سوڈی عربیہ سے کہیں نہ جانے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ایئربیس کو بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ شریف فیملی کے لوگوں کے پاسپورٹ کی تجدید نہ کریں تاکہ وہاں سے باہر نہ جاسکیں۔

ڈار صاحب کے بقول سوڈی حکمرانوں نے پہلے دن ہی پاکستان کی فوجی قیادت کو ایک بڑا سخت پیغام بھیجا تھا کہ نواز شریف کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ ڈار صاحب نے دعویٰ کیا کہ یہ ساری ڈیل سوڈیوں نے جنرل شرف سے خود ملے کی تھی۔ نواز شریف اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ وہ جیلوں



میں تو اپنے دیگر ساتھیوں کو اس سلسلے میں شامل کرانے کا اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ صاحب نے یہ شکایت کرنا کہ  
نور شریف ان سب کو اپنے ساتھ لے کر سموی عرب کیں نہیں گئے تھے اس کا جواب بہت کم تھا ہے۔  
میں نے اور صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے نور شریف سے جنرل شرف کے ساتھ  
بہتے ہیں اور ان کی ہر ماہی کھٹوئی تھی۔ وہ لے کر ہیں۔ ان کی نور اور شہباز دونوں سے اس  
بابت میں بات ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی خیال تھا کہ فوجی حکومت نے سب سے زیادہ ہمارے گت نہیں کہا تھا  
کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اس ملک سے بچے جائیں تو ممکن ہے کہ جیلوں میں زندان کے دوسرے  
یہاں وہ سنیں اور ان کی رہائی مل جائے۔

میں نے اور صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کی نور شریف کی بیٹی سے شادی کیسے ہوئی تھی۔  
وہ لے کر اگست 2002 میں وہاں ساتھ انہوں کے ہاں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

میں نے کہا کہ اور صاحب آپ کے خیال میں نور شریف حکومت کی سب سے بڑی غلطی کیا  
تھی جس کی وجہ سے اس ملک میں 172 توڑ پھوس ہو گئی۔ وہ لے کر سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ  
قانون کوئی کھانا جس کا نر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے اعتبار کے نام پر جاری مجتہد تو صاحب پر بھی  
تھی۔ یہ بھی خلاف تھی۔ نور شریف حکومت کو اس کا اعتبار کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اس وقت اور صاحب سے آخری سال پوچھا کہ ان کا زندگی میں سب سے بڑا نقصان  
کیا تھا۔ وہ لے کر جو سب سے بڑا نقصان کے ساتھ وہی میں ملیوں لوگوں نے کیا تھا اس کے بعد  
سب کے ساتھ شہر پر ہونے لگا تھا۔ اب میرے بچے اس ملک میں ایک غیر جمہوری ماحول میں رہنے کے  
لیے جا رہے تھے۔ میری زندگی کا یہ سب سے بڑا نقصان تھا۔

### فیصل صالح حیات

فیصل صالح حیات سے میری پہلی ملاقات 2002ء کے انتخابات کے بعد میرے گھر اللہ بھائی کی  
گھر بننے کے بعد ہوئی تھی جس میں وہ پیپلز پارٹی کو تیس دہائیوں کے بعد چھوڑ کر جنرل شرف کے  
مراجمول گئے تھے۔ اس وقت وہ جنرل شرف کی حکومت کے وزیر رہ رہا تھا۔

میری ان سے ملاقات پارلیمنٹ کے کینے ٹیریا میں ہوئی تھی جہاں وہ بہت سارے صحافیوں  
میں ٹھہرے بیٹھے ان کے تیز و تند سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کو توڑ کر جانے گئے  
تھے بیڑیاٹ گروپ کے خلاف میری خبروں سے بڑے ڈالاں تھے۔ مجھے ان کی ہار اتنی کا پتہ جنگ  
گروپ کے مالک میر کللیل الرحمن صاحب کے مجھے کیے گئے ٹیلی فون سے چمکا رہا تھا۔ میر صاحب نے  
انہیں دفعہ یہ بات کہی تھی کہ فیصل صالح حیات میری رپورٹنگ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔

جب میں نے فیصل صالح حیات کو پارلیمنٹ کے کینے ٹیریا میں دیکھا تو سوچا کہ جا کر ان سے  
ملوں اور ان کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں فوننگوار موڈ کے ساتھ ان کی میز پر گیا۔ وہ مجھے  
فصل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں  
دی تھی جس سے مجھے تھوڑا سا جھکا لگا کہ کیا وہ واقعی مجھے نہیں جانتے تھے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے  
یا ان کے خیال میں جو درجہ جنگ گروپ کے مالک میر کللیل الرحمن کو براہ راست فون کر کے اس کے

یہاں کے خلاف حکومت کے ایک ہزار نوکریوں کو لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ان دنوں کی سیاسی رہنمائی شروع کی تھی اور ضرورت سے زیادہ عین جوش و خروش میں بھی شہرہ آفاق رہا۔ ان دنوں کی طرف بڑھ کر ہوا تو اس وقت تک ملازمت ملنا شروع ہوتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ ہی اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھنا شروع کر پڑے ہیں۔ وہ ہر جگہ اور جگہ آواز میں پہل کر رہے ہیں اور یہ بھی نہیں سمجھتے ہیں کہ شاید اس سے انہیں بڑا پرہیزگار بنانا پڑے گا۔ میں نے بھی وہی وقت کی وہ فیصلہ ساز حیات سے کئی بات پر غور شروع کر دی جس سے میرے دماغ کے وہاں غور و خوض کی گئی یہ ہو گئی۔

فیصل نے گھروں کا سفر کر کے ہونے لگے کہا کہ آپ اب تک ہمارے سے سیاسی گروپ کے خلاف شروع ہوا وقت ہانے میں شروع کر رہے ہیں۔ ہفت روزہ کی وقت میرے پاس آ کر بیٹھو۔ ہاں کوئی سزاوار کے طور پر لیا جاتا ہے۔

میں نے فیصل ساز حیات کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک ہزار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں جہاں سزاوار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ہفت روزہ کے لیے بیٹھنے تو اس کے ذہن میں ایک شخص تصور ہوتا ہے۔

میں نے فیصل ساز حیات کو ان کی ایک اور بات سے متعلق بتایا۔

ان کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

ان کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔

میں نے اس وقت کے ختم ہونے کے بعد ان دنوں کے ایک ہزار کے لیے ضرورت کے لیے جس وقت کے لیے ہوا۔ انہوں نے مجھے لگاتار بتایا کہ وہ اپنے وقت کے ختم میں جا رہا ہے۔



ایک بات میں نے محسوس کی کہ بینظیر بھٹو کو پھرنے کے بعد بھی فیصل کے دل میں وہی جلی  
ان کے لیے یہاں اسلام آباد تھا۔ ان کے خیال میں بینظیر بھٹو ایک شاندار ترین سربراہ تھے۔  
ایک دن ساتوں میں یہ بات طویل کی گئی۔ ہم فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو کی سیاست کو کچھ  
کے لیے ضروری تھا کہ ہم 1988ء سے پہلے کی بینظیر بھٹو، ان کے بعد کی بینظیر کو ایک دوسرے سے  
مجھو کر کے کہیں جس سے یہ لگے کہ وہ اسے کی کہیے ایک برادر بینظیر بھٹو میں اتنی جہد ملیوں آ  
گی تھی کہ وہ ایک دن اسٹیبلشمنٹ کے آگے جگہ تھی۔

بینظیر بھٹو یہ بات بھول گئی تھی کہ لوگ بینظیر پارٹی سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ یہ اپنی  
اسٹیبلشمنٹ پارٹی تھی۔ یہ ایک ایسی پارٹی تھی جہاں اپنی اپنی جگہ میں لیبرل سیکولر اور ملا دن تھی اور پاکستان کے  
لیے ایک جدید جمہوری معاشرے کی توجہاں تھی۔ ان اصولوں کے خواب حاصل کرنے کے رومانس میں  
بینظیر پارٹی کے دور کرنے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں بے پناہ لالچیں برداشت کیں لیکن اسٹیبلشمنٹ نے  
بینظیر بھٹو کی توجہ پھر لگا کر وہ ان کے ساتھ کپور و ماٹز کرنے پر تیار ہو گئیں اور یوں ان لوگوں کی آنکھوں  
میں خواب سر جھانکے جنہوں نے ان کی تخیل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑی تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سیاست میں کپور و ماٹز کرنا پڑتے ہیں لیکن ایک اچھے  
سیاستدان کو ایک سیاسی کپور و ماٹز اور ان کے ساتھ کپور و ماٹز میں ایک لیکر کھینچنی پڑتی ہے۔ ہم سیاست میں  
ساری عمر ہمیشہ ان دونوں کپور و ماٹز کے درمیان جھینس کرتے رہتے ہیں۔ لیڈرز کو کبھی اپنے بنیادی  
اصولوں اور پالیسیوں پر کپور و ماٹز نہیں کرنا چاہیے۔ فیصل کے بقول بینظیر پارٹی کو 1988ء میں حکومت  
نہیں دینی چاہیے تھی اور یہ بہت بڑی لٹلی تھی کیونکہ بینظیر پارٹی نے پہلی دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بہت  
بڑا کپور و ماٹز کیا تھا۔ جمہوریت کے لیے اتنے برس قربانی دینے کے بعد اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اتنا اندھا  
کپور و ماٹز پارٹی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے کپور و ماٹز کے بدلے میں بینظیر پارٹی کو کچھ بھی نہیں ملا۔  
اس وقت کی انتظامیہ نے بینظیر پارٹی کو فری وینڈ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت چلا سکتی۔  
بینظیر پارٹی حکومت ہر وقت یہ بات ثابت کرنے میں لگی رہی کہ وہ انٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی نہیں ہے اور اسی  
پیکر میں وہ اپنے خواب، ویرن اور کمنٹ کھونٹھی۔ فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر  
پارٹی قیادت خود ہی اس طرح کے کپور و ماٹز کر کے ایک مثال قائم کرے گی تو پھر آپ اس پارٹی کے

ہرگز ان سے کیا توقع کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی سیاست کریں گے۔

فیصل کے بقول بھٹو اور پارٹی کی نظریاتی بنیادیں اسی دن ہی دفن ہو گئی تھیں جس دن  
1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کپور و ماٹز کیا تھا۔ اس کپور و ماٹز سے سارے پارٹی  
لیڈر ان کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ پارٹی اب اقتدار میں پہنچنے کے لیے رومانوی سیاست کے بجائے عملی  
سیاست کرے گی۔ اگرچہ تمام سیاستدانوں کا آخری مقصد اقتدار میں پہنچنا ہوتا ہے لیکن یہ مقصد اگر  
سیاسی عمل سے حاصل کیا جائے تو بہتر ہے نہ کہ اپنی پارٹی کی مفاسد کو ختم کر کے جیسا کہ بینظیر بھٹو اور ان  
کی پارٹی نے کیا تھا۔ جس دن بینظیر بھٹو نے یہ کپور و ماٹز کیا اسی دن ہی بینظیر پارٹی کا ایچ ایک پراگریسو  
اور لوگوں کی جماعت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ 1977ء سے لے کر 88ء تک بینظیر پارٹی نے اپنی  
اسٹیبلشمنٹ سیاست کی لیکن راتوں رات اس پارٹی نے اتنا بڑا یوٹرن لیا کہ لوگ حیران ہو کر رہ گئے۔  
جب آپ نے ایک دفعہ کپور و ماٹز کر لیا تو پھر اس کے بعد ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور  
پہرچل سوہیل۔

فیصل نے دعویٰ کیا کہ وہ ان چند سیاسی ورکروں میں سے ایک تھے جو بینظیر بھٹو کو 1986ء میں  
پاکستان واپس لائے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر پارٹی نے 1988ء میں کسی کو مجبور  
کر کے الیکشن نہیں کرائے تھے۔

فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو نے نواز اذہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں غلام اسحاق خان کی  
مدد کر کے دراصل ایم آر ڈی کی تحریک کو دھوکہ دیا تھا جس نے جنرل ضیاء کے مارشل لا کے خلاف بڑی  
لمبی جدوجہد کی تھی۔ وہ لوگ جو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس طرح کی اندھی ذیل کے خلاف تھے انہیں  
بینظیر بھٹو نے ایک ایک کر کے سائیڈ لائن کر دیا۔ بینظیر بھٹو کے نزدیک اب سیاسی اصولوں کی کوئی  
اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ 1993ء میں انہوں نے اس غلام اسحاق خان کی مدد کی تھی جس نے 1990ء  
میں ان کی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا اور ان کی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات بنائے تھے۔  
بینظیر بھٹو اس غلام اسحاق خان کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں جو نواز شریف کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

فیصل نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایک انٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی آخر میں محلاتی سازشوں کا  
حصہ بن کر رہ گئی۔







یہ سزا کا ایک ہی ایک حکومت کے سامنے ہر ایک جزل کو فوجی آواز دے کہتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ

فیصل نے کیا کہ باقی باقی چھوڑی۔ انہیں تو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ ستمبر 1972 کو  
1986 سے پہلے ہی جزل شرف کے ساتھ ڈیل کر رہا ہو گیا۔ یہ تو جزل شرف تھے جنہوں نے  
بینظیر کے ساتھ ڈیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ اگر وہ نیب کے مقدمات کا سامنا کر سکتے تھے تو بینظیر بھٹو کیوں نہیں اسپریم  
کورٹ آف پاکستان نے ہی ان کے بینک لون کیس میں ان کی ضمانت منظور کی تھی اور وہ زیر ہوتے  
ہوئے بھی ابھی تک عدالت میں قانونی جنگ لڑ رہے تھے۔

فیصل نے اٹاٹھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ بینظیر بھٹو اس ملک میں وہ کراہتے  
علاقہ قائم کیے گئے مقدمات کا سامنا کیوں نہیں کر سکتی تھی۔ فیصل نے کہا کہ جزل شرف کے تین سال  
فونی 11 میں انہوں نے تھیں اور میسٹریس دیکھیں مگر انہوں نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی  
اپنی پارٹی کے ساتھ کنٹیکٹ تھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی نے تحریک چلا کر جزل شرف سے  
انتخابات نہیں کروائے تھے۔ کسی سیاسی پارٹی کے پاس کوئی سٹریٹ پاور نہیں تھی۔ آپ باقی باتیں  
چھوڑیں۔ 11 کے بعد افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد بھی جماعت اسلامی چند ہزار سے زیادہ  
لوگ سڑکوں پر نہیں آئی۔ جزل شرف نے نئے انتخابات کرانے کا قوم سے وعدہ کیا تھا جو اس نے پورا  
کیا۔ اس قوم نے جزل نیا، الملق کا کیا کر لیا تھا جب اس نے 90 دن میں انتخابات کا وعدہ کر کے 11  
سال تک وادی میں کراہی ملک پر حکومت کی۔

میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا کہ آخر فیصل صالح حیات کو کس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ بینظیر  
بھٹو کے ساتھ چھوڑ کر جزل شرف کے ساتھ مل جائیں۔ فیصل صالح حیات کا بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کا فیصلہ  
کوئی ماہیات نہیں تھی۔ فیصل اس پارٹی کے لیے کئی سالوں تک شاہی قلعے کی الیمیں بھگت چکے تھے۔  
آخر کو تو ہوا اس کی وجہ سے فیصل جیسا بھلا بھی اب بینظیر بھٹو سے ماہوں ہو کر ایک آمر کی حکومت  
میں رہنے پر مجبور کیا تھا۔

اب اکتوبر 2002ء میں اس ملک میں انتخابات ہوئے تو بینظیر بھٹو نے پارٹی کے لیڈروں کو

سورج وال پر دیکھی کرتے کے لیے دعویٰ نکالایا۔ فیصل نے ستمبر کو بڑے واضح طور پر یہ بات بتائی کہ وہ  
اپنے لگا گیا کسی کیس میں اسٹیلٹ کے ساتھ کبیر و ماہرز اور ڈیل کرتی آئی تھی۔ ایک دفعہ ہی طرح  
کی سورج وال بھر بیٹا ہو رہی تھی۔ اسٹیلٹ میں بینظیر بھٹو کو سب کچھ دینے کو چاہی لیکن اس کے بدلے میں  
وہ اپنی تھی کہ بینظیر بھٹو ملک سے باہر رہیں۔ فیصل نے ستمبر کو بتایا کہ پیپلز پارٹی اس پوزیشن میں ہے  
کی حکومت بنا سکے اور اس کو بر حال میں حکومت بنانی چاہیے۔ فیصل نے بی بی سی سے پوچھا کہ ماضی میں  
جی تو بہت سارے ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی رہی ہیں جو انہیں پسند نہیں تھے تو  
اب کی بار اس میں کیا ہوتا ہے۔ فیصل کے خیال میں پیپلز پارٹی اور بینظیر بھٹو کے اصل سیاسی دشمن نواز  
شریف تھے نہ کہ پی ایم ایل کیو۔ فیصل نے بینظیر بھٹو کو وہ تمام نام گوائے جو نواز شریف کے دور میں  
بیلوں میں بیٹھے گئے۔ یوسف رضا گیلانی، مشتاق اموان، آصف زرداری ان میں نمایاں تھے۔ یہ نواز  
شریف ہی تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کو دھوکہ دیا۔ 2 دسمبر 2000ء کو اسے آر ڈی کے نام سے بینظیر بھٹو  
کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد بنایا اور ٹھیک آٹھ دنوں بعد جزل شرف کے ساتھ ایک فہم ڈیل کر کے ملک  
سے چلے گئے۔ نواز شریف نے بڑی سمجھداری سے پیپلز پارٹی کی سیاسی طاقت کو جزل شرف کے ساتھ  
ڈیل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

یہی وجہ تھی کہ فیصل چاہتے تھے کہ پی ایم ایل کیو کے ساتھ ڈیل کرنے میں بہت بڑا فائدہ تھا  
کیونکہ پی ایم ایل کیو کسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنی  
نہیں جیت سکتے تھے اور انہیں طاقتور حلقوں نے ایک پارٹی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی بڑے آرام  
سے اس حکومت میں اپنی مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔

فیصل نے بی بی سی سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ گمراہ کی سیاست کر کے انہوں نے کیا حاصل کر لیا  
ہے۔ وہ ایک ڈیل کر کے بڑی آسانی سے پاکستان واپس آ سکتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے  
کبیر کو مکی عدالتوں سے سیشن کر سکتی ہیں جب ان کی اپنی پارٹی اقتدار میں ہوگی۔

فیصل کو کبھی نہیں آ رہی تھی کہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیلٹ کے ساتھ گمراہ کی سیاست  
سے کراہا تھا لیکن اب وہ جزل شرف سے گمراہ کرنے کے سوا میں نہیں۔ 1988ء میں ستمبر نے  
ایک بار پارلیمنٹ کے نظریے پر چلتے ہوئے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ آنے والے برسوں میں بھی باور



پاکستان کے قیام سے آگے لڑائی نہیں۔ بلکہ وہ تھی کہ پارٹی کے اندر سے امت رسا سے ایسے بہتر  
اور کامیاب اور پارٹی کی برقی آئینہ اور پختہ کی بات کرتے تھے۔ اب سہل پارٹی ایک  
بہتر اور اعلیٰ سطح کی پارٹی بن چکی تھی۔ انہوں نے محترم سے کہا کہ وہ اپنی اپنی جگہ سے جی آر  
سہل پارٹی کی محنت سے جی آر کے کام سے مدد دیا پاکستان واپس آئیں۔ فیصل کا یہ بھی خیال  
تھا کہ سہل پارٹی سب سے کڑی پارٹی اس پارٹی میں نہیں تھی کہ وہ سہل شرف کو اپنی شرف کا  
سودہ کر سارے بھرا کر سکتے۔ فیصل نے اس سبب میں یہ بھی کہا کہ محترم نے جی آر سے حاصل کی تھی  
وہ انہوں نے اس سطح کے خلاف اپنے اندر موجود لانے کی مسابقت سے حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہ  
کوئی آئی تھی کہ وہ سہل جانے سے بچوں پارٹی تھی۔

بینظیر بھٹو نے فیصل سارا حیات کی یہ ساری باتیں چپ ہو کر سنیں اور پھر وہ یوں شروع  
ہوئیں۔ محترم نے کہا کہ فیصل اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔  
ان کے بچوں کا پاپ پچھلے سات سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے۔ اب اگر وہ بھی جیل چلی گئیں تو ان کے  
بچوں کا خیال کن رکھے گا۔

فیصل نے بی بی کو جواب دیا کہ محترم قوم کے لیڈر ہمیشہ اپنے نہیں اپنی قوم کے بچوں کے لیے  
سوچتے ہیں۔ انہیں نہیں ملتا جیسا کہ گاندھی کی قائم کی گئی مثالوں پر غور کرنا چاہیے جن کا وہ اکثر اپنی  
فکر یہ ہیں اور تقریروں میں رفرنس دیتی رہتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں جمہوریت پسند لیڈروں کو  
ہیشہ کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور ایسے ملکوں کے لیڈروں کو جیل جانے سے خوفزدہ ہونے کے بجائے  
اپنے لوگوں کے لیے لڑنا ہوتا ہے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ سہل شرف بینظیر بھٹو کو کس طرح کی ذہنی آفر کر رہے تھے۔ وہ  
نے کہ اس قدر سولے کا وقت میں نہیں کوئی دیکھ سکتا تھا۔ کیریز کے بہت سارے روز سہل پارٹی  
سے لے جاتے۔ سہل کا بیٹا سہل پارٹی کا سہل اور سہل میں بھی سہل پارٹی کے لیڈروں کو  
کیریز میں سہل پارٹی کے سہل میں سہل شرف پانچ تھے کہ بینظیر بھٹو کچھ عرصے کے لیے  
ملک سے باہر تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ سہل بھٹو نے سہل شرف سے یہ ذہنی کیوں نہیں کی تو وہ

اسلے کہ پارٹی طاری سے جب سے ان کی حکمت تو ذرا ہی تھی اس کے بعد وہ کسی پارٹی میں کسی کرتی  
تھی۔ یہ بات یہ ہے کہ ان کی عدم موجودگی میں پارٹی میں سے کوئی پیمانہ  
نہیں ملتا۔

فیصل نے بتایا کہ انہیں نہیں تھی کہ وہ سہل بھٹو کے ساتھ بات کر سکتے  
تھیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ محترم سے اس انتظار رکھ کر بات کریں۔ فیصل نے بھی بینظیر  
سے یہی کہا کہ اگر وہ ذہنی قیادت سے ذہنی کرنا چاہتی ہیں تو پھر وہ انہیں نہیں کو پختہ طور پر سمجھتے کریں۔  
فیصل کی یہ بات سن کر بینظیر بھٹو نے یہاں پر انداز میں ایک جملہ کہا "You all"

Makhdooms (Faisal and Faheem) feel and think alike

فیصل نے بتایا کہ انہیں نہیں تھی کہ وہ محترم کے ساتھ کھل کر کسی معاملے پر  
بات کر سکتے۔ انہیں نہیں کو اپنی اوقات کا پتہ تھا اور انہوں نے محترم کے ساتھ کبھی بھی اپنی اوقات سے  
بہرہ نکل کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ بینظیر بھٹو جیل جانے سے کیوں خوفزدہ تھیں تو وہ نے کہا  
سہل پارٹی کے اندر ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ محترم پاکستان واپس آئیں کیونکہ وہ ان  
کی عدم موجودگی میں پارٹی کے مامے چاہتے بنے ہوئے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پارٹی کے اندر کے ہم  
برادریوں سے پیچھے کھڑے کر رہے تھے۔ انہوں نے محترم کے ذہن میں بار بار یہ بات سنا کر انہیں خوفزدہ  
کر دیا تھا کہ اگر وہ جیل چلی گئیں تو ان کے پیچھے ان کے بچوں کا خیال کون رکھے گا۔

فیصل نے ذہنی میں ہونے والی اس سبب میں بی بی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا ذہنی سبب سہل  
انہیں کو کبھی پر عزم پلاتا ہے۔

انہوں نے فیصل سے پوچھا کہ انہیں کیا لگتا ہے کہ ان کا سہل سہل پارٹی کی طرف تھا۔  
اکتوبر 2002ء کے انتخابات کے بعد سہل پارٹی کی سہل انہیں کو کبھی کے وہاں ہوتے تھے  
تو انہوں میں کبھی یہ بات کہی گئی کہ بینظیر بھٹو کے "ذہنی سبب" نے اسیدہ اور انہیں کو پختہ نکلت  
ایسا وقت چھوڑ کر وہاں پہنچے کر لے تھے۔ یہ عرصہ کہ وہ سہل پارٹی کے انتخابات میں سہل  
کرتے کے لیے لے گئے تھے لیکن بعد میں یہ سہل انہیں کو کبھی کے "ذہنی سبب" نے انہیں جیسا



میں نے کہا کہ میں نے بیٹھ کر سوچا اور اس طور پر یہ بات کی تھی کہ میں آپ کی قیادت کو اختیار کرنے کو چاہوں گا۔ آپ کے ذہنی صاف کی قیادت کو نہیں!

فیصل نے اسے واضح انداز میں عرض کیا تھا کہ آپ ان لوگوں کو پارٹی لیڈروں پر حاوی نہ ہونے دیں جن کی پارٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی پارٹی کے لیے کوئی کھٹ نہیں بیٹھتا بلکہ اس ذاتی صاف سے سب لوگ غارت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے پارٹی کو فرسٹ بنا لیا تھا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پارٹی کیوں چھوڑی جس کے لیے وہ مٹھی بھر کی دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔

فیصل نے ایک نئی کہانی سنائی۔

پہلے پارٹی میں ایک وقت دو کام چل رہے تھے۔ ایک طرف پارٹی اصولوں کی بات کر رہی تھی اور دوسری طرف عام کو یہ بتا دیا جا رہا تھا کہ اس پارٹی سے بڑا اور کوئی شخص اصول پسند نہیں تھا جبکہ دوسری طرف ایمن جمیم کو بیٹھنے بٹھانے یہ مانگ دیا ہوا تھا کہ وہ جنرل مشرف سے ڈیل کریں۔ مولویوں پر مشتمل تمام مجلس عمل کے لیڈروں سے بھی بات چیت جاری تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ پانچ دفعہ ایم این اے کا الیکشن جیت کر آئے تھے اور ان کی وفاداری اور کھٹ کا سب کو علم تھا۔ لیکن جب جو نئے لوگوں کو ان کا پاس بنا دیا گیا جنہیں پارٹی آفیسرز کے بارے میں کچھ نہیں تھا تو ان کے دل میں پہلی دفعہ دراڑ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب ایمن جمیم کو بیٹھنے بٹھانے یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے خلاف ایک سخت لائن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب پارٹی کے گروپ نے ان سے یہ بات سنا لی کہ جنرل مشرف پہلے پارٹی کے بغیر اسلام آباد میں نئی سیاسی حکومت نہیں قائم کر سکتے تو فیصل صالح حیات نے فوراً یہ ہمانپ لیا کہ اب اس ملک کا سیاسی نظام ادا ہے وہاں ہے۔ وہ فوری طور پر اپنے چند دوستوں سے ملے اور انہوں نے پارٹی کو بھارت کے فیصلہ کیا۔ فیصل اور ان کے دوست اس وقت سے دوبارہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ پارٹی میں موجود کچھ لوگ انہیں اپنے معاملات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ فیصل اور ان کے

ساتھوں نے لڑھکھڑائی کو بچانے کے نام پر ایک نئی فیکٹری سمجھوتے کو ایک عملی امر سے پر تریخ دیکھتے ہوئے اپنا ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ سیکرٹری جنرل نے پہلے پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ فیصل نے بڑی سختی سے میری اس بات کی تردید کی کہ ان پر پریشر ڈال کر ان کی سیاسی صلاحیتوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے جن پر ایسا ڈال کر اپنی مرضی کا کوئی کام کرایا جاسکتا تھا۔ وہ ماضی میں کئی دفعہ فوجی آمروں کے خلاف لڑتے ہوئے تھیل جاتے تھے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے پہلے پارٹی چھوڑی تھی ان کے کردار اور کھٹ کے بارے میں سب لوگوں کو اچھی طرح علم تھا۔ فیصل تو یہاں تک بھی کہہ گئے کہ جنرل مشرف کے ساتھ پہلے پارٹی کے سارے لیڈر ڈیل کرنے کے لیے پر قول رہے تھے لیکن ہم نے ڈیل اس لیے کی کہ ہم ایک کمزور سیاسی نظام کو چھٹا دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ بولے کہ جب انہوں نے میرٹ ہوئی میں اپنا ایک نیا سیاسی گروپ بنانے کا اعلان کیا تو وہ جنرل مشرف سے ملنے کے لیے گئے اور انہیں اپنی جماعت کا یقین دلایا۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ ایک باوردی صدر کے حق میں نہیں تھے، لیکن اس وقت ملک کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ایک باوردی صدر کا ہونا ضروری تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے ملنے والے پہلے پارٹی کے پہلے لیڈر نہیں تھے جو پارٹی مشرف سے اس لیے ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت کو گرایا جائے۔ پہلے پارٹی کے بی لیڈر جنرل وحید کاکڑ اور جنرل آصف نواز سے بھی ملتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت ختم کر لی جا سکے۔ پہلے پارٹی کے یہ لیڈر ان تو جنرل جہانگیر کرامت سے بھی ملنے کے لیے آرمی ہاؤس جاتے تھے۔

فیصل نے بتایا کہ پہلے پارٹی اب منافقوں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ بیٹھنے بٹھانے کی بات سے پہلے جنرل مشرف سے ڈیل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کسی کو ایل ایف او کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اب جب ان کی ڈیل نہیں ہو سکی تو یہ پارلیمنٹ میں جمہوریت کے بہت بڑے مخالف بن کر اب رہے ہیں۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ اب تمام مجلس عمل کو دیکھ لیں۔ اس کے ذریعے ایل ایف او



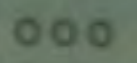




پہلی ملاقات باہل نجم ہو کر وہی تھیں۔ فیصل نے بغیر تامل و ہمت کے مجھے کہا کہ ہاں یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں پہلی ملاقات کی موت واقع ہو ہی تھی۔

میں نے کہا کہ ہم پہلی ملاقات کی کیلیاوت کریں جب باہل میں ایک دوسرے کے لئے جتنی پوری توجہ دے سکیں اور ہر بات ایک ہی بات میں سمجھنے سے۔

میں نے فیصل صاحب حیات کے سفر سے مجھے سے پہلے ان سے ایک آفری سوال پوچھا کہ کیا وہاں پارٹی میں کئی عہدہ ہلال سے چھوڑ کر کے جس کے لئے انہوں نے کئی دنوں سے تعلق میں کر رہے تھے۔ ان کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ پارٹی کو اپنے تو جنرل شرف کے اس خواہش سے چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے جواب دیا کہ اب میں کئی عہدہ ترک کر رہی ہوں۔ فیصل نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ اب میری پارٹی ایک پارٹی ہے اور اپنی ایک شہرہ و پہلی ملاقات۔



اس شروع کے بعد وہ فیصل صاحب کی ملاقات کے چودہویں پر وچ الٹی اور چودہویں ملاقات کے اور وہاں بھی گئی۔ چودہویں پر وچ الٹی نے سب عادت و عہدہ میں ہر اس لینڈ کو ٹنگ کر شروع کر دیا جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ جنرل شرف کے قریب تھا یا کل کھان کو ان کے وزیر اعظم بننے کی چھٹی کی فرمائش کے آگے توڑی ہی بھی حراست کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پیپلز پارٹی کی بیخوشی کے ارکان سب سے زیادہ پر وچ الٹی کے نکلنے پر آئے۔ ان کے علاوہ فاروق لغاری، رانا سکندر اقبال، فیصل صاحب حیات، انکڑ شیر گل خان ہزاری، حاجیوں اختر، جہاگیر خان ترین اور دیگر ایسے لینڈ ان تھے جن پر ہر وقت وزیر اعلیٰ پر وچ الٹی کی نظر کرم ضرورت سے زیادہ رہتی۔ تاہم باقی لینڈوں کے برعکس فیصل صاحب حیات ڈٹ کر چودہویں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ وہ دوسروں کی نسبت ان چودہویں کی کوئی غرض آمد نہیں کرتے تھے۔ فیصل کا خیال یہ تھا کہ جب ان سب کو جنرل شرف کے اور ہار سے ہی فیصل ملتا تھا تو پھر وہ میدان میں اپنی جیت چودہویں پر وچ الٹی اور چودہویں ملاقات میں جیسے چاہے اور ہار سے کیوں گھولتی جائے۔ اگر غور نہ کرنی ہی ہے تو جنرل شرف کی کیوں نہ کی جائے۔ چودہویں کو فیصل کی اس عادت سے بڑی پر وچ الٹی۔ فیصل انہیں اس وجہ سے بھی ہارندہ تھے کہ

ان کے پاس ملاقات باہل نجم ہو کر وہی تھیں۔ فیصل نے بغیر تامل و ہمت کے مجھے کہا کہ ہاں یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں پہلی ملاقات کی موت واقع ہو ہی تھی۔ میں نے کہا کہ ہم پہلی ملاقات کی کیلیاوت کریں جب باہل میں ایک دوسرے کے لئے جتنی پوری توجہ دے سکیں اور ہر بات ایک ہی بات میں سمجھنے سے۔ میں نے فیصل صاحب حیات کے سفر سے مجھے سے پہلے ان سے ایک آفری سوال پوچھا کہ کیا وہاں پارٹی میں کئی عہدہ ہلال سے چھوڑ کر کے جس کے لئے انہوں نے کئی دنوں سے تعلق میں کر رہے تھے۔ ان کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ پارٹی کو اپنے تو جنرل شرف کے اس خواہش سے چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے جواب دیا کہ اب میں کئی عہدہ ترک کر رہی ہوں۔ فیصل نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ اب میری پارٹی ایک پارٹی ہے اور اپنی ایک شہرہ و پہلی ملاقات۔

شکست عزیز کی کہنت بننے سے ایک دن پہلے فیصل صاحب حیات کا مجھے فون آیا۔ وہ اس مسئلے پر اپنا اندر و در بنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اس اندر وچ میں گجرات کے چودہویں پر شہید چھٹے کیے اور مجھے ان پو پو آفسروں کے نام دیئے جنہیں انہوں نے وزیر و اعلا کے طور پر ایف آئی اے سے انسانی سنگٹک کے اثرات پر لکالا تھا اور اگلے روز ہی پنجاب حکومت نے انہیں صوبے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ فیصل نے اس اندر وچ میں پوری تفسیلات بتائیں کہ کیسے چودہویں صاحبان باہل میں انسانی سنگٹک میں ملوث رہے تھے۔

جوئی اگلی صبح یہ اندر وچ پھپھا، دوپہر کے وقت مجھے فیصل صاحب حیات کا فون آیا۔ وہ بڑے اظہار ہوا میں تھے اور بولے کہ ابھی صدر شرف سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کے مولا سے لگتا تھا کہ بات بہت بڑی اچھی رہی تھی۔ صدر نے اس بات پر غفلت کا اظہار کیا تھا کہ انہیں دی نوز کو اندر وچ دینے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس سے ان کی حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک دوسرے سے اختلافات بڑھ







بعد فیصل جیسا بھدا، سیاستدان اس موقع کو کیسے ضائع جانے دیتا۔ وہ مسکراتے ہوئے  
 کڑے ہوئے اور بولے کہ جناب ایہ بڑی گریب سی بات ہے کہ جس رچرچر کے بارے میں آپ کہ  
 رہے ہیں کہ وہ بیک بیلر ہے اس کے بارے میں 10 دن پہلے ہی آپ کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی  
 نے اسی جگہ کڑے ہو کر فرمایا تھا کہ وہ ان کا ذاتی دوست ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ یوسف رضا  
 گیلانی صاحب اپنے وزیروں کے خلاف خود ہی خبریں لگوا رہے ہیں۔  
 اس کے بعد وہ صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی اور فیصل صالح حیات مسکراتے ہوئے قومی  
 اسمبلی کے ہال سے باہر نکل گئے۔

## امین فہیم

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد امین فہیم کو پہلی دفعہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ اب کی دفعہ  
 وزیر اعظم نہ بنے تو پھر وہ کبھی نہیں بن سکیں گئیں۔ اس سے بہتر موقع ان کی زندگی میں نہیں آ سکتا تھا۔  
 پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے انتخابات میں پی ایم ایل کیوں کے بعد زیادہ سینیٹیں لے چکی تھی۔ پی ایم  
 ایل کیوں کو ہاؤس میں سادہ اکثریت نہیں مل سکی تھی۔ حکومت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل پرویز  
 مشرف پیپلز پارٹی کے ساتھ ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیں۔ اگر پیپلز پارٹی اس اتحاد میں شریک ہونے  
 سے انکار کرتی تو پھر جنرل مشرف کو پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے الیکشن کرانا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ  
 جنرل پرویز مشرف ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے پر تیار ہو گئے۔  
 اب صرف بینظیر بھٹو کی ایک چھوٹی سی ہاں کی ضرورت تھی۔ بینظیر بھٹو نے امین فہیم کو لندن بلا لیا تھا۔ اس  
 ملاقات میں یہ طے ہونا تھا کہ بینظیر بھٹو امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے پر تیار تھیں یا نہیں۔  
 لندن جانے سے قبل آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ امین فہیم کی ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔  
 ایک مرحلہ تو یہ بھی آیا کہ ان مذاکرات میں آصف علی زرداری بھی شامل ہو گئے اور اس وقت کے ڈی جی  
 آئی ایس آئی جنرل احسان الحق اور ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل احتشام ضمیر کے ساتھ خفیہ  
 ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔



ایک رات امین فہیم آصف زرداری کو پھر ہسپتال کے کمرے سے اس طرح پوری چپکے آئی ایس آئی کے برنیوں سے ملانے لے گئے کہ سیکورٹی پر تعینات گارڈز کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ ملاقات اتنی ظہیر رکھی گئی تھی کہ اس کا بینظیر بھنو کو بھی علم نہیں تھا۔ کسی کام سے بینظیر بھنو نے آصف زرداری کو واقفیت سے کال کیا تو ان کا فون بند ملا۔ ایک دو اور لوگوں سے بی بی نے پوچھنے کی کوشش کی تو بھی انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بینظیر بھنو کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھیں کہ جنرل مشرف نے ان کے خانہ کو ہسپتال سے انوار کرا لیا ہے اور زرداری صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ زرداری صاحب کو انوار کے جنرل مشرف ان پر اپنی مرضی کی ذیل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی پر بی بی کے عالم میں بینظیر بھنو نے واقفیت میں مشہور صحافیوں شاپن صہبائی، خالد حسن، انور اقبال اور دیگر کو فون کر کے آصف زرداری کے انوار کی خبر شروع کر دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر آصف زرداری کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار جنرل پرویز مشرف ہوں گے۔

پاکستان میں اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ابھی بھی اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک ایم ایس این سینٹر پر شاپن صہبائی صاحب، جو واقفیت میں تھے، نے مجھے جیلو کہا اور بولے رات تمہارے لیے ایک بہت ہی خبر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ کل صبح کی تمہاری لینڈ سٹوری بن سکتی ہے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ بینظیر بھنو اس وقت شدید ہراساں ہیں کیونکہ آصف زرداری پھر ہسپتال کے کمرے سے قلاب ہو چکے ہیں اور کسی کو کوئی علم نہیں کہ انہیں کون وہاں سے انوار کر کے لے گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر واقعی چونک گیا۔ شاپن صاحب سے دو چار اور نہیں لیے۔ کہیں سے آصف زرداری صاحب کے ساتھ رہنے والے ڈاکٹر قیوم سومرو کا موبائل نمبر لیا۔ ڈاکٹر قیوم سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ انہیں یہ تھا کہ زرداری صاحب کو کون کہاں لے گیا ہے۔ دراصل بینظیر بھنو کو آصف زرداری اور امین فہیم دونوں کے فون بندل رہے تھے لہذا وہ پریشان ہو گئی تھیں اور جلد بازی میں انہوں نے صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بینظیر بھنو کو یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ زرداری صاحب اس وقت جنرل احسان سے ملاقات کر رہے ہیں اور مستقبل کی حکومت اور وزیراعظم کے نام پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب بینظیر بھنو پختاری تھیں کہ انہوں نے کیونکر اتنی جلدی صحافیوں کو فون کرنا شروع کیا تھا جس سے بات تھوڑی ہی بگڑ گئی تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کی خبر دہائی جو اگلے دن دی نیوز کی لینڈ سٹوری گئی جس سے عام پبلک اور سیاسی لیڈروں کو احساس ہوا کہ مذاکرات اب بہت عجیب و غریب مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی کے لیے آصف زرداری کو آئی ایس آئی کے سیف ہاؤس میں رات کے اندھیرے میں جنرل احسان اور دیگر جنٹیوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس ملاقات میں ہی جنرل مشرف کے جرنیلوں نے بینظیر بھنو کو یہ قائل آفر دی تھی کہ وہ امین فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بننے دیں۔ پھر پوری شہادت حسین کے ساتھ مل کر ایک کا بیڑہ بنائیں جس میں بینظیر پارٹی کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ بھی بینظیر پارٹی کو دی جائے گی۔ پنجاب میں پوہادی سکرانی کریں گے لیکن وہاں بھی بینظیر پارٹی کو کچھ وزارتیں دی جا سکتی ہیں۔ سو بہرحال مولویوں کے حوالے کرنا تھا جبکہ بلوچستان میں بی ایم ایل کیے اور مولویوں نے مل کر حکومت چھٹی تھی۔ یوں جنرل مشرف بڑی بکھاری سے ماسوائے نواز شریف کی پارٹی کے تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار شیئر کرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت صرف اپوزیشن میں رہ جاتی اور وہاں ہیں کے قریب ایم این اے 342 کے ہاؤس میں جنرل مشرف کے لیے کیا مسائل بیجا کر سکتے تھے۔ نواز شریف اور بینظیر بھنو ملک سے باہر تھے اور یوں جنرل مشرف کے اقتدار کو دور دور تک کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جنرل مشرف نے اپنے ہمیں ایک بڑا خوبصورت پلان بنایا تھا لیکن اس کا سارا دار و مدار بینظیر بھنو اور محمد امین فہیم کی لندن میں ہونے والی ملاقات پر تھا۔

لندن جا کر امین فہیم نے بینظیر بھنو کے سامنے یہ سارا پلان رکھا اور بتایا کہ جنرل صاحب انہیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی شرط تھی کہ بینظیر بھنو تین سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گی۔

بینظیر بھنو سکرانیں اور انہوں نے امین فہیم جنہیں وہ سیکرٹ ایجنسیوں اور جنرل مشرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کر رہی تھیں سے پوچھا کہ محمد امین فہیم نے یہ تو بتائیں کہ اس پوری فریل میں میرے لیے کیا ہے؟













بریگیڈیئر امتیاز نے بھی وہی گولیاں نہیں کھیلی ہوتی تھیں۔ وہ امین فہیم کے پیچھے گئے رہے۔ آخر  
امین فہیم مان گئے لیکن انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس صورت میں سندھ  
حکومت میں شامل ہوں گے اگر ان کے ساتھ ہام صادق علی اور قلام علی گھلامانی کو بھی وزیر بنا دیا جائے۔  
ہام صادق علی ان دنوں لندن میں جلا وطنی کے دن گزار رہے تھے۔

بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں وزیر بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔  
یہ بیحد ہبات تھی کہ بعد میں اسی ایجنٹسٹ اور سیکرٹ ایجنسیوں نے اسی بھارتی ایجنٹ ہام  
صادق علی کو 1991-93 میں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا کر پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔

جب جنرل ضیاء کو مخدوم طالب المولا کے انکار کا پتہ چلا تو انہوں نے غور ان سے ملنے کی  
طواغلی کی لیکن مخدوم طالب المولا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ ساری بات چیت آگے بڑھی تو امین فہیم امریکہ چلے گئے جہاں 17 اگست  
1988 کو انہوں نے جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثے کی خبر سنی۔

امین فہیم فری طور پر پاکستان لوٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی۔  
انجیلٹسٹ نے ایک وفد بھرا کر کھیل شروع کر دیا۔ وہ بہنو خانہ ان میں سے کسی کو بھی

وزیر اعظم بنانے پر تیار نہیں تھے۔ اب کی اولیٰ انجیلٹسٹ امین فہیم کو تو ذکر ملک کا وزیر اعظم بنانا چاہتی  
تھی۔ ایک دن امین فہیم کو پتہ چلا کہ فرزندہ راولپنڈی فتح رشید احمد جو اس وقت سیاست میں آئے نہیں

جانے جاتے تھے اور پھر چوری طور پر ان سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت  
کے آری چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر قلام اسحاق خان کا ایک پیغام انہیں دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر

اس ملک کے نئے وزیر اعظم بن جائیں۔ امین فہیم کو بتایا گیا کہ انہیں سندھ سے قابل اعتماد بندے کی  
ضرورت ہے۔ آری چیف اور صدر بینظیر بھٹو کے ہمارے انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں

نے یہ تجویز دی کہ وہ پارٹی کے اندر ایک فارورڈ ہاک بنائیں لیکن امین فہیم نے انکار کر دیا۔  
میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ جب آپ کے خاندان نے پیپلز پارٹی کے لیے اتنی قربانیاں

دی تھیں اور وہ بھٹو خلی کے وقادار بھی رہے پھر بھی بینظیر بھٹو نے انہیں اس ملک کا وزیر اعظم نہیں بننے  
دیا۔

امین فہیم نے قرب لگایا اور بولے کہ جب ان کی بینظیر بھٹو صاحبہ سے 11 اکتوبر 2002 کو لندن  
میں ملاقات ہوئی تھی تو محترمہ نے انہیں پیپلز پارٹی حکومت بنانے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔ محترمہ نے  
میں فہیم سے کہا تھا کہ وہ اپنی ایم ایل کیوں کی لیڈر شپ سے پاؤر شیئرنگ معاہدے کے لیے گھنگو شروع  
کریں۔ امین فہیم کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب ان مذاکرات میں ان کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ

1991ء کے بعد بینظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔  
میں نے کہا کہ مخدوم صاحبہ! موما یہ کہا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ پیپلز پارٹی  
میں سے کوئی سندھی لیڈر وزیر اعظم بنے کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی پارٹی تک پاؤر شیئرنگ  
بے گوار ہو جاتی۔

امین فہیم نے بڑی شدت سے اس تاثر کو مسترد کیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو واقعی انہیں وزیر اعظم بنانا  
چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آصف علی زرداری کو 2002ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنانے کے لیے  
ہونے والے مذاکرات میں شامل کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ امین فہیم صاحبہ! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے کو بھی سندھ کا وزیر اعلیٰ نہ  
ہونے میں بینظیر بھٹو کا بڑا ہاتھ تھا حالانکہ جنرل مشرف اور آپ کے ساتھی ان کے بیٹے کو یہ عہدہ دینے  
کے لیے تیار تھے۔

امین فہیم نے یہ کہہ کر پھر بینظیر بھٹو کا دفاع کیا کہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ جب انہیں جنرل  
مشرف کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کو سندھ کا چیف منسٹر بنوائیں تو انہوں نے محترمہ سے

رہنمائی کے لیے ساری بات انہیں بتائی تھی۔ محترمہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے لوگوں کو اتحاد میں  
لے لیں اور سب لوگ تقریباً اس پر راضی بھی ہو گئے تھے۔ جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی کے درمیان اعلیٰ

تقریباً فائل ہو چکی تھی۔ جنرل مشرف نے ان کے بیٹے کو وزیر اعلیٰ سندھ بنانے کی گھوسلی دے دی تھی۔  
پھر وہی شہادت حسین اور وزیر اعظم ظفر اللہ بھٹو نے گراہی بھی کر لیا کہ پرنس کا نظرس میں ان کے بیٹے

کو چیف منسٹر بنانے کا اعلان کرنا تھا۔  
اس پرنس کا نظرس سے چند گھنٹے پہلے امین فہیم کو ایک ٹیلیفون کال آئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے

بیٹے کو گراہی کا وزیر اعلیٰ بنانا چاہتے ہیں تو پہلے پیپلز پارٹی سے اعلان لاٹھلی کریں۔







امین فہیم سے ہر اتیرا کر 2008ء کے شروع میں ہوا جب فروری کے انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو پاکستان کا وزیر اعظم بھگنے لگے تھے۔ اس میں ان کا تصور بھی نہیں تھا کیونکہ نوڈیر میں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی وکلی پریس کانفرنس میں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے آپ کو جلاول ہنوز زرداری کے ساتھ کوٹھنڈ پر سن سنبھ کر کہا کہ یہ اعلان کیا تھا کہ امین فہیم ان کے وزارت علی کے امیدوار ہوں گے۔

29 دسمبر 2007ء کو نوڈیر میں ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا۔ میں وہاں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اپنے اخباری نیوز کے لیے رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

یہی وہ تھی کہ فروری کے انتخابات میں جب پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو امین فہیم نے اپنے آپ کو ملک کا وزیر اعظم بھگنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے چالیس سال پرانے دوست بینظیر انور بیک نے امین فہیم کو اسلام آباد میں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات شروع کر دیا تھا۔ بہت سارے سفیر تو خود امین فہیم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کے نئے وزیر اعظم کو قریب سے دیکھ کر ان کے بارے میں اپنا ایک تاثر قائم کریں۔ انور بیک کے ایل بی جی انٹرویو میں بہت زیادہ تعلقات تھے جس کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت کر کے دکھایا جب بینظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں اور انور بیک نے پارلیمنٹ ہاؤس میں سو سے زیادہ غیر ملکی سفیروں کو ایک چمٹ سے بینظیر بھٹو کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر بھٹو بھی انور بیک کے اسے زیادہ تعلقات سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اب جبکہ بینظیر بھٹو نہیں رہی تھیں تو انور بیک نے اپنے دوست امین فہیم کو ایل بی جی انٹرویو میں متعارف کرا کر شروع کر دیا تھا۔ اس میں انور بیک کا تصور بھی نہیں تھا کیونکہ یہ آصف علی زرداری ہی تھے جنہوں نے نوڈیر میں بیٹھ کر امین فہیم کو پاکستان کا نیا وزیر اعظم بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ امین فہیم انور بیک کے ذہن میں ہی یہ نہیں آسکتا تھا کہ انتخابات کے بعد آصف علی زرداری صاحب کی ترجیحات کدو ہل چکی تھیں۔ امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے کا اعلان ممکن ہونے کے بعد اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی بدنامی کو دہلانا ہونے سے روکا تھا۔ بینظیر بھٹو کے بعد ان کوئی پارٹی کا لیڈر ان سکتا تھا تو وہ امین فہیم تھے جو اس وقت پیپلز پارٹی پارلیمنٹ کے چیئر مین تھے۔ اگر سٹریٹجک دیکھیں تو وہ بینظیر بھٹو کی دو بینڈ تھیں جس میں بینظیر بھٹو کی وصیت تھا کہ سنائی گئی اور زرداری صاحب نے پارٹی اپنے اپنے حصے میں لے لی۔ امین فہیم بدنامی پر اتر آتے تو شاید آصف زرداری

صاحب کے لیے پارٹی پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہ رہتا۔ یوں بڑی بگھڑائی سے امین فہیم کو کسی بھی موقع عداوت سے باز رکھنے کے لیے آصف زرداری نے وقتی طور پر انہیں وزیر اعظم بنانے کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ ان کی ایک سیاسی چال تھی۔ لیکن امین فہیم آخری دن تک جب تک آصف رضا گیلانی کے نام کا اعلان نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو وزیر اعظم کا امیدوار سمجھتے رہے۔

جب انور بیک امین فہیم کو سفیروں سے ملوا رہے تھے، اس وقت آصف زرداری صاحب ابھی بھی نوڈیر میں موجود تھے۔ جب مجھے ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو میں نے دی نیوز میں اس کی ایک سنوری فائل کی۔ اور تو اور امریکی سفیر بھی انور بیک کے گھر پر آ کر خصوصی طور پر امین فہیم سے ملی تھیں اور انہوں نے بھی ایک طرح سے اپنی طرف سے کلیئرنس چٹ دیدی تھی۔ انور بیک اور امین فہیم نے اپنے میں ہم دورک پورا کر لیا تھا۔ جب امریکن سفیر کو ان کے وزیر اعظم بننے پر اعتراض نہیں تھا تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا تھا۔ یوں امین فہیم کے وزیر اعظم بننے میں کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔

جب یہ سنواری چھپی تو مجھے انور بیک نے فون کر کے کہا کہ کلاسز صاحب! آپ نے تو امین فہیم کے وزیر اعظم بننے کے امکانات تقریباً ختم کر دیئے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا تو وہ بولے کہ آج امین فہیم کی کچھ مغربی سفارتکاروں سے ملاقاتیں تھیں۔ اس خبر کے چھپنے کے فوراً بعد امین فہیم کو بتایا گیا تھا کہ وہ تمام ملاقاتیں چھوڑ کر فوری طور پر نوڈیر پہنچیں۔ آصف زرداری صاحب ان سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بیک صاحب کا خیال تھا کہ یہ صلاح مشورہ محض بہانہ تھا۔ دراصل زرداری صاحب نہیں چاہتے تھے کہ امین فہیم غیر ملکی سفیروں سے ملیں۔

اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور امین فہیم اب اس ملک کے نئے وزیر اعظم نہیں ہوں گے۔

دی ہوا جس کا اندیشہ انور بیک نے ظاہر کیا تھا۔ نوڈیر سے واپسی پر امین فہیم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن انہوں نے بھی آخری لمحوں تک آصف زرداری پر اپنا دباؤ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انہی دنوں میں امین فہیم کے حق میں خبریں دینا شروع کیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ یہ آصف زرداری ہی تھے جنہوں نے انہیں خود وزیر اعظم بنانے کی بات کی



میں نے اس کو دیکھا ہے اور اسے سے شکر ہے۔ میں انہوں نے میرے ساتھ وہ کام سمجھائی وہی کو کھانے سے ہے۔  
یوسف زرداری صاحب ہمارے ہے۔ کی سمجھائی نے ان کے اور سے ان کو سوال کرنا تھا تو کسی نے  
رازی موشی کی مٹروں کرتی تھی، کوئی مٹروں کی خوشامی حاصل کرنے کے لیے ان سات ان کا مٹروں  
کا ہوا تھا۔

اسی قسم اور آصف زرداری کے درمیان اشتقاق سے بلائی تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔  
پھر پارٹی کے لوگوں کو اسی پر اندازہ ہوا شروع ہو گیا تھا کہ ہوا کار سب بدل گیا ہے۔ ایک دن زرداری  
صاحب نے اسلام آباد کے صحافیوں کو اپنے۔ ایٹ میں واقع زرداری ہاؤس میں شام کے کھانے پر  
جا۔ ۱۰۔ ۱۰ سے لے کر پہلے سمجھائی تک سب وہاں شریک ہوئے۔ انار اخیال تھا کہ زرداری صاحب  
شاہ صحافیوں کے منہ سے کچھ نہیں سنا چاہتے تھے۔ یہ طبعہ کہانی ہے کہ وہ دو گھنٹے تک ٹوٹی بولتے  
رہے اور انہوں نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد سمجھائی انہیں گھیرے کھڑے  
تھے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی ان کے دائیں بائیں کھڑے  
تھے۔ زرداری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں انہیں کس کو وزیراعظم بنانا چاہیے؟ میں  
نے ان سے کہا کہ سمجھائی ہونے کے باطنے یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں انہیں مشورے دوں کہ وہ کس کو  
وزیراعظم بنائیں یا کس کو نہ بنائیں۔ یہ بات انہیں اپنی پارٹی کے لوگوں سے پوچھنی چاہیے۔

زرداری صاحب نے اپنی روایتی منکرانہٹ کے درمیان مجھ سے پھر پوچھا کہ نہیں آپ مجھے  
تائیں کہ میں کے وزیراعظم بنوں۔ میں نے پھر وہی طرز پر جواب دیا۔

اس کی بار زرداری صاحب نے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ آپ کو میں مشورہ نہیں دینا چاہیے لیکن  
میں آپ سے خود پوچھ رہا ہوں لہذا آپ مجھے تائیں۔

میرے لیے یہ پوچھنا مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہی دنوں یہ خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ آصف علی  
زرداری امین جمیم کے بعد احمد نواز شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی میں سے کسی ایک کو وزیراعظم  
بنانا چاہتے تھے۔ گیلانی صاحب اور قریشی صاحب میرے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں سے میرا پرانا  
تعلق تھا۔

میں نے زرداری صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں انہوں نے خود ہی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

میں نے انہیں کو وزیراعظم بنائیں کے لہذا انہیں اپنا صدر پورا کرنا چاہیے۔ تاہم، میں نے زرداری صاحب کو  
اپنا ایک نہیں نے اسی طرح ایک وہ وہ یوسف رضا گیلانی سے بھی کر رکھا ہے۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کونسا صدر؟

یوسف رضا گیلانی اور ارد گرد کھڑے صحافیوں نے مجھے پوچھ کر دیکھا۔ میں نے زرداری  
صاحب کو یاد دلایا کہ جب اقتساب عدالت کے جج نے یوسف رضا گیلانی کو سات سال کی قید سزائی  
تھی تو اس وقت عدالت میں موجود تھے۔ یہ زرداری صاحب ہی تھے جنہوں نے اونچی آواز میں یہ  
کہا تھا کہ جج صاحب آپ یوسف رضا گیلانی کو نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کے صدر پاکستان کو سزا سناتا  
رہے ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب امیرالمیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جج صاحب کو کہے  
ہوئے اپنے الفاظ پر عملدرآمد کر سکتے ہیں۔

زرداری صاحب نے میری بات سنی اور فوراً بولے کہ ہاں مجھے یوسف رضا گیلانی سے کیا ہوا  
اپنا یہ وعدہ یاد ہے۔

اس کھانے سے ہم فارغ ہوئے تو سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب کسی صورت بھی امین  
جمیم اس ملک کے وزیراعظم نہیں بننے والے تھے۔ اب مقابلہ یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور احمد  
نواز کے درمیان تھا۔

انہی دنوں حسین حقانی بھی امریکہ سے آئے ہوئے تھے اور ہر وقت وہ زرداری صاحب کے  
قریب موجود رہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ صحافت کی ہوئی تھی لہذا انہیں صحافیوں کی پروفیشنل کمزوریوں کا  
بھی علم تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ٹر بھی جانتے تھے۔ ان کے  
خلاف اخبارات میں خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ان کا تدارک کیا  
جائے۔ میں نے احمد ان ہواجب انہوں نے مجھے فون کیا اور بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی اور  
نہایت گل کر کہا کہ وہ مجھے احمد کی بہت ساری سیاسی خبریں دے سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں مجھے  
نہوں کی مدد تک ان کے مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

مجھے حیرت کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی خبر دے رہا ہوں جو کسی کے



پاس نہیں ہے۔ یہ میں لکھانی تھے جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ یوسف رضا گیلانی ہی اس ملک کے وزیر اعظم ہوں گے۔

ان دنوں اب یوسف رضا گیلانی کا نام 100000 تک سنے میں نہیں آتا تھا یہ میں لکھانی ہی تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ ساری بحث فضول تھی کہ کون وزیر اعظم بنے گا۔ اگر کسی نے وزیر اعظم بنا تو وہ یوسف رضا گیلانی تھے۔

جس طرح سے میں لکھانی نے مجھ سے خبروں کا سوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ شاید میرے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ ہوں اس ایک واقعہ کے بعد میرا اور ان کا زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ یہ ملکہ وہ بات ہے کہ میں نے یوسف رضا گیلانی کے وزیر اعظم بننے کی خبر اخبار میں نہیں دی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں کسی لکھانی کی فوٹو اس کے ہتھ سناوات کا خیال نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر مجھے ان کی وی ہوئی اس خبر کو ہا ہے وہ کئی ہی بڑی کیں نہیں تھی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امین فہیم بڑی بخاری سے الٹی پارٹی میں تھا ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے تمام ساتھی جن پر وہ بہت مہر کرتے تھے وہ انہیں ایک ایک کر کے چھوڑتے جا رہے تھے۔ امین فہیم نے بھی آخری دم تک لانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قومی اسمبلی میں وزیر اعظم کا انتخاب لڑیں گے اور ان کے لیے انہیں آصف علی زرداری کی ماحولی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹریں کے تجربے میں ہیں۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ سندھ سے کچھ ایم این اے ان کا ساتھ دیں گے۔ خصوصاً ان کو نوید قمر، بدایان، قاسم، دیکھتے تھے کہ ہر دفعہ نوید قمر ان کی وجہ سے اپنے حلقے سے جیتتے تھے۔ اگر وہ نوید قمر کے حلقے میں موجود اپنے مریدوں کو انہیں ووٹ ڈالنے کا نہ کہیں تو نوید قمر کبھی نہیں جیت سکتے تھے۔

امین فہیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا ہنسا ان وقت کا جب نوید قمر نے ان کی ماحولی کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوید قمر جیسا شخص بھی انہیں اس مشکل مرحلے میں ہوں چھوڑ جائے گا۔

اگر پیپلز پارٹی کے دوستوں کے ہاتھوں دھکا کھانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ راجہ پرویز اشرف نے پوری کر دی۔ یہ وہی راجہ پرویز اشرف تھے جو پیپلز انور بیک کے گھر پر رات کو دی گئی پارٹی میں اکیلے اس وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے جب امین فہیم ہاتھ روم جانے کی نیت سے صوفے سے

لکھتے تھے۔ جب امین فہیم ہاتھ روم سے واپس لوٹتے تو بھی راجہ پرویز اشرف ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو جاتے تاکہ امین فہیم کو پتہ چلے کہ وہ ان کی دل سے کتنی عزت کرتے ہیں۔ تاہم، جب امین فہیم کو ان کی ضرورت پڑی تو راجہ پرویز اشرف نے ان کا فون تک سنے سے انکار کر دیا۔

امین فہیم بھول گئے تھے کہ بیٹنیکر بھنومر چکی تھیں۔ اب آصف علی زرداری پارٹی کے صدر ہیں اور نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ نئے بادشاہ کے درباری بن چکے تھے۔ اگر اس لیے کوئی بھی شخص امین فہیم کے ساتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا تھا تو یہ انور بیک تھے۔ ان دونوں کی دوستی کراچی میں 1960ء کی دہائی میں شروع ہوئی تھی۔ اپنی دوستی کو پکا رنگ دینے کے لیے دونوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے نام نجیب رکھے تھے۔ آج ان دونوں کے بیٹے ان کی دوستی کی طرح اپنی مہر کی چالیس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

انور بیک کے اسلام آباد کے میڈیا اور ڈیپو بیک انکلیو میں بے پناہ تعلقات تھے جس کا سارے کا سارا نکتہ وہ امین فہیم کو ہور ہا تھا۔ انور بیک کے ان تعلقات کی وجہ سے ہی امین فہیم کو عوام میں بھر دیاں لڑ رہی تھیں اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ زرداری صاحب نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

آصف علی زرداری کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس وقت امین فہیم کے ساتھ اگر کوئی شخص اپنی دوستی بھاریا ہے تو وہ پیپلز انور بیک ہیں۔ زرداری صاحب نے اپنے قریبی دوست فیصل بٹ کو ایک رات انور بیک کے گھر بھیجا اور انہیں بڑا دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ امین فہیم کی حمایت سے باز آ جائیں اس کے بدلے میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

انور بیک اپنی پارٹی کے لیڈروں، نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف کی طرح سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ سیاستدان دوستیوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے فیصل بٹ کو یہ کہا کہ وہ امین فہیم کے چالیس سال پرانے دوست ہیں اور اس مرحلے پر شخص سیاسی مفادات کے لیے ان سے تعلقات ختم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

یوں زرداری صاحب کا یہ پیغام ٹھکرا کر انور بیک نے دوستی کے نام پر اپنا سیاسی کیریئر تباہ کر لیا تھا ان کے نزدیک ان کی دوستی ان کے سیاسی کیریئر سے زیادہ اہم تھی۔

وقت آگے نکل گیا تھا۔ یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم بن چکے تھے۔ آصف علی زرداری ابھی



بہو گی اور ان صدر کہیں۔ اپنے بھائی آصف علی زرداری سے ہیں۔ اپنے خاوند کی لاپٹیوں پر ایک دن  
نے بھائی سے منظر سے کی۔ اب ایک سندھی بلوچ کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ محمد امین نعیم کی تہی  
کے منت ترے کو نظر انداز کرتا۔

یوں ایک بلوچ سردار نے طالب المولا کے اس بیٹے کو معاف کر کے وزیر بنا دیا جس نے بھی  
اپنے آپ کو بھٹو کی پارٹی جان کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنے ترے ڈال کر راضی کیا تھا اور بھٹو صاحب  
نے ایک بڑا اتار بجلی جملہ کہا تھا کہ محمد ام آف ہالا کا ان کی پارٹی میں آنے سے وہ سندھ میں اپنا آدمی  
سے زیادہ ایشیائی جیت گئے ہیں۔ آج اسی محمد ام طالب المولا کی بہو ڈو الفکار علی بھٹو کے داماد سے اپنے  
خاوند کی جان بخشی اور اسے کسی مال بنانے والی وزارت کا وزیر بنانے کی درخواست کر رہی تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیک انور بیک سے ٹکڑہ دارا کی تھی۔ انہوں نے انور بیک کو ایک بیٹا مہیا گا کہ وہ ٹکڑہ کی بیٹے سے  
اسٹیلی لیا گیا۔ تاہم دارا نے ان کے مورخان کو سنبھال لیا۔ انہوں نے صدر صاحب کو بتایا کہ وہ بھٹو  
انور بیک صاحب ایسے ہی ٹکڑہ سے دارا کا بیٹا ہے اور بھٹو سے ہیں۔ اگر ان سے اس وقت  
اسٹیلی لیا گیا تو یہی بھٹو بنے گا کہ انہیں انہیں نعیم کے ساتھ دوستی کی سزا دی جا رہی ہے۔ غیر زرداری  
صاحب کو یہ بات کچھ بھی آگئی اور انہوں نے انور بیک کے اسٹیلی پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

جب دارا کے سینے میں بے سبب زرا کے لیے انکھات ہونے لگے تو انور بیک ٹکٹ اپلائی کرنے  
کے لیے چار نہیں تھے۔ ان کا دل اس وقت بے طرح ٹوٹ گیا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ محمد امین نعیم نے  
ان کی بھانجے سندھ سے دوستی اور لوگوں کا نام ٹکٹ کے لیے دیا تھا۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا  
کہ ان کا چالیس سال پرانا دوست ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں نے  
انور بیک کو بھائی کی انہیں پارٹی ٹکٹ کے لیے ضرور اپلائی کرنا چاہیے۔ یہ ضرور تھا کہ انہیں ٹکٹ نہیں ملے  
گا لیکن کم از کم یہ بوجھ بھٹو پارٹی کے کدھوں پر رہے گا کہ انہوں نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا تھا۔  
وہی ہوا آصف علی زرداری صاحب نے انور بیک کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

کچھ عرصے بعد کسی دوست نے آصف علی زرداری سے انور بیک کو ٹکٹ نہ دینے اور ان کے  
ساتھ اچھا سلوک نہ رکھنے کی شکایت کی تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ آپ اس بات پر شکر کریں کہ  
انور بیک ابھی تک زندہ ہے۔

انور بیک کے بعد یوسف تالپور بھی ان لیڈروں میں سے تھے جو امین نعیم کے حامی تھے اور وہ  
اپنی اس حمایت کو ختم کر بیان بھی کرتے۔

اسی اثناء میں یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ امین نعیم کے لیے اقتدار سے باہر رہنا مشکل ہو رہا  
تھا ان کے گھر سے ان پر بڑے بڑے ناشر ہوا کہ وہ کس پیکر میں پڑ گئے ہیں۔ بارہ سال بعد چیمپلز پارٹی  
اقتدار میں آئی ہے۔ وہ دن رات بیٹھنے بھٹو کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے اور آج جب پھل  
کھانے کا وقت آیا تو وہ اقتدار سے باہر ہیں۔ گھر کے فریق چھٹا بھی ذرا مشکل لگ رہا تھا۔ اب انہیں کچھ  
نہیں آ رہی تھی کہ آصف علی زرداری کو کیسے راضی کیا جائے۔ آخر محمد ام صاحب کی کراچی والی بیگم کو ایک  
طرف کچھ شکر آ گیا انہیں نے سندھی روایات کو استعمال کرنے کا فیصلہ لیا۔ کراچی سے جہاز پکڑا اور

### آصف علی زرداری

مجھے سیاستدانوں کے انمشافات پر اپنی سیاسی پروفاٹل کرتے ہوئے کچھ ماہ گزر گئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑی تیزی سے دی نیوز کے قارئین میں پاپولر ہو رہا تھا۔ اردو اخبارات بھی ان پروفاٹلز میں سے سنی فیز خیریں نکال کر اور ان کا ترجمہ کر کے پھاپ رہے تھے۔ کالم نگار دوستوں نے بھی دھیرے دھیرے کالموں میں ذکر کا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے لیے یہ نئی چیز تھی کہ ماضی کے سیاستدانوں کے بیٹوں میں اسے راز چھپے ہوئے تھے جو اب دھیرے دھیرے باہر نکل رہے ہیں۔

آصف زرداری ان دنوں جنرل مشرف کے زیرِ عتاب تھے۔ غلام الحق خان سے لے کر نواز شریف، طارق لغاری اور اب جنرل مشرف نے آصف زرداری کو سیدھا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں آصف زرداری پر کیمز بنائے۔ انہیں جیلوں میں رکھا اور انہیں اپنے تئیں سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری وکیلوں اور ان مقدمات پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔ ایک دفعہ تو ہاتھ دوا ڈیڑھ جنرل پاکستان نے اپنی ایک رپورٹ میں آصف زرداری پر بنائے گئے ان مقدمات پر فریق ہونے والے کروڑوں روپوں کو قومی خزانے پر ایک بوجھ اور غیر قانونی قرار دیا تھا۔ جب میں نے دورِ پورٹ چھاپی تھی تو سینئر رسائربانی نے پڑھا کہ اس کی کاپی مجھ سے مانگی تھی۔ اب یہ نہیں پتہ کہ انہوں نے اس سرکاری دستاویز کا کیا استعمال کیا تھا۔

آصف زرداری کی میڈیا کے توہین کے ساتھ ایک عجیب سی 2007-2008 اور 2008-2009 کی شہادت ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو مجھ تک پہنچنے والے لوگ ان دنوں صرف اس بات پر فریق کو دیتے ہیں کہ وہ کسی طریقے سے انہیں دیکھنا سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں کہ جیل میں 14 ماہ۔ جب زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد میڈیا کو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اسل نہیں تو حاکم اور انہیں نے محض استعمال کیا تھا کیونکہ وہ انہیں جیل میں رکھا کہ بیٹنیکر ہوگی اپنی مرضی کی شرائط پر قبول کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھتا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مردِ مخلص تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے اردوانے احتساب جیل کے انچارج ایگزیکٹو سیف الرحمن کی طرح عدالتوں میں بھان بھان کر کے رہتے تھے پورے ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تخریبی معافی دے دے کہ ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف زرداری کی قفل میں ہمارے میڈیا کے پاس ایک ایسا دیوانہ مائی کردار آ گیا تھا جو عدالتوں میں پیشیوں کے وقت نواز شریف یا سیف الرحمن کی طرح رونے دھونے کے بجائے چہرے پر ایک لمبی مسکراہٹ طاری کیے ہر ایک سے ملتا تھا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے ڈیل کر کے ملک سے چلے جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں میں آصف زرداری کی قدر و اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ بیٹنیکر بھٹو اپریل 1999ء میں نواز شریف کی احتساب عدالتوں کے خوف سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ بچے کچھ دو نمبر سیاستدان جو پوری شجاعت کی قیادت میں جنرل مشرف کے دربار میں بی ایم ایل کیو کی بنیادیں رکھ کر ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پر بیعت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں لوگوں اور میڈیا کو یہ محسوس ہوا کہ آصف زرداری کرپٹ سبھی ٹیکن بزدل ہرگز نہیں ہے، جس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح کوئی ایل کر کے ملک سے فرار ہونے کی بجائے اپنے ملک کی جیل میں رہنا پسند کیا تھا۔ یہ طبع و کہانی ہے کہ کچھ عرصے بعد آصف زرداری صاحب اس وقت کے ڈی جی ایم آ کی مدیم تاج کے ساتھ خفیہ مذاقیں کر کے ایک ڈیل کے ذریعے رہا ہو کر نیویارک پہنچ گئے اور پھر وہ تین سال بعد دسمبر 2007ء میں پاکستان واپس لوٹے جب بیٹنیکر بھٹو قتل ہوئیں اور اب وہ اس ملک کے صدر ہیں۔

میرے صحافی دوست محسن رضانے دو تین دفعہ مجھے کہا کہ تم آصف زرداری کا ایک پروفاٹل



اعتراف اپنے اہلکار کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ فرحت اللہ ہارے نے بھی ایک دو موقعوں پر کچھ ایسی بات کی۔ میں نے وہاں سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ میری زرداری صاحب سے ملاقات کرادیں اور میں بتیہ یہ اعتراف کروں گا۔ یوں جون 2003ء کی ایک تھقی دوپہر میں میں راہ پونڈی کی احتساب عدالت کے امانے میں پہنچی گیا جہاں آصف زرداری ایک اور رات کے لیے سمائلوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ پتیل پارٹی کے ہارنے ہانکارا کر کن قاضی سلطان محمود بھی وہاں موجود تھے۔ محسن رضا اور شعیب بھٹو نے میرا آصف زرداری سے تعارف کروایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اتنی دیر میں عادل بھٹو وہاں آ گئے۔ وہاں وہاں سے اٹھ کر ایک فاسلے پر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے اور میں سمجھتی دوستوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ عادل بھٹو سے گفتگو کر کے وہاں سے کوئی تھکسوں کری پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک دفعہ بھٹو ان سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے نام سنی سے مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ میں نے کچھ اور شاید کسی کو پہلی فون کٹ چاہ رہے ہیں۔ چند لمحوں تک وہ فون کھولتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ ابھی مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ لا مارا میری جیب سے بیچن نکال لیا۔ وہ اس بیچن کو موبائل فون کی طرح دکھ رہے تھے کہ وہ میرے ہاتھ لگے واپس کر دیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ کھتہ آئی کہ آخر زرداری صاحب میرا فون کھول کر تم کیں چیک کر رہے ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں فلیش ہوا۔ دراصل زرداری صاحب میری فون لے رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ میں موبائل فون پر ان کی گفتگو سنیپ تو نہیں کر رہا تھا وہی طرح وہی میں کوئی ایسی آواز تو نہیں کی ہوئی تھی جس سے ساری بات پیرت مٹھوٹا ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بڑی شدت کو فٹ ہوئی۔ کوشش کے باوجود مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے زرداری صاحب کو کہا کہ سزا کی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے اہلکار ترقی دوستوں نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ مجھے آپ سے مل کر آپ کے ساتھ فون آنے والے واقعات کی کہانی قلمبند کر کے اپنے اہلکار میں پھیلانی چاہیے۔ اور یہی بات یہ ہے کہ ایک صحافی ہونے کے اسے یہ ہر اہلکار بننا ہے کہ میں اپنی جیب سے کوئی بھی نیپ، پکارا اور نکال کر آپ کے سامنے رکھوں تاکہ جو بھی گفتگو ہو پکارا ہو۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں موبائل فون میں چپکے سے پکارا دیکھ آں کر کے اس ساری گفتگو کو مٹھوٹا کروں۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا اور ہارے کے سائیکس انٹراکس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پہلی دفعہ مجھ سے مل رہے ہیں۔ میں آپ کو انہوں جانتا آپ مجھے نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ کسی پر اعتماد کرنے یا اس کا اعتماد پیشے کے لیے وقت لگنا ہے۔ آپ آتے جاتے رہیں گے تو میں آپ پر بھی بھروسہ ہو جائے گا۔

مجھے خیال آیا کہ میں آصف زرداری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب آپ سات سال ہر ہفت اپنے ارد گرد پھریس کی وردیاں پہنے اجنبی لوگوں میں سوتے جاگتے ہیں اور آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون جاسوس ہے اور کون محض اپنی ذہنی دے رہا ہے تو پھر انسان کا اس طرح کا رویہ ہو ہی جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں میں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے انگلیش لٹریچر میں ماسٹر کیا ہوا ہے تو وہ تھوڑے سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ پھر تم جرم مجرم میں کیا کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ خود ہی بول پڑے کہ ہاں ٹھیک ہے کہ جب آپ زندگی میں کسی بھی شے میں جانا چاہتے ہیں تو پھر پریکٹیکل لائف آپ کو سب کچھ دکھا دیتی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آصف زرداری بڑی اچھی سرائیکی بولتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ان کا اعتراف پیشے کے لیے سرائیکی میں گفتگو شروع کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا وہ یہ میری طرف کچھ بول گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑا ہی سہی لیکن مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بات واضح تھی کہ آصف زرداری کی شخصیت میں چینل جانے کے بعد بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک Gladiator ہوں جو اپنے لوگوں کو ایک عالم بادشاہ کے شکنجوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک لمبی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ پتیل پارٹی کے ایک ایسے جنگجو تھے جنہیں جب بھی پارٹی چاہے کسی بھی کام کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ ہاتھ و پاؤں کے اندر رہوں یا باہر۔

آصف زرداری سے جوں جوں باتیں ہونا شروع ہوئیں تو محسوس ہوا کہ وہ پتیل پارٹی کے لیے ایک طرح کا حراست کا نظام بن کر ابھرے تھے۔ ابھی بھی ان کے ارد گرد مسند اور پنجاب کے بہت حد سے دور کر کے کھانے پینے کی چیزیں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف زرداری ان مٹھالیوں کے ذہن

میں سے مشائی اٹھا کر ایک ایک دور کو ٹوٹا دکھلا رہے تھے۔ ان کی بات سن رہے تھے اور یوں تاثر دے رہے تھے جیسے وہ ہر ایک کے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دوران وہ ٹیلی فون پر بھی مسلسل لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

آصف زرداری کو اپنے دور کروں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ ٹیل کے آٹھ سالوں نے ان سے ہر چیز چھین لی ہو، لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ کسی کو نہیں پھیلے دی تھی۔ اس مسکراہٹ سے پارٹی کے لیڈروں اور وکروں کو ایک ہی پیغام ملتا تھا کہ ابھی آصف زرداری نے اٹھیا نہیں ڈالے ہیں۔

جب میں نے آصف زرداری سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں ان سے ان کی ابتدائی زندگی اور بعد کے سالوں کے ان پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہا تھا جو ابھی تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور بولے کہ سائیکس ایچ ساری باتیں دہرانے کا کیا فائدہ۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی لیکن وہ ہر سوال کا بڑا مختصر جواب دیکر بات کو نال جاتے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں ابھی کچھ Reservations باقی تھیں اور وہ اتنی آسانی سے ایک ایسے صحافی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان سے زندگی میں اسکی وصال رہا ہو۔

باتوں باتوں میں میں نے محسوس کیا کہ وہ چند صحافیوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف تیار ہونے والی سازش کا حصہ تھے اور ان کے خلاف جھوٹی کہانیاں چھاپتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک پاکستانی ایڈیٹر کا بھی نام لیا جس نے اپنے اردو اخبار میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ آصف زرداری کے ایجنڈے کو خراب کرنے والی مہم میں شریک تھا۔

آصف زرداری کے بقول جیل میں رہنے کا انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں بہت زیادہ مہر آ گیا تھا جن میں 1996ء سے پہلے نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت ہل گئی ہے۔ جیل میں اس مہر مگر اڑانے کے بعد ان کی شخصیت پر کچھ مہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی بات کو فیسے میں آئے بغیر

اس کی تشریح کر سکتے ہیں اور کسی سے طسہ یا بغض بھی نہیں رکھتے ہیں۔

آصف زرداری بولے کہ تمہیں پتا ہے کہ جیل کی زندگی قیدی کا روزانہ امتحان لیتی ہے۔ آپ کو روزانہ ان طاقتور لوگوں سے لڑ کر زندہ رہنا پڑتا ہے جنہوں نے آپ کو جیل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم، خدا نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت بھردی تھی جس کی وجہ سے وہ جیل کی زندگی کو بڑے مہر اور بہادری کے ساتھ جیل رہے تھے۔ انہوں نے جیل میں آنے سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے اندر اتنی بہادری آجائے گی۔

میرے لیے خیرانی کی بات یہ تھی کہ آصف زرداری کے دل میں ان لوگوں کے خلاف کوئی فکارت یا بغض نہیں تھا جنہوں نے ان پر مقدمات بنا کر انہیں جیل میں ڈالا تھا۔ سب میں نے ان سے سب الرٹن کے بارے میں بات کرنا چاہی جن کی وجہ سے آج وہ جیل میں بیٹھے تھے تو آصف زرداری صرف اتنا بولے کہ چھوڑو یا رسیف الرحمن محض ایک ایسے ایجنڈے کا اہلکار تھا۔ اس طرح کے پولیس ایجنڈے اور روزانہ پورے پاکستان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کون ان کے بارے میں بیٹھ کر سوچتا رہے۔

میں نے بہت نہیں باری اور دوسرا سوال دہرایا کہ کیا اس ایجنڈے اور سیف الرحمن نے ان کے خلاف جھوٹے کیسز بنانے پر ان سے معافی مانگی تھی تو آصف زرداری بولے کہ نہ صرف اس ایجنڈے اور نے بلکہ اس کے ماسٹر نواز شریف نے بھی جہول ان کے یہ گناہ کرنے پر معافی مانگی تھی۔ چوہدری نوید نواز شریف کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس کراچی جیل آئے تھے اور ان سے معافی مانگی تھی۔ نواز شریف نے چوہدری نوید کو کہا تھا کہ وہ آصف زرداری سے جا کر درخواست کریں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا پھر انہوں نے نواز شریف کی اس درخواست پر کیا کہا تھا۔ آصف زرداری نے رداقتی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور بولے کہ میں نے اسی لمحے یہ سوچتے بغیر کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا انہیں معاف کر دیا۔

میں نے آصف زرداری کے مختصر جوابات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ان سے بات چیت میں لگا رہا تا کہ ان کے ماضی کی کہانی اپنے قارئین کے سامنے لاسکوں۔







میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ کسی نے اس کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ سب  
پارٹی کی ٹیم نے کیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔ 2007ء میں اس کے لیے  
یہ سب کیا گیا ہے۔ 2003ء میں اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو  
پارٹی کی ٹیم نے کیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔ 2007ء میں  
اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔

اس وقت تک میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔  
2007ء میں اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔  
اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔

وہ مجھے بتانے لگے کہ ان کے بیٹے میں بہت سارے راز و مخفی ہیں۔ 1990ء سے لے کر اب  
تک تقریباً ہر دور میں ہر ممبران نے انہیں بہت ساری پیشکشیں کیں لیکن وہ ہرگز ان کی تھیوریٹکس نہیں  
تائیں گے۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ملک میں بہتر سیاستدان کون  
ہیں تو وہ بولے کہ بینظیر بھٹو کے بعد نوواہزادہ نصر اللہ خان اور مولانا فضل الرحمن حقیقی طور پر سیاستدان  
ہیں۔

پہلے آصف زرداری کے ذہن میں کیا آیا کہ وہ مجھے کہنے لگے کہ عمومی طور پر جو سال میں نے  
جیل میں گزارے ہیں ان کے بارے میں کچھ کلام نہیں پائی جاتی ہے۔ وہ اب تک دس سال جیل کی  
سزاؤں کے پیچھے گزار چکے ہیں۔ پہلی دفعہ نواز شریف کے دور میں 93-1990ء میں وہ جیل میں رہے۔  
پھر فاروق احمدی نے 1996ء میں انہیں جیل میں ڈالا تھا اور اب یہ 2003ء ہے۔

انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں ایک بات 1990ء کو وہ 2004ء میں جیل سے رہا ہو جائیں گے اور  
اگلے سال ہی اس ملک میں سے الٹیشن ہوں گے اور ان کی پارٹی اقتدار میں آجائے گی۔

آصف زرداری کی یہ بات تو سچی ثابت ہوئی کہ 2004ء میں انہیں رہا کر دیا گیا جس کے بعد

اس وقت تک میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔  
2007ء میں اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔  
اس کے لیے یہ سب کیا گیا ہے۔ یہ سب تو ایک ایک لمحہ کے لیے ہے۔

جب آصف زرداری نے اپنی رہائی اور اپنی پارٹی کے اقتدار میں آنے کی ٹیمیں کوئی تھی تو  
میں نے ان سے سیدھا سوال پوچھا کہ کیا ان کی کرپشن کے بارے میں جواب تک کہہ سکتا ہوں  
ہیں وہ کلام نہیں۔ زرداری صاحب نے میرے سوال کا براہ راست جواب دیا کہ یہ سب تو بات ہے کہ  
کوئی بھی حکومت اپنے سیاسی مخالفین کی طاقت کو برداشت نہیں کرتی اور انہیں جھکا نے کے لیے اس طاقت  
کے ترے استعمال کرتی رہتی ہے۔ ان کی پارٹی کے بہت سارے لیڈروں اور لوگوں نے فوجی  
عمرانوں کے دور میں ان سے بھارت کی بہت بڑی قیمت چکانی تھی۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ پاکستانی



سوائی ایک ایسے مرحلے سے گزر رہے جس میں لوگ اب ڈیکٹیشن سے سوئین رول کی طرف سڑک رہے ہیں۔ اس طرح کی یہ سیاسی تبدیلی پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں ہو رہی بلکہ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس طرح کی لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو چھانسیاں دی گئیں جنہوں نے اپنے دور کے ڈیکٹیز اور طاقتور لوگوں کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ بہت سارے ممالک میں تو ایسے لوگوں کو آگ میں جلا یا بھی گیا۔ سو اگر آج ان کے ساتھ یہ سب سونگ رول دکھا جا رہا ہے تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ان کے بقول آزادی حاصل کرنے کے لیے بیٹھ کر باتیں دینی پڑتی ہیں اور وہ بھی اپنے حصے کی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے ذریعے وہ لوگوں کو ڈیکٹیشن سے آزادی دلوانا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری خود اس آگے بڑھے اور مجھے ایک کراؤ لے کر ڈیکٹیز سیاستدانوں کی توہین کرنے دے رہے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے لیے انہی سیاستدانوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ انہیں کھلی نظر ہے کہ وہ اپنے مقصد میں پہلی لیڈروں پر کڑی نظر رکھنے کے چاہتے ہیں۔ انہیں بدنام کرنے کے لئے وہ اپنے ہاتھ میں سے ہاتھ دے رہے ہیں۔ انہیں انہی سیاستدانوں کے کھاتے میں ہاتھ لگا کر انہیں اپنے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ پارٹی بائیس چھوڑی۔ آپ ہر ایک کیس کی دیکھیں کہ ہر سال ہزاروں لوگوں نے ایک بار اپنا نام لگانے کے لیے ہزاروں روپے کی رقم دی تھی۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے انہی کو اپنی توہین کی تھی۔

میں نے ہر بات کا سرا سزا اور ان سے پوچھا کہ زرداری صاحب! آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ ایک ایسی طاقتور شخصیت ہیں جو اس ملک کی اہم ترین اہم رہی ہیں تو وہ بولے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم تجربہ تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ دنیا بھر میں وزیر اعظم کے خاتمہ یا ان کی جہازوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شروع میں تو انہیں وزیر اعظم کا شوہر ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیاسی لیڈرز اور گورنرز اور ججی کہ وہ سب بھی انہیں وزیر اعظم کا خاتمہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وزیر اعظم کے شوہر ہونے کی وجہ سے بہت مشکل تھی تاہم انہوں نے بہت جلد ان تمام جی ڈی ٹیز کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔

میں نے زرداری صاحب سے نسبتاً زیادہ مشکل سوال پوچھا لیا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال

ہے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو کے لیے بے پناہ مسائل کھڑے کیے تھے اور دراصل اس خاتون نے ان کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ زرداری صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا۔ تو وہی وہی وہ چپ رہے اور پھر بولے کہ یہ سارا بھٹو فیملی کے مخالفین کا پردہ پیگنڈا ہے۔ ان کے بقول جنرل ضیاء کے سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمن کا یہ کارنامہ تھا جنہوں نے بھٹو خاندان کے خلاف انتہائی غلیظ مہم شروع کی تھی۔ جنرل مجیب کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے بھٹو فیملی کو بدنام کیا جائے اور پچھلے دس سالوں میں یہ کام بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ بھٹو لوگوں کی روحوں میں آج بھی باقی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ پھر آج فیصل صالح حیات جیسے پارٹی کے پرانے لیڈر یہ کہہ کر کیوں چھوڑ پارٹی چھوڑ رہے ہیں کہ بھٹو ازم اس دن دن ہو گیا تھا جس دن بینظیر بھٹو نے 1988ء میں اس وقت کی حکومت سے ڈیل کر کے اقتدار لے لیا تھا۔

آصف زرداری بولے کہ دراصل فیصل صالح حیات جیسے لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کو جو راہ نام کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے اس سے کہہ پانے جنرل مشرف کے ہاتھ پر بیعت اس لیے کی تھی کہ انہیں اقتدار چاہیے تھا اور وہ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب انہیں بھٹو ازم اور پارٹی لیڈر شپ میں ہر طرح کی تھکنیں نظر آئیں گی۔ یہ تو کوئی انتہائی بات تھی اور نہ ہی پہلی دفعہ کسی لیڈر نے بھٹو کی پارٹی سے غداری کر کے اس طرح کا جو راہ نام کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے زرداری صاحب نے مجھے ایک واقعہ بتایا کہ جب وہ صدر علی بھٹو کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی تو مولانا کوثر نیازی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے غداری کر کے جنرل ضیاء کو جانشین کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس وقت بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء کا ساتھ دے رہے تھے۔ کوثر نیازی اکثر کہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے لیڈر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے تھے اور وہ بھٹو کی جان بچائیں گے۔

”تو کیا کوثر نیازی نے بھٹو کی جان بچالی تھی“ آصف زرداری نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا تو وہ بولے کہ پیپلز پارٹی کے یہ اٹھارہ ایم این ایز جنہوں نے 2002ء کے الیکشن کے بعد اپنی پارٹی چھوڑ کر جنرل مشرف کو جانشین کیا، انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کو











سید الرحمن کے ساتھ ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو کو ٹیپ کر کے لندن کے ایک اخبار میں چھاپا گیا تو ملک  
قوم سے استغلی نے لیا گیا تھا۔ یہ ٹیپ وہ کہانی ہے کہ جب 2008ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسرِ اقتدار  
آئی تو یہی ملک قوم پیپلز پارٹی کے دور میں کی یہ اتارنی جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ اس وقت  
آصف زرداری صاحب کو ملک قوم کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ انہما کے ذریعے ہی پیپلز پارٹی اور اس کی  
سہولت لینے میں جی لائونگ کے اجراءات پر جانے کے مقدمات کو ختم کرانا تھا۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب  
الہ ہے کہ وہ ملک قوم جنوں نے پیپلز پارٹی اور آصف زرداری کو ایک کرپشن کیس میں سزا سنائی تھی  
جنوں نے ہی اتارنی جنرل کے اجراءات استعمال کرتے ہوئے سہولت لینے میں ان دونوں جہاں یہی  
کے خلاف مقدمات ایک جگہ کر کے کرنا ہے۔ وہ جتنی جگہں میں گل کے دشمن آج کے دوست ہی  
کے ہے۔

آصف زرداری بھی جی بول رہے تھے کہ آپ پاکستان کی اس عدلیہ سے خلاف اور  
مذکورہ کی طاقت کی کیا توقع رکھتے ہیں جب ملک کے اس قانون کی طاقت نہیں کر سکتی جس کے  
قوت پر حکومت کا نظام برقرار رہتا ہے۔ پاکستانی عدلیہ نے قانون کی عکس کی ہم پر دست  
راند کیے ہوا کیے ہیں۔ ان عدلیہ نے اس قانون کی طاقت کرنے کا سبب لیا تھا لیکن آصف زرداری  
کو جنوں نے ایک بار ہی دیکھ کر سب طاقت آپ کی بات کہتے ہیں۔ باقی باتیں دست بھرنی ہو کر  
ہوتی ہیں۔

میں نے آصف زرداری کی توجہ میں اس خبر پر ایک ٹی وی سوسٹی کی۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! یہ وہ جنرل شرف کی عدلیہ ہوتی اس سوچوں حکومت سے  
کوئی لڑ کر نے کے لیے چارے تو ہونے ہیں لیکن اس میں اس سے لڑ کر نے کے لیے چار  
ہیں اگر جنرل شرف اتار دیا جائے۔ جنرل شرف اتار دیا جائے گا مگر چلے جائیں۔ وہ انہیں ایک  
گھوڑا راستہ اپنے کو چار ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! آپ جنوں کی اس تضحیق کو دیکھ کر ایک طرفت کی چھٹاوں میں  
بیٹھا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ جنرل شرف کو سزا دے کر کے مگر جانے کے لیے ایک گھوڑا راستہ اپنے پر  
تیار ہیں لیکن ان کی پارٹی نے تو سمیٹ آف پاکستان میں ایک مل لیا کر لیا ہوا تھا جس کے تحت قانون

دوڑنے والے تمام جرنیلوں کو قانونی طور پر سزا دیں اسے کامیاب کیا گیا تھا لیکن وہ جہاں بیٹھے ان تمام  
جرنیلوں کو گھوڑا راستہ دینے کے لیے تیار ہیں جنہوں نے ملک کے قوانین توڑ کر اپنی حکومتیں بنائی تھیں۔  
زرداری صاحب بولے کہ اپنی پارٹی کے بھٹ میں مل سو کر نے کے بارے میں ابھی بھی  
جنرل شرف کو گھوڑا راستہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہ بگھتے ہیں کہ اگر جنرل شرف آرام سے اقتدار  
پر بیٹھا کے چلے کر کے مگر چلے جائیں تو ان پر مقدمات چلانے کے بجائے انہیں مگر جانے دیا  
ہا ہے۔ وہ پارٹی کے اس فیصلے کے حق میں نہیں ہیں کہ ان جرنیلوں پر زرداری کے مقدمات ہونے  
پا نہیں جنوں نے ماضی میں قانون توڑا تھا۔ وہ یہ بگھتے ہیں کہ ہر شخص کو سیاسی طور پر گھوڑا راستہ  
ہا ہے۔ وہ ابھی بھی سیاست دانوں کو سنے کو تیار ہیں اور انہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا حق ملنا  
ہا ہے۔ میں ذرا پاپا ہے اس دن سے جب لوگ اپنے سیاسی لیڈروں کی بات سنا بھی پھوڑا لڑنے کے  
اور اگر کوئی ایسا دن آیا تو یہ اس ملک کی بہت بڑی بد نصیبی ہوگی۔ اس گھوڑا راستہ کو ہا ہے کہ وہ سیاسی قانون  
پر تسلیم کرے اور انہیں اپنا سیاسی کردار ادا کرنے دے۔ لیکن یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ یہ طاقتور اور سراسر ابھی  
بھی اس بات کے لیے تیار نہیں؟

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! آپ کی اپنی ذہنی قوتی آئی لیکن آئی جنرل شرف سے کہ  
وہ جس وقت تری ہیں تاکہ آپ کے ساتھ کوئی کی لڑ کر نہ جائے۔ زرداری صاحب نے مجھے دیکھا  
ہونے کہ ہاں میں استغفار کر رہوں کہ جنرل شرف مٹھ سے ملے کب آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ لوگ بگھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے تمام اسٹیبلشمنٹ کی عمل میں ایک ہی جگہ  
پیپلز پارٹی کا لینا دینا کرنا ہے ایک اور جگہ اکیسوا دینا کرنا ہے۔

وہ لے لیں یہ غلط بات ہے۔ یہ پیپلز پارٹی میں جڑے عرصے سے ہوا تھا کہ جب کوئی بھی  
ہو گیا جاتا تو کسی دوسرے کو پارٹی کے معاملات چلانے ہوتے تھے۔ جب یہ اقتدار ملی ہو گیا  
تو ہم نے پارٹی چھوٹی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ پیپلز پارٹی ایک ایسا پارٹی ہے کہ اس طرف  
کو توڑ لیاں۔ جمہوریت کا حصہ ہیں۔ اس پر تنقید کرنے کے بجائے اس کی تعریف ہوتی ہا ہے۔

میں نے زرداری صاحب کو دہا ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش جاری رکھی اور کہا کہ ان  
کی اپنی پارٹی پر یہ الزام لگتا ہے کہ جب سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کو طاقتور اسٹیبلشمنٹ کے















لہذا کہا کہ ہمیں ایک ہی حال میں کر دیکھتے ہیں اور اس واقعہ فوجی سے اہل زرداری صاحب کرنا گوارا  
 کہ جینگیر بھٹو آصف زرداری سے ٹیبلڈا کراٹ کر لے والوں نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ گوارا  
 لا اور میں اپنی سیاسی فوج کا مظاہرہ کر کے دکھادیں تو شاید منزل شرف کو راضی کر کے اس ملک میں سے  
 انکسار کرا لے جاسکتے ہیں۔ آصف زرداری نے یہی کہانی جینگیر بھٹو کو بڑی اچھی طرح پہنچادی تھی۔  
 مرتے کیا نہ کرتے کی صورت میں جینگیر بھٹو آصف زرداری کے پیچھے بیٹھ کر اپنی پارٹی کی قیادت سونپنے  
 پر تیار ہو گئی تھی۔ یہی وہ تھی کہ آصف زرداری کے دفنی سے لاہور آنے سے پہلے ڈاکٹر شاہ مسعود نے  
 جب دونوں جہازوں کو ساتھ لٹا کر اسے آروائی کی دی کے لیے انٹرویو کیا تو اس میں انہوں نے ایک  
 نیا نیا صورت سوال پر چھٹا کہا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستانی فوج ان پر (جینگیر بھٹو) اعتماد کرنے کو تیار  
 نہیں ہے، جبکہ ان کے شوہر آصف زرداری پر وہ بھروسہ کرنے کو تیار ہے۔ جینگیر بھٹو نے طرز یہ منکرانہ  
 کے ساتھ جواب دیا تھا کہ پاکستانی فوجی آصف زرداری پر شاید اس لیے اعتماد کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ  
 ایک مٹری کانٹا بنا رہا سندھ کے پڑھے ہوئے ہیں جبکہ وہ (جینگیر بھٹو) ایک سو بیٹین ہیں۔ پاکستانی فوجی  
 ابھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ڈیل کرنے اور اعتبار کرنے پر تیار ہیں جو فوجی نہ سکی لیکن ان کے فوجی  
 سکول میں پڑھا ہوا تھا۔

جینگیر بھٹو کا یہ جواب فکروں کے لیے بطور اشارہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ یہ سارا میلہ آصف  
 زرداری پاکستانی فوج کے ان برائیوں سے ملاقاتوں کے بعد چھاپا ہے تھے جو محمد امین نعیم کے ساتھ  
 رات کے اندر صبح سے ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

جب میں دفنی ایئر پورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ میں دیگر لیڈروں کی طرح  
 جینگیر بھٹو سے بھی مل کر ان کی اسی طرح کی ایک سیاسی پروفاٹل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ان کے  
 ترجمان فرحت اللہ بابر سے مدد چاہی جو اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جینگیر  
 بھٹو سے بات کر کے وقت ملے کر لیں گے۔ جب میں نے دو تین دفعہ فرحت اللہ بابر کو یاد دہانی کرائی تو  
 مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے ٹھنڈا نہیں رکھ رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ادھر ادھر سے سن گئی تو پتہ چلا کہ  
 آصف زرداری نے جینگیر بھٹو پر یہ پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی پاکستانی صحافی سے نہیں ملے اور نہ  
 ہی کوئی اعتراف دے گی تاکہ میڈیا کی تمام تر توجہ ان پر اور ان کے مقصد پر فوکس رہے۔ یہی وجہ تھی کہ

انہوں نے آنے سے چند گھنٹے پہلے جب آصف زرداری نے اس ہوائی میں آ کر پریس کانفرنس کی جہاں  
 پاکستانی صحافی غم سے ہونے لگے تو جینگیر ان کے ساتھ نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ صرف جہازوں زرداری  
 تھے۔ جب ہم سب لوگ دفنی ایئر پورٹ پر پہنچے تو جینگیر پارٹی کے کچھ جہازوں نے ایئر پورٹ پر زرداری  
 صاحب کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔ وہ وقت بعد دفنی پریس کے ایک سپاہی نے آ کر صرف  
 انکا کہا کہ اگر اس کے بعد کسی نے نعرہ مارا تو ان سب کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی کو نہ سے  
 کوئی آواز نہیں آئی۔

جہاز کی روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ چہرے گھونٹیاں  
 بدھ گئی تھیں۔ ادھر پاکستان سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں پاکستان جینگیر پارٹی کے ورکرز چاروں  
 سواریوں سے اٹھنے ہو کر لاہور ایئر پورٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ  
 چوہدری پرویز الہی پنجاب کی روایتی خالمانہ پولیس فورس کے ساتھ جینگیر پارٹی کے ورکروں کی ہڈیاں  
 توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آصف زرداری نے ایک عجیب سی بات کی۔  
 انہوں نے اپنے پارٹی ورکروں سے کہا کہ وہ ایئر پورٹ کی طرف نہ آئیں۔ جو جہاں ہے وہ وہیں رک  
 کر بیٹھ کر دھرنا دے دے۔ جہاز کی روانگی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی لاہور ایئر  
 پورٹ پر اترا تھا۔ ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی لاہور ایئر پورٹ پر اترنے کی کیا وجہ  
 تھی کیونکہ اس وقت تو پارٹی ورکرز کے لیے انہیں ایئر پورٹ آ کر ریسیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی  
 کنفیوژن میں ہم صحافی جہاز پر سوار ہوئے اور ہم نے اپنے بورڈنگ کارڈز پر لکھے ہوئے نمبروں کے  
 مطابق سٹیشن ڈسٹریکٹ کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ کیونکہ یہ چارٹرڈ جہاز تھا۔  
 زرداری صاحب تمام راستہ نہیں سوئے۔ وہ ہر ایک صحافی کے ساتھ اپنے روایتی انداز میں گپ شپ  
 کرتے رہے۔ جب جہاز صبح سویرے لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو یکدم ماحول میں گرمی آ گئی۔ ڈاکٹر  
 شاہ مسعود سب سے زیادہ پھرتیاں دکھا رہے تھے۔ وہ کبھی بھاگ کر پائلٹ کے کیمین میں جاتے تو کبھی  
 آصف زرداری کے کان میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ جھنجھٹا ہٹ شروع ہو گئی کہ  
 شاید جہاز کو لاہور ایئر پورٹ پر نہ اتارنے دیا جائے۔ آخر یہ کنگ نیوز ڈاکٹر شاہ مسعود نے ہی سرگوشی کی  
 شکل میں ایک دو صحافیوں کو دی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب جہاز ایئر



پارٹ برائے کراچی ہوا جو کچھ ایسے دیکھنے کو ملا اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود کی بات ٹھیک تھی کہ جہاز اترنے سے پہلے ہی زرداری صاحب کا فونی جرنیلوں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ہوا جس کی نوبت یہاں تک نہیں آئی کہ وہ کراچی کے صدر میں قیام کی غرض سے جہاز کے اندر آئی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ بیڑ پورٹ پر پاروں طرف پھیلے ہوئے پنجاب پولیس کے کمانڈرز کیا کرنے والے تھے۔ بیڑ پورٹ کے چند بیڑوں نے آصف زرداری کا سوال بلند کرنے کے لیے غرے بازی شروع کر دی۔ ماسٹی اور تک جہاز کے دروازے بند رہے۔ یہ غرے گویے کہ آصف زرداری کا کمانڈر وہ تھا جس کے ساتھ ہی یہ غرے بند ہو گئے۔ ایک تو جوں ایسی بی بی نہیں اپنے کمانڈر کے ساتھ تھا آصف زرداری صاحب نے اسے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلا دیا اور کہا کہ تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ اس کو دیکھ لے جاؤ۔ ایسی بی بی نے آتے ہی آصف زرداری کے گھٹنوں پر ہاتھ لگایا۔ اسے ذہن میں تھا کہ شاید آصف زرداری اور ان کے بیٹے اس گرفتاری کی حالت کریں گے اور بیڑ پورٹ سے باہر نکل کر اپنی پارٹی کے جہاز کی قیادت کریں گے۔ ایک ہی لمحے میں ساری پارٹی پلٹ گئی تھی۔ آصف زرداری اپنے راتوں کے ایجنٹوں میں قیام کا ہاتھ بچا کر ہاتھ لگا کر ایسی بی بی کے ہاتھ میں ڈال کر تیزی سے سوئی جہاز سے اترے اور بیڑیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی اور بیڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے سیدھے لاہور میں واقع اپنے زرداری ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم سمجھتی تھیں کہ ایک ایسے کی جگہ رہے ہر ایک کچھ نہیں آری تھی کہ اب کیا ہو گا۔ ہم تو یہ سمجھ کر رہی تھے کہ جہاز میں پاکستانی جہاز کے ایک ایسے واقعے اور تبدیلی کے معنی شاہد بیٹے والے تھے کہ آصف زرداری کے لاہور ایئرپورٹ پر اترتے ہی ملک میں سے احتجاجات کا طعنہ ہو جائے گا اور جہازوں کے ان کی پارٹی اتر کر میں آ جائے گی۔

ایسی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ملک میں کھاب آئے پانچ آئے تھوڑی دیر بعد ہم سمجھنے والے کے ہوا کہ یہ جہازوں کی پارٹی ہوا اور ایسی کے کمانڈر کی شکل میں ایک قیامت سرور آئے والی تھی۔ جو نئی ہم سمجھتی تھی جہاز سے باہر نکلے جو جہازوں کی پارٹی کے ہم پر ایسی ایک لائن میں کھڑا کر کے ان کمانڈرز نے ہماری اچھائی بد نظمی کے ساتھ ہماری لینا شروع کر دی۔ سب سمجھنے لگے کہ کیا کیا کہ اپنے سوہاگل اور کبیر سے پولیس کے اہلکار کے چپ چاپ بیٹھا کر رہنا ہو گیا۔ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے وہ

کمان کی کھیر نہیں نہ ہو۔ یہ سارے سماجی جن میں انتہائی بیک وقت اس احترام دوست بھی شامل تھے جو ہمیں سمجھے جاتے اور جہاز کے سڑکیوں سے پہلے ہی چڑھنے سے ہونے لگا ہے تھے۔ اوپر سے آصف زرداری صاحب ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنا کھیل کھیل کر نکل گئے تھے۔ وہ سماجی جو اس امید پر پھیلے رہے ہیں گھٹوں میں پاکستان سے دشمن اور دشمنی سے اب لاہور کا سفر کر کے اس امید پر آئے تھے کہ شاید وہ جہاز کو اپنی آنکھوں کے سامنے بیٹھے دیکھیں گے وہ اب پروردگار کی پولیس کے ہاتھوں ڈھکیل ہوئے والے تھے۔ میں لاہور کے سمجھنے والوں کو یہ اندازہ تھا کہ انہوں نے جنہوں نے پنجاب پولیس کے ان کمانڈرز کو اپنے لب لباب، سوہاگل فونز اور کبیروں کو ہاتھ نہیں لگانے والے ان سب نے وہیں ہر جہاز پر پھیر کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو یہ جہازیں پھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سوئی بھی بھڑکے ہوئے تھے تو کمانڈرز کو بھی چوہدری پرویز الہی نے بدلیات سے روکی تھی کہ ان تمام جہازوں کی قیادت کرنی ہے جو جہازت کر کے آصف زرداری کے ساتھ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آ رہے تھے۔ کافی دیر تک سمجھنے والوں اور پولیس والوں میں سخت جھگڑا ہوا اور جہازیں آخراً پولیس والوں نے سمجھنے کو کھنکھار کا نشانہ بنا کر شروع کیا۔ پولیس کمانڈرز کے کھنکھار سے زیادہ جہازوں سے اترتے ہوئے مقررہ شکل ہوئے جنہیں بڑے بڑے طریقے سے ان کمانڈرز نے مارا۔ کچھ اور سمجھنے کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بڑا مہرب سا مظر تھا۔ سماجی کھو رہے تھے کہ آصف زرداری ایسی جہازیں بھی کر پنجاب پولیس کے کمانڈرز کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نکل اپنی جان بچا کر نکل گئے تھے۔ ایسی جہازیں تھیں کہ وہ پہلے ان سمجھنے والوں کو ہتھیارت اور پورٹ سے نکلوانے اور اس کے بعد ہی وہ ایسی بی بی کے ہاتھ بچ کر جہاز سے باہر نکلتے تھے وہ تو بہت جلدی میں تھے۔ یوں پنجاب پولیس کے کمانڈرز نے سمجھنے والوں پر کھنکھار کرنے کے بعد ان کے سوہاگل فونز اور کبیرے قبضے میں لے لیے۔ اس وقت کے ایسی ایسی لہاں آ رہے جہازوں کی زیر قیادت پنجاب پولیس کے کمانڈرز ایک طرف سمجھنے والوں کو مار رہے تھے اور دوسری طرف جرمہ صاحب پانی کی بوتلیں سمجھنے والوں میں پالت رہے تھے۔

تیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی چالاکی سے آصف زرداری کے گھارے سے ہوا نکال دی تھی۔ ان کے آٹھ سالہ جہاد اور کبیر پڑھنے لگے تھیں۔ ان کے ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ ڈی کی ایم آئی ہزل نہ ایم تاج کے ساتھ ہونے والی ذیل ناکام ہو گی یا کر دی گئی تھی دوسرے سے اس کا جو جہاز



نہیں تھا۔ آصف زرہ دہری کو یہی ہی جزل مشرف نے جیل سے باہر نکالنا تھا کیونکہ اب تو ہر اعتبار کا علم نکلا اور صحافی انہیں مردوخ کا درجہ دیکر انہیں نیلسن منڈیلا بنانے پر قتل کیا تھا۔ وہ جزل مشرف کے لیے قیدی کی صورت میں ایک پرائیم بننے جا رہے تھے۔ یوں انہیں نئے انتخابات اور اقتدار کی راہ چلی تھی کہ پہلے وہی اور پھر وہی سے لاہور بلا کر جوہری پرویز الہی کے ہاتھوں ذلیل کر کے ایک سپوز کر دیا گیا۔ بینظیر بھٹو کو شاید ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ آصف زرہ دہری خود ان فوجی برنیوں کے ہاتھوں کچھ سبق سیکھیں۔

پندرہ دنوں بعد جب ہنگامہ تھا تو وہی آصف زرہ دہری جوہری پرویز الہی کی حکومت کا تختہ الٹ کر لاہور پر قبضہ کر کے ملک میں نئے انتخابات اور اپنی پارٹی کو اقتدار دلانے کے لیے وہی سے آئے تھے وہ انہیں وہی کچھ اس انداز سے گئے کہ میڈیا کو بھی کئی دنوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ وہی سے جا کر نیویارک کے ایک ہسپتال میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر داخل ہو گئے۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ اب نیویارک میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو کے امریکیوں سے مذاکرات کرانے کے لیے لاہنگ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی میڈیا اور عوام انہیں بھول گئے کہ ایک دن پتہ چلا کہ بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا ہے اور آصف زرہ دہری وہی سے چکالہ ایئر میں پہنچی کر ان کا جسد خاکی گرامی خدائش لے جانے کے لیے تین سال بعد اس ملک کا صدر بننے کے لیے واپس آ رہے تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

## آفتاب احمد خان شیر پاؤ

آفتاب احمد شیر پاؤ کا سیاستدان بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ان کے بھائی دیات خان شیر پاؤ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لمحے انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ فوج میں رہیں یا خاندان کی سیاسی گدی سنبھالیں۔ انہوں نے آرمی چھوڑی اور سیاستدان بننے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں تو تقریریں بھی کرنی ہیں لیکن انہیں صحیح اردو بولی نہیں آتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ سیاست اور اردو سیکھتے اتنی دیر میں جزل ضیاء ذوالفقار علی بھٹو کو چھانسی دے چکے تھے۔ آفتاب احمد شیر پاؤ بھٹو صاحب کی بیٹی کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ لیا اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں جلسوں سے خطاب کرانے لے گئے۔ سرحد کے گورنر جزل فضل حق تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے شیر پاؤ کو جزل ضیاء کے ساتھ ملانے کے لیے بڑی تنگ دودھی۔ شیر پاؤ نے اپنے مرحوم بھائی کی پارٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بینظیر بھٹو صاحب نے بھی شیر پاؤ کی پارٹی کی خدمات کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ جزل ضیاء کی عمارے کے کریش میں موت واقع ہو چکی تھی اور بیٹلز پارٹی کی جلی دفعہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں بھٹو صاحب کی فلسفاتی شخصیت کے بغیر انتخابات لڑنے جا رہی تھی۔ سرحد میں شیر پاؤ صاحب نے کوشش کی کہ صوبے کی دیگر مضبوط سیاسی پارٹیاں اسے این پی اور جے پی آئی کے ساتھ مل کر ایک سیاسی اتحاد بنا کر



ایکشن ٹراہا ہے۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح ان کے اپنے ٹیبلٹ پارٹی خلاف ووٹرز انہیں ووٹ نہیں ڈالیں گے۔ یہ ٹیبلٹ بات ہے کہ جب انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو یہ چہا کہ پیپلز پارٹی اسمبلی میں اتنی نشستیں لے چکی ہے کہ وہ شیر پاؤ کو سونے کا دریا بن سکتی ہے۔ میں نے شیر پاؤ سے وہی روایتی سوال پوچھا کہ کیا پارٹی کو 1988ء میں اسمبلی نشست کے ساتھ ڈیل کر کے اقتدار میں آنا چاہیے تھا۔ شیر پاؤ صاحب بولے کہ ہاں! پارٹی کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا۔ یہ ٹیبلٹ بات تھی کہ بینظیر بھٹو نے اپنی حکومت کو کیسے چھوڑا۔ شیر پاؤ صاحب کا خیال تھا کہ وسائل کی بار بار سال بعد پیپلز پارٹی کو کھلی نہ رہے اور نہ ہی پارٹی کے لوگوں نے بہت قربانیاں دی ہوئی تھیں۔ اگر یہ موقع بھی ضائع کر دیا جاتا تو پارٹی کو کبھی بہت ہی مشکل ہوتی۔ یہ ایک ٹیبلٹ کہانی ہے کہ کیسے پارٹی کے لیڈر اپنے پارٹی لوگوں کی امیدوں پر ہمت اترنے میں ناکام رہے اور بینظیر بھٹو کی حکومت تو زوالی گئی۔ تاہم لوگوں نے بینظیر بھٹو کے خلاف لگائے گئے الزامات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

جب 1990ء میں بینظیر بھٹو کو ہٹانے کے لیے تحریک عدم सहकारی پیش کی گئی تو پنجاب میں موجود نواز شریف کپ سے ایک پیغام بھیجا گیا تھا کہ یہ تحریک عدم सहکار کا میاں نہیں ہوگی کیونکہ نواز شریف غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو بینظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس جہد کے لیے امیدوار تھے۔

بینظیر بھٹو اور شیر پاؤ 1990ء میں پیپلز پارٹی کی ختم ہونے والی حکومت میں نواز شریف کے کردار کو نہیں بھولے تھے۔ یہی وجہ تھی جب 1993ء میں نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے تو شیر پاؤ نے غلام اسحاق خان اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک خفیہ ڈیل کرائی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو پتہ چل گیا تھا کہ نواز شریف غلام اسحاق خان کے اس آئینی اختیار کو ختم کرنا چاہتے تھے جس کے تحت وہ ان کی حکومت اور پارلیمنٹ کو ڈس مس کر سکتے تھے۔ نواز شریف کو غلام اسحاق خان کے ہاتھ کاٹنے کے لیے پیپلز پارٹی کی سپورٹ کی ضرورت تھی کیونکہ ان کے پاس ہاؤس میں اتنے ووٹ نہیں تھے کہ وہ اکیلے یہ ترمیم لاسکتے۔ نواز شریف اپنی بھرپور کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ایک آزاد اور خود مختار وزیر اعظم کے طور پر پارلیمنٹ، عوام اور میڈیا کے سامنے پیش کریں۔ تاہم، نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ایک

جس وقت کے ٹیبلٹ آئی۔ مخالف جنرل آصف نواز خان نے مدعا ثابت کیا کہ ایک ہاؤس کو روکا گیا تو کہ نواز شریف کون ہوگا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان نے نواز شریف نے ایک ہاؤس سے ملنا نہ کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پیپلز پارٹی کی قیادت نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان پارٹی اس جنگ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہی کا لڑا تو ان کی ٹیبلٹ ہاؤس کے ساتھ ہی ساتوں رات سارا نقشہ بول گیا۔ جنت گزرنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں اختلافات بڑھتے گئے۔ نواز شریف کی اسلام آباد حکومت کو اس جنت سے ڈرا ہونے کا جب صلہ نہ ہوا اور سب سے پہلے نواز شریف کی کاہلی سے اسٹاپ ہو گیا۔

سیاسی مہل جنگ لڑی چکا تھا اور اس مہل کے سارے پتے اب بینظیر بھٹو کے ہاتھ میں آچکے تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق خان دونوں نے بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا۔ وہ اب اس پوزیشن میں آ گئی تھیں کہ جس کے سر پر چاہیں اقتدار کا تاج رکھ سکیں۔ یہ پیپلز پارٹی کی قیادت کا بہت بڑا امتحان تھا کہ کیسے وہ اس تمام نئے سیاسی ماحول سے بڑی گھمبیری کے ساتھ نواز شریف کی طرف سے کیسے گئے اس سوتے سے فائدہ اٹھائے۔ پیپلز پارٹی نے پاور پلٹیکس کی اور آلے والے دنوں میں وہ سارے فائدے حاصل کیے جو ان موقعوں پر سیاستدان اپنی مختلف چالیں چل کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نواز شریف کیمپ میں فرسٹیشن بہت زیادہ تھی کیونکہ بینظیر بھٹو کی سپورٹ کے بغیر غلام اسحاق خان نواز شریف حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جب بینظیر بھٹو کو نواز شریف نے قومی اسمبلی کی قائد کیمپلی برائے وزارت خارجہ کا دفتر میں بننے کی پیشکش کی تو پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے محترمہ کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ یہ آفر قبول کر لیں۔ تاہم، سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے کچھ اراکان بینظیر کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بے کار کوشش تھی۔ نواز شریف کیمپ بینظیر بھٹو کے اس دوستانہ سائل پر بہت خوش ہوا۔ وہ سمجھے کہ بات بن گئی تھی۔ نواز شریف نے بینظیر بھٹو کو پیغام بھیجا یا کہ وہ انہیں اپنی حکومت میں ڈپٹی پرائمر فسر بنانے پر تیار تھے اگر وہ غلام اسحاق خان کا ساتھ نہ دیں۔ وہ پاکستان میں ایک اور سیاسی حکومت کو ڈس مس کرنے کے لیے ہر قول رہے تھے۔ نواز شریف بینظیر بھٹو کے ساتھ پارلیمنٹ میں ایک طاقتور سیاسی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ پیپلز پارٹی کے کسی بھی لیڈر کو غلام اسحاق خان کے جانے



کے بعد ملک کا صدر بنانے کے لیے حمایت کریں گے۔

بینظیر بھٹو ایک بہت بڑے جلسے کا خطاب کریں۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ نواز شریف سے بدل لینے کا یہ اچھا موقع تھا جنہوں نے 1988-90 میں ان کی پہلی حکومت کو انہی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر اس میں کرایا تھا اور خود وزیر اعظم بن گئے تھے۔ آج وہی غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرا کالگ کائے پرتے ہوئے تھے۔

دوسرے، بینظیر بھٹو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ یہ غلام اسحاق خان سے بدل لینے کا یہ اچھا موقع تھا جنہوں نے کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کی تھی، ان کے خاندان آصف علی زرداری کو اڑھائی سال جیل میں رکھا اور ان کے خلاف مقدمات بنائے۔ آج موقع تھا کہ وہ نواز شریف کے ہاتھوں غلام اسحاق خان کو سیاسی طور پر ذلیل کرانے سے بدل لے لیں۔

پارٹی کے اندر سے بھی بینظیر بھٹو پر یہ دباؤ تھا کہ وہ ایک ڈیموکریٹ ہونے کے ناطے نواز شریف کا ساتھ دیں کیونکہ وہ پاکستانی عوام، میڈیا اور ورکرز کے سامنے غلام اسحاق خان کی سپورٹ کا جواز پیش نہیں کر سکیں گے۔ ساری عمر کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت پر یہی دھبہ لگا رہے گا کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے منتخب شدہ ایک وزیر اعظم کے بجائے اسٹبلشمنٹ کے نمائندے جس نے ان پر کرپشن کا الزام لگا کر ان کی حکومت توڑی، ان کی حمایت کی تھی۔

آفتاب شیر پاز سے پوچھا گیا تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نواز شریف کے بجائے غلام اسحاق خان کی حمایت کریں کیونکہ ایک ایسے صدر سے انہیں زیادہ سیاسی فائدے ملنے کی توقع ہے جس کے پاس پارلیمنٹ اور حکومت کو توڑنے کے اختیارات ہیں۔

بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کے درمیان جو لوگ خیر مذاکرات کر رہے تھے انہیں بتایا گیا کہ وہ صدر کے کپ ٹک یہ پیغام پہنچائیں کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو ہر طرف کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں۔ غلام اسحاق خان کی طرف سے خیر مذاکرات کرنے والے لوگ ان بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی اور غلام اسحاق خان کپ کے درمیان یہ خیر مذاکراتیں شیر پاز کے اسلام آباد میں واقع گھر پر جاری رہیں۔

مخاطب کے علاوہ باقی تین صوبوں کے وزراء اعلیٰ غلام اسحاق خان کے وہاں رہے اور یہ بات

نواز شریف کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

جب بھی پارٹی کی میٹنگز ہوتیں تو بینظیر بھٹو اس بات کی مخالفت کرتیں کہ ان کی غلام اسحاق خان کے ساتھ ملاقات ہونی چاہیے۔ تاہم، فاروق لغاری اور شیر پاز کو یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ بینظیر بھٹو غلام اسحاق خان کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی پہلی حکومت کو کرپشن جارجیوں پر اس میں کیا تھا۔ آخر فاروق لغاری اور شیر پاز نے بینظیر بھٹو کو غلام اسحاق خان سے ملانے لے گئے اور ان دونوں کے درمیان ایک خیر معاہدہ طے پایا۔ جب بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مذاکرات کر رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے شیر پاز سے کہا کہ وہ بھی ان مذاکرات میں شامل ہو جائیں۔ بینظیر اور غلام اسحاق کے درمیان بہت بھیدہ بحث و مباحثہ جاری تھا۔ غلام اسحاق خان اس بات پر ہنستے تھے کہ صرف قومی اسمبلی توڑی جائے گی اور صوبائی اسمبلیاں اپنا کام کرتی رہیں گی۔

بینظیر بھٹو شیر پاز سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ جو لوگ پارٹی کی طرف سے مذاکرات کر رہے تھے ان کے غلام اسحاق خان کپ سے کس طرح کے مذاکرات ہوئے تھے۔ شیر پاز نے بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کو بتایا کہ مذاکرات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑی جائیں گی۔ اس پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وہ قومی اسمبلی کو برخاست کریں گے۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے ساتھ ملک کے نئے نگران وزیر اعظم کا نام بھی ڈسکس کیا۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ شیخ مزاری اس ملک کے نئے وزیر اعظم ہوں گے تو بینظیر بھٹو نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

غلام اسحاق خان نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں بھی ایک نیم پلان موجود تھا۔ وہ بینظیر بھٹو کی مدد سے پہلے نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور پھر اپنے وزیر صوبائی وزراء اعلیٰ کی مدد سے قومی اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرانے کی مرضی کی پارلیمنٹ وجود میں لانا چاہتے تھے۔ غلام اسحاق خان کا پلان تھا کہ پیپلز پارٹی کو چالیس سے پچاس سینیٹیں ملیں گی۔ ایک ایک پارلیمنٹ کو اپنی مرضی سے چلانا آسان ہو گا جس میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں ہوگی اور یوں غلام اسحاق خان اپنی مرضی سے اسلام آباد میں ایک کھپتی حکومت تشکیل دیکر اپنا صدر سے پورے ملک کی حکومت کریں گے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا تھا











دوسری طرف جنرل جہاگیر کرامت بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح سے  
بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک مرحلے پر تو جنرل جہاگیر  
کرامت نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی آڑی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر فاروق لغاری کے پاس جائیں گے  
تاکہ دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی لگائلیوں کو دور کیا جاسکے۔

بینظیر بھٹو نے جہاگیر کرامت کا حکم یہ ادا کیا لیکن انہوں نے ان کی پیشکش شائستگی سے یہ کہہ کر  
مسز دکری کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کے لیے آری چیف کو اس میں  
ملوث نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ کو بتایا کہ وہ چیف آف آری سٹاف کی اس معاملے میں مدد  
نہیں لیں گی۔

شیر پاؤ نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ پیدا ہونے والے اختلافات کو ایک ایک  
کر کے حل کریں لیکن بینظیر بھٹو ان سارے اختلافات کو ایک ہی میٹنگ میں بیٹھ کر ختم کرنا چاہتی تھیں۔

شیر پاؤ نے یاد کیا کہ معاملات بہت پہلے ہی بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بینظیر بھٹو اس بات پر  
بہت پریشان تھیں کہ کیا فاروق لغاری آصف زرداری سے وفاقی وزیر کا حلف لینے سے انکار تو نہیں  
کریں گے۔ جب شیر پاؤ نے یہی بات فاروق لغاری سے کی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ وہ  
بینظیر بھٹو کی طرف سے کبھی کبھی دو چیزوں پر کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ کسی شخص کا نام  
انہیں بھیجتی ہیں کہ ان سے وزیر کا حلف لیا جائے تو وہ ضرور حلف لیں گے۔ دوسرے وہ اگر انہیں یہ  
سفارش بھیجتی ہیں کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے تو وہ فوراً توڑ دیں گے۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان تعلقات اب پوائنٹ آف نوریٹن تک پہنچ چکے تھے۔  
حالات کسی ایک وجہ سے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے۔ ایک دن ایوان صدر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے  
بعد ججوں کی تقرری کے مسئلے پر صدر اور وزیر اعظم کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر کی  
طرف سے ٹولڈ طارق رحیم، احمد سعید اعلان اور شاہد حامد نے شرکت کی۔ بینظیر بھٹو کی طرف سے وزیر  
قانون رضار ہانی، اس وقت کے لاءیکر ٹری اور آفتاب شیر پاؤ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ  
اسی وقت ہی ختم ہو گئی جب دونوں اطراف کے لوگوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک  
دوسرے پر طنز کرنا شروع کر دیے۔

بینظیر بھٹو کو پتہ چل چکا تھا کہ معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ وہ پھر بھی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں  
سر شاہ گلزنی بات کہیں بن جائے۔ بینظیر بھٹو نے ایک رات شیر پاؤ کو پٹا اور فون کیا اور انہیں کہا کہ  
فوری طور پر اسلام آباد پہنچیں۔ وہ شیر پاؤ کے ساتھ فاروق لغاری سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ آفتاب شیر پاؤ  
ابھی اسلام آباد کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ بینظیر بھٹو نے ہارہ بیگے کے قریب 5 نومبر 1998ء کو  
فون کر کے شیر پاؤ کو بتایا کہ اب انہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فاروق لغاری ان کی  
حکومت توڑ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب وہ آرام سے کل اسلام آباد آ جائیں۔

فاروق لغاری نے بینظیر حکومت توڑتے ہی پرائم منسٹر ہاؤس آنے جانے والے راستے بند کر  
دیے۔ کسی کو بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آفتاب شیر پاؤ وہ واحد لیڈر تھے جنہیں بینظیر بھٹو  
سے ملنے کی اجازت دی گئی۔

اپنی حکومت کے توڑے جانے کے اگلے روز بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو فون کیا اور ان سے  
پوچھا کہ ان کی حکومت کیوں توڑی گئی تھی۔ فاروق لغاری نے آگے سے جواب دیا کہ ہاں، وہ ان کی  
حکومت کو ڈس مس کر چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے ان سے پوچھا کہ صوبائی اسمبلیوں کا کیا بنے گا۔ فاروق  
لغاری نے جواب دیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو بھی ڈس مس کریں گے۔

نئی فون پر ہونے والی اس گفتگو کے درمیان میں فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی پیشکش کی  
کہ وہ انہیں گمران سیٹ اپ میں شامل لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دکھا دیں گے۔

جب آفتاب شیر پاؤ ایک برطرف وزیر اعظم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے تو انہوں نے  
بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ رابطے میں رہیں کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ رضار ہانی کو ساتھ لے کر فاروق لغاری سے ملنے جائیں تاہم  
رضار ہانی مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے اور یوں شیر پاؤ کو فاروق لغاری سے ملنے کے لیے اکیلے جانا  
پڑا۔

لغاری نے شیر پاؤ کو بتایا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا اور پھر وہ انہیں ان لوگوں کے  
نام بتانے لگے جو گمران حکومت کو چلاائیں گے۔

ہاتوں ہاتوں میں فاروق لغاری نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ صوبے کے چیف منسٹر کے طور پر کام









سلطان محمود قاضی، ڈاکٹر علی بیگم کے سر پر

## سلطان محمود قاضی

ایک سیاسی ورکر جو آصف زرداری کے لیے رول ماڈل بنا

جب میں آصف علی زرداری صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں گریوں کی ایک تہی اور پھر میں گیا تھا تو میں نے ایک بات فوراً محسوس کی تھی کہ وہاں ان کے ارد گرد جیسے میں سوچو جو دوست اور پارٹی اور کرپٹس تھے ان میں سے اگر وہ کسی کو سب سے زیادہ عزت اور احترام دے رہے تھے وہ جیشل جینٹل کا انسان تھا۔ میں بلا حیران ہوا کہ آخر چھوٹے سے قدم والے اس انسان میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی کہ زرداری صاحب جیسا شخص بھی نہ صرف ان کی بات غور سے سن رہا تھا بلکہ اس طرح سر ہل رہا تھا جیسے ان کا کہا ہوا ہر لفظ حرف آخر ہو۔ میں زرداری صاحب سے بلائی وہ تک کپ کپ کرتا رہا لیکن ہر بار میری انگریز ٹیگ کی طرف اٹھ جاتی۔ مجھے یہ بہت برا لگا۔ ہاتھ کہ میں زرداری صاحب سے اعتراف چاہوں گا کہ ان سے یہ پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے۔

میں نے اپنے اعتراف کے دوران زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ انہوں نے ساری عمر ہجرتی زندگی گزارنی تھی، پھر ان کے اندر اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی کہ انہوں نے آٹھ سال جیل میں گزار دیئے۔ زرداری صاحب نے اپنی انگریز ٹیگ اور اپنے سامنے جیسے میں بیٹھے ہوئے اسی چھوٹے قدم والے شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا کہ ہو سکتا ہے یہ شخص تمہیں قدم میں بہت چھوٹا لگ رہا ہو لیکن

بیٹے سے بڑے قدم آوروں سے بڑا شخص ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں جیل کے کمرے میں وہاں جا کر نئے سرے سے گفتگیاں سمجھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ مجھے زرداری صاحب کی یہ بات سن کر یقین ٹھیک آ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا آدمی بھلا زرداری صاحب کے لیے کیسے ایک رول ماڈل ہو سکتا ہے۔

میں سمجھا کہ شاید زرداری صاحب نے حسب عادت مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے۔ تاہم زرداری صاحب کا اعتراف مضمون ہوا تو میں نے فوراً بیڈی بے ٹیگ سے اپنے ایک صحافی دوست سے پوچھا کہ یار یہ کون آدمی ہے؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا کہ آپ اس کو



میں ہائے۔ میں نے برا سانس لیا اور کہا کہ حضور اگر میں ہاں کہہ دوں آپ سے اس کا کیا نقصان پہنچے گا۔  
وہ فرمایا نہ کہہ دوں گا۔

پھر سے دوست نے کہا کہ اس کا نام سلطان محمود قاضی ہے۔ یہ شخص اپنی سال تک میں ہی مجھے  
میں اس وجہ سے گزار کر آیا ہے کہ اس پر اصرار تھا کہ اس نے جلال شہزادہ کو بھڑکایا اور اسے کھینچ کر  
کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ یہ وہاں لڑی جھڑپ پارٹی کے جہانوں میں سب سے قہ آور اور جیسا کہ کہا ہے  
جس سے کسی اور میں جلال شہزادہ جیسا اندر کی مرعوب رہتا تھا۔

مجھے ایک شہید جھلا لگا اور میں نے فیروز آبادی طور پر مزہ کر اس تین لٹ کے انسان کو دیکھا۔ مجھے  
بہین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے اندر گر پڑتے پھرتے دیکھا ایسے کہ دار بھی ہیں جن کا ہوسکتا ہے قہ تو بہت پہنچا  
ہو لیکن ان کے اندر جیسا انسان ہم جیسے لوگوں سے شاید قہ کا ٹھہ میں کئی گنا بڑا لگتا ہے۔

مجھے آصف زرداری صاحب کے دل میں قاضی سلطان کے لیے موجود عزت اور احترام کی بھر  
ایک لمحے میں آگئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا، احترام کے ساتھ جھکا اور اپنا ہاتھ قاضی صاحب کی  
طرف بڑھایا۔ وہ مجھے پہلے ہی زرداری صاحب کا اندر دیکھ کر تے دیکھ کر کچھ چپکے تھے کہ میں کون ہوں۔ وہ  
بڑے احترام سے ملے۔ میں نے ان سے ان کا نمبر لیا اور چپکے سے عدالت کے احاطے سے باہر نکل  
آیا۔

قاضی سلطان سے جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر 55 برس تھی۔ اب سات برس بعد  
جب یہ کتاب لکھی جا رہی ہے تو وہ 62 برس کے ہو چکے ہیں۔ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس سے بڑا  
طرح قسین کیا ہو سکتا ہے کہ پھر سے مجھے میں آصف زرداری جیسا بندہ اس بات کا اعتراف کرے کہ  
قاضی سلطان کو دیکھ کر ان کے اندر ریش کی نظریں پھیلنے کی بہت بیدار ہوئی تھی۔

قاضی 1949ء میں جب بیڑا ہوا تو پوری پہلی کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ سب لوگوں کے لیے  
اس کے وجود کے ساتھ گزارہ کرنا ایک مشکل کام لگا۔ لیکن اس کی ماں کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لگا  
کہ اس کے گھر ایک ایسا بیڑا بیڑا ہوا ہے جس کا قہ ہارل نہیں ہے۔ جب وہ قوموں بڑا ہوا تو اس کے اپنے  
رشتہ دار ہر گئی محے کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر قہتے لگتے۔ ایک دیکھاری  
ہاں سے کہ میں لگتا ہے جوئے حراموں پر بھرتی، ہتھیس مانتی، یہی وہ فقیروں سے تمہارے لہجے کہ شاید اس

کے بیٹے کا قہ بڑھ ہائے۔ قاضی نے بھی سوچا اور لگا کر وہ اپنے گھر لے کر کوئی بھی نہیں چاہتا تھا  
دھوکے لگنے پہلے اسے گا۔ ماں نے سکول بھیجا شروع کیا۔ اب اس نے تھلک اس کر لیا تو اس نے  
پہنڈ لیا کتاب ماں کو پڑھ کر کام نہیں کرنے اسے گا اور دو لڑکی کرے گا۔ سب سے پہلے وہ ایک اہل  
گیا۔ میڈیکل پریکٹس لٹ کے اسے دیکھتے ہی ایک خطرہ قہ لگا۔ اب قاضی صاحب نے لڑکی کی  
درخواست کی تو اس نے بڑی لٹ کے ساتھ اسے اپنا لگا لیا۔ اس پندرہ سالہ لڑکے پر ایچ این کا  
ایک شہید دور و پڑا۔ وہ وہاں سے لگا اور ایک اٹالین لاکڑ کے پاس چلا گیا جس کا اپنا ایک ہوٹل تھا۔  
جب وہ ہوٹل میں بیٹھا اس غیر ملکی ہوٹل کے مالک سے ملنے کا اظہار کر رہا تھا تو وہاں کا جو پاکستانی مالک  
تھا انہوں نے اس پر بیٹھے کنا شروع کر دیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سب کی ہاتھیں سنتا رہا۔ آخر جب  
اسے اس اٹالین کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس غیر ملکی نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور آنے کی وہ  
پہنچی۔ اس نے کوئی دوسری بات کیے بغیر قاضی صاحب کو بتایا کہ آج سے وہ اپنے گھر رہے گا اور ہم  
اس ہوٹل میں تو کڑی کرے گا۔

وہ خوش خوش گھر واپس لوٹا لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ اگلی زندگی نے اس کے ساتھ بکھڑا ہوا اور  
کرنے تھے۔ ابھی اس کی تو کڑی کی شوٹی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کچھ عرصے بعد وہ ہوٹل ہی ڈی اے کے  
کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے پاکستانی بھائیوں نے اس پر ایک سے سرے سے اچھائی گھانا نے مذاق  
کرنے شروع کر دیے۔ اس اٹالین نے بڑی لٹ سے سب کو منع کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ کوئی  
بیڑا اسلذا حق بھی نہیں کرنے گا۔ اس کے جاتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے ہی  
پاکستانوں کی ہاتھیں برداشت کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ہوٹل کینڈا کی ایک فرم لے لیا اور قاضی  
صاحب کو وہاں دوسری عزت اور مقام مل گیا جو اس ہوٹل کے اٹالین مالک کے اور میں ملتا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے جہاں کہہ دو اور انصاری بلوچ نام کا کوئی شخص ایک نئی سیاسی جماعت بنا  
رہا ہے۔ اخبار میں بھٹو صاحب کی پارٹی کا منشور پڑھتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب کی نظریں رک  
گئیں۔ اس میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب کی نئی جماعت اس معاشرے کے تمام طبقات کو بغیر کسی امتیاز کے  
استد سے کی۔ قاضی صاحب کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اب تک انہوں نے ہر جگہ اپنا قہ پھونڈنے کی  
جس سے امتیازی سلوک کا ہی سامنا کیا تھا۔ اب کوئی ایک ایسا شخص بیڑا گیا ہے جو یہ دھوکہ دے رہا ہے کہ وہ







صاحب کو بروں سے اس میں کر دیا۔ جب یہ خبر کسی طرح پہنچا تو انہوں نے  
خوش ہو کر اور مصطفیٰ کمر سے کہا کہ وہ طوری طور پر چوہدری نیاز سے بات کر کے قاضی صاحب کو لو کر لی  
بحال کر لی۔

چوہدری نیاز احمد تک پہنچا تو یہ بیٹھا پوچھا کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد  
پہنچا صاحب اسلام آباد آئے اور انہوں نے مصطفیٰ کمر اور خورشید میر کی موجودگی میں چوہدری نیاز احمد  
سے فون پر درخواست کی کہ وہ قاضی صاحب کی نوکری بحال کر دیں کیونکہ وہ انہیں بہت عزیز ہیں۔ جب  
چوہدری نیاز احمد نے پہنچا صاحب کی درخواست سنی تو وہ بولے کہ قاضی صاحب نے ان کے خلاف ایک  
افتہاری بیان جاری کیا ہے۔ اس پر پہنچا صاحب نے چوہدری نیاز احمد سے یہ کہا کہ وہ قاضی صاحب کے  
بیان کی وجہ سے انہیں کچھنے والی رحمت پر معذرت خواہ ہیں۔

تاہم پچھتائیں چوہدری نیاز کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ انہوں نے پہنچا صاحب کی  
درخواست اور معذرت کو مسترد کر دیا اور قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے سے انکار کر دیا۔

چوہدری نیاز احمد کا انکار سن کر پہنچا صاحب بڑے غصے سے بولے:

"لیک ہے ہر نیاز صاحب میں نے آپ سے کوئی اتنی بڑی چیز نہیں مانگ لی تھی کہ  
میرے سوری کرنے کے باوجود بھی آپ قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے پر تیار  
نہیں ہوئے۔ میں وہی انکار کر لیتا ہوں پھر آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

فون بند کر کے پہنچا صاحب قاضی صاحب کی طرف مڑے اور بولے کہ آپ صرف وہی بیٹھے  
انکار کریں سب کچھ لیک ہو جائے گا۔

قاضی صاحب نے مسکرا کر پہنچا صاحب سے کہا کہ سراسر میں اس ملک میں سے انکتاب کے لیے  
سب کچھ کھینچنے کو تیار ہوں۔

لیک ۱۱ بیٹھے بعد پہنچا صاحب اس ملک کے صدر بن گئے۔ صدر بننے ہی پہنچا صاحب نے ملی  
فون اٹھایا اور پہنچا صاحب کی ہاری کیا کہ قاضی صاحب کو نوکری دی جائے۔

پہنچا صاحب کے ان میں کیا آیا کہ وہ ماہ اندہ اپنا ک ایک دن پہنچا صاحب نے کسی  
سے کہا کہ چوہدری نیاز احمد ابھی کسی اس ہوئی کو چھار ہا ہے جہاں سے قاضی صاحب کو نکال دیا گیا

پہنچا صاحب نے فوراً راز رکھے کہ چوہدری نیاز کو ہوش کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔

قاضی صاحب کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ پہنچا صاحب جیسے لیڈر نے ان کی نوکری کی خاطر  
ہوش کے مالک سے سوری کیا، صدر بننے ہی پہنچا کام یہ کیا کہ انہیں نوکری دی اور جس شخص نے انہیں  
نوکری سے نکالا تھا اسے ہوش کی انتظامیہ سے نکال دیا۔ قاضی صاحب اب اس پہنچا پارٹی میں شامل ہو  
چکے تھے جو پہنچا صاحب کی پارٹی تھی۔ جب تک پہنچا صاحب اقتدار میں رہے قاضی محمود سبکدوش ہوں  
اور راز دہاندگی کے پارٹی صدر رہے۔ جب بھی پارٹی کی میٹنگ ہوتی پہنچا صاحب انہیں بے پناہ عزت  
دیتے جس سے ان کا اپنی پارٹی میں مقام بہت بلند ہو گیا۔ پہنچا صاحب اس وجہ سے بھی قاضی صاحب  
کے لیے احترام کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ پارٹی کا کوئی دوسرا لیڈر یا اور کراں کی کبھی تو جین نہ کرے اور نہ  
ان پر کوئی حملہ کرے۔

اسی اثناء میں وہ ہوش مستقل طور پر بند ہو گیا اور قاضی صاحب ایک مرتبہ پھر سڑک پر آ گئے۔ کسی  
نے یہ بات پہنچا صاحب کے کانوں تک پہنچائی کہ ان کا پسندیدہ پارٹی ورکر پھر وہ راز گار ہو گیا ہے۔ پہنچا  
صاحب نے فون اٹھایا اور انہیں PTDC ہونٹل کا ذمہ سنبھالنے کے لیے مقرر کرنے کے آرڈر کر دیے۔

سلطان محمود قاضی ایک صبح اٹھے تو یہ چلا کہ وہ لیڈر جس نے انہیں عزت اور نوکری دی تھی اس  
کی حکومت پر ایک فوجی جنرل نے قبضہ کر لیا ہے اور وہ اس وقت گرفتار ہیں۔ قاضی صاحب کے لیے  
وقت آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی وقاداری کا ثبوت دے جس نے اس کی نوکری کی خاطر ہوش  
کے مالک سے سوری تک کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور پارٹی کے ورکروں کو  
منظم کرنا شروع ہو گئے۔ گرفتاریوں سے بچانے کے لیے قاضی صاحب نے پہنچا پارٹی کے ورکروں کو  
اپنے گھروں میں چھپانا شروع کر دیا۔ پہنچا صاحب کی رہائی کے لیے انہوں نے مظاہرے کرانے کا  
انکام کیا۔ اپنے گھر کا روٹی پانی پھانے کے لیے وہ نوکری کے ساتھ ساتھ ان سیاسی ورکروں کو بھی انکا  
گھرانے میں لگے ہوئے تھے جو ان دنوں ملک میں مارشل لا لگنے کی وجہ سے کدم چھڑا ہو گئے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ پہنچا پارٹی کے راز دہاندگی کے صدر نے ہاتھ کھڑے کر  
اپنے جی اور وہ جنرل سپاہ کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارٹی ورکروں نے اسے  
نگھ پارٹی اور انہوں نے قاضی صاحب سے پتہ چلا کہ کیا وہ پارٹی کے راز دہاندگی کے جنرل کے جنرل







کی گری پر ایمان تھے جس نے انہیں نو ماہ کی قید یا شفقت ملادی۔ قید کے علاوہ انہیں تین ہزار روپے  
برآمدگی لگا گیا۔

بھرنے سزا سن کر مگر یہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے تین فٹ کے سیاہی ور کر کو دیکھا۔  
اس کے اندر کاروائی بجت ہزار توڑی اور کے لیے ہا ہر لگا اور بولا کہ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے کہ تم جیل  
کیسے کاؤ گے۔

قاضی صاحب نے آگے سے مسکرا کر جواب دیا کہ بھیر صاحب آپ پریشان نہ ہوں۔ میں  
انفارماری اور دیگر کی طرح جیل میں آسوں نہیں بہاؤں گا۔ میں بڑی عزت اور شان سے اپنے جیل کے  
دن گزار کر جیل نیا سے دوبارہ لانے کے لیے واپس راولپنڈی کی سڑکوں پر آؤں گا۔

قاضی صاحب کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ بھیر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ مزے اور  
بولے

”بھیر صاحب آپ لوگوں کا کام اس ملک کی سرحدوں اور اس کی عوام کی حفاظت  
کرنے ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں۔ آپ نے ایک ایسے شخص کو پھانسی لگا دی جو آپ  
کے بڑے رفیقی بھارتی جیلوں سے واپس لے آیا تھا۔“

بھیر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا اس نے حکم دیا کہ اس تین فٹ  
کے جرم کو بیاٹولی جیل بھیج دیا جائے۔

قاضی صاحب جیل میں روئے اور دن وہاں ماتم کیا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔  
اب وہ بڑی بہادری سے نو ماہ بعد جیل کاٹ کر رہا ہونے تو پارٹی کے ورکروں نے انہیں کدھوں پرانی  
لا۔ وہ اب ان کے لیے حراست کا نیا انتظام بن کر ابھرے تھے۔ پارٹی کے ورکر یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے  
کہ ایک تین فٹ کا انسان اتنی بہادری اور صبر کا مظاہرہ کرے گا۔

قاضی صاحب مارشل لا حکومت کے لیے ایک مستقل دوسرے بن چکے تھے۔ ہائی پائمنٹ  
گھڑائے۔ مارشل لا مارٹن ایلیسٹر جیل کے ایجنٹ مارٹن نے پی ٹی وی کی انٹرویو میں کہا کہ وہ  
کہ وہ قاضی صاحب کی محمود کوڈگری سے نکال دیے۔ (یہ وہی جیل ہیں جنہوں نے کتاب Working

with Zia (کسی ہے۔)

قاضی صاحب اب ان ہاتھوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے زندگی کا مقصد  
سرکاری نوکری کرنا نہیں بلکہ اس بہنو کی پارٹی کے لیے کام کرنا تھا جس نے نہ صرف انہیں زندگی میں پہلی  
دفعہ عزت دی تھی بلکہ انہیں نوکری پر بحال کرانے کے لیے ہوٹل کے نمبر سے سواری تک کیا تھا۔

قاضی صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی بہنو صاحب کے عشق میں انہوں نے کچھ مزے امتحان ہی  
پاس کرنے تھے۔ 3 مارچ 1981ء کو جو نمبی پی آئی اے کے طیارے کے انجوائی خیر بھلی تو سب سے پہلے  
قاضی صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی جیل سے انہیں گوجرانوالہ جیل بھیج دیا گیا۔ 8  
اپریل کو انہیں آخر شاہی قلعے لاہور بھیج دیا گیا۔ جب قاضی سلطان شاہی قلعہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہاں  
لیٹل سائے حیات، جہاںگیر بدر، شفقت محمود اور دیگر پارٹی لیڈران پہلے سے ہی وہاں قید تھے۔ ان دنوں  
شاہی قلعہ میٹرو پارٹی کے ورکروں کے لیے ایک خوف اور وہشت کی علامت بن چکا تھا لیکن قاضی  
صاحب پھر بھی تین ماہ تک وہاں رہے۔

جب قاضی صاحب جیل سے واپس آئے تو انہیں ایک دفعہ پھر 27 دسمبر 1981ء کو گرفتار کر لیا  
گیا۔ اب کی دفعہ ان پر ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ شاہی کسی کو کوئی تھوڑی سی شرم  
آگئی تھی کہ بھلا تین فٹ کا ایک انسان چھ فٹ کے کانسٹیبل کو کیسے قتل کر سکتا تھا لہذا اسے ایک پختے بعد بڑا  
کر دیا گیا۔

قاضی صاحب جیل سے آئے تو انہوں نے دوبارہ سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 28 مارچ  
1982ء کو انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ راولپنڈی سے انہیں لاہور لے جایا گیا۔ کچھ دن انہیں ہی  
آئی اے کے جیٹ ہائی سٹریٹ میں رکھا گیا۔ وہاں سے انہیں ایک دفعہ پھر شاہی قلعے بھیج دیا گیا۔ مارشل  
لا حکومت کا دل اس سے بھی نہیں بھرا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو لال قلعہ بھیج دیا جہاں بھارتی  
ہاتھوں سے کنٹریل کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کو وہاں ایک 4x7 فٹ کے ایک کمرے میں  
لگا دیا گیا۔ دو چھ دن تک اس کمرے میں قلم اور آلات برداشت کرتے رہے۔ لال قلعہ سے  
نکل کر انہیں دوبارہ شاہی قلعے لاہور لایا گیا اور آخر میں انہیں کوٹ گھٹ جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں سب سے  
آخر تک وہاں کی ٹرست میں لال دیا گیا۔ وہاں جہاں تک انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں



تعلیم کا پورا پورا خیال رکھیں۔

ایک نئی کمیٹی بنائی گئی جس کے ذریعے ایک نئی عمارت میں تعلیم کا سہارا  
مہیا کیا گیا۔ ایک نئے سیکرٹری صاحب کو مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔ پھر چارج ٹیبل کی ذمہ داری سنبھالی گئی اور قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔

ایک نئی عمارت میں تعلیم کا سہارا  
مہیا کیا گیا۔ ایک نئے سیکرٹری صاحب کو مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔ پھر چارج ٹیبل کی ذمہ داری سنبھالی گئی اور قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔

قاضی صاحب نے اپنی طرف سے سیکرٹری صاحب کو بھانسنے کی کوشش کی کہ وہ چارج ٹیبل  
کو 1968ء میں کیے قتل کرنے کا پروگرام بنا سکتے تھے۔ جب چارج ٹیبل نے یہ سنا تو سیکرٹری  
سے یہ کہہ کر اس وقت چارج ٹیبل کو قتل کرنے کی کوئی ہمت بھی نہیں تھی۔

سیکرٹری صاحب نے فریڈ ہونے کے بجائے ان قاضی صاحب کو یہ کہہ کر جواب دیا کہ میں  
نہیں ہے مجھ سے چھٹے میں کوئی غلطی ہوئی ہو اور یہ سال 1968ء نہیں بلکہ 1978ء ہو گا۔ اپنی سخت  
دماغی کے لیے سیکرٹری صاحب نے کہہ دیا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر تم نے چارج ٹیبل کو قتل  
کرنے کی سازش 1968ء میں کی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم نے چارج ٹیبل کو قتل کرنے کی سازش چارج  
ٹیبل کی قیام کی تھی۔

یہ کہہ کر سیکرٹری صاحب نے انہیں تین سال کی سزا کا حکم سنایا۔ وہیں سے انہیں سیدھا جیل  
بھجوا دیا گیا۔ تین سال بعد 15 جون 1985ء کو انہیں جیل سے پانچ سال جیل سمجھنے کے بعد جیل  
سے رہا کر دیا گیا۔ اس سزا میں ان کے دوران میں کوریوٹو بھی شامل ہے جو وہ اس تین سال کی سزا سے  
پہلے ایک مہینوں جیل میں رہ کر سمجھ چکے تھے۔

قاضی صاحب پانچ سال جیل سمجھنے کے بعد ایک قمار خانی میں جا کر بیٹھے تھے۔ ان  
کی حالت اس کی حد تک تھی کہ انہوں نے جیت کر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے  
جن کے پاس سے یہ قمار خانی چلتی ہے۔

جب حکم سے باہر آئے تو سیکرٹری صاحب اور سیکرٹری صاحب نے انہیں سے پوچھا کہ انہوں نے

ایک نئی عمارت میں تعلیم کا سہارا  
مہیا کیا گیا۔ ایک نئے سیکرٹری صاحب کو مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔ پھر چارج ٹیبل کی ذمہ داری سنبھالی گئی اور قاضی صاحب کے خلاف چارج ٹیبل  
تیار کیا گیا۔

قاضی صاحب نے اپنی طرف سے سیکرٹری صاحب کو بھانسنے کی کوشش کی کہ وہ چارج ٹیبل  
کو 1968ء میں کیے قتل کرنے کا پروگرام بنا سکتے تھے۔ جب چارج ٹیبل نے یہ سنا تو سیکرٹری  
سے یہ کہہ کر اس وقت چارج ٹیبل کو قتل کرنے کی کوئی ہمت بھی نہیں تھی۔

سیکرٹری صاحب نے فریڈ ہونے کے بجائے ان قاضی صاحب کو یہ کہہ کر جواب دیا کہ میں  
نہیں ہے مجھ سے چھٹے میں کوئی غلطی ہوئی ہو اور یہ سال 1968ء نہیں بلکہ 1978ء ہو گا۔ اپنی سخت  
دماغی کے لیے سیکرٹری صاحب نے کہہ دیا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر تم نے چارج ٹیبل کو قتل  
کرنے کی سازش 1968ء میں کی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم نے چارج ٹیبل کو قتل کرنے کی سازش چارج  
ٹیبل کی قیام کی تھی۔

یہ کہہ کر سیکرٹری صاحب نے انہیں تین سال کی سزا کا حکم سنایا۔ وہیں سے انہیں سیدھا جیل  
بھجوا دیا گیا۔ تین سال بعد 15 جون 1985ء کو انہیں جیل سے پانچ سال جیل سمجھنے کے بعد جیل  
سے رہا کر دیا گیا۔ اس سزا میں ان کے دوران میں کوریوٹو بھی شامل ہے جو وہ اس تین سال کی سزا سے  
پہلے ایک مہینوں جیل میں رہ کر سمجھ چکے تھے۔

قاضی صاحب پانچ سال جیل سمجھنے کے بعد ایک قمار خانی میں جا کر بیٹھے تھے۔ ان  
کی حالت اس کی حد تک تھی کہ انہوں نے جیت کر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے  
جن کے پاس سے یہ قمار خانی چلتی ہے۔

جب حکم سے باہر آئے تو سیکرٹری صاحب اور سیکرٹری صاحب نے انہیں سے پوچھا کہ انہوں نے







میں نے اس وقت سب سے پہلے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک  
میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک

میں نے اس کو اپنی اقامت سے کابل لایا  
تو وہ اس وقت بھی وہاں سے لے گیا اور اس وقت تک



قاضی صاحب ایک مطمئن انسان ہیں۔ وہ اپنے بھتیگوں اور ناصحان کے دیگر لوگوں کے ساتھ  
زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ اب ان کی بی بی عزت کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر برا بھلا کہتے ہیں کہ  
پتیل پارٹی کے رہ کر ہیں اور سب سے زیادہ کر ڈاؤن اسٹیبلشمنٹ سے لے کر نصرت بھی بیچنے والے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنے کیا سیاسی مستقبل دیکھ  
رہے ہیں تو وہ نے کہ میری زندگی کی خواہش ہے کہ میں پتیل پارٹی کے ٹکٹ پر پیٹریز ہوں۔ 2003ء کے  
مبارزے میں ہونے والے انتخابات میں زروری صاحب نے کوشش کی تھی کہ مجھے پارٹی کا ٹکٹ مل جائے  
لیکن پنجاب میں جسٹس کم ہونے کی وجہ سے میرا نام ہار اپ کر دیا گیا تھا۔

زروری صاحب واقعی پاروں کے پار ہیں۔ 2003ء میں قاضی سلطان محمود کو پنجاب سے  
ٹکٹ کا ٹکٹ تو نہ ہوا اس کے لیکن پیٹریز بھٹو کے قتل کے بعد جب 2008ء میں وہ پارٹی کے کوچیز میں بنے  
تو انہوں نے اپنے پہلے چند کاموں میں سے جو ایک کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قاضی سلطان محمود کو  
پتیل پارٹی کی سٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر بنا دیا جہاں یوسف رضا گیلانی، محمد سوم امین، فیہم، رولہ، پراج  
اشرف، صفدر مہاسی، رحمان ملک، نواب یوسف تالپور، قائم علی شاہ، شاہ محمود قریشی، احمد مختار، ریشمی،  
نور شید شاہ جیسے لوگ بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے آصف زروری نے بھٹو کے اس سیاسی ورکر کو جس کو  
جنرل فیاض کو قتل کرنے کی سازش کے جرم میں پانچ سال سزا دی گئی تھی، وہ عزت دی ہے جو انہیں شاہ  
پتیل بن کر بھی نہ ملتی۔

### جنرل محمد امجد

جنوری 2003ء کی بات ہے کہ میں اور انگریزی اخبار ڈان کے ایڈیٹر ارشد شریف نے  
آج کل ڈان کے انگریزی چیف ایڈیٹر ڈان نوز کے اسلام آباد میں بیورو چیف ہیں، اس کے قومی اسٹیبلشمنٹ کا وفد  
سوالت کرتے تھے۔ ارشد شریف بہت ہی میلنڈ سمانی ہیں۔ وہ ان صحافیوں میں سے ہیں جن کی میں  
بے پناہ عزت کرتا ہوں۔

ایک دن میں وفد سوالات سے ڈرائیٹ ہوا تو میں نے ارشد شریف کو قومی اسٹیبلشمنٹ کی لابی میں  
تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے دوڑا تو پتہ چلا کہ موصوف اس وقت وزارت دفاع  
کے پارلیمانی سیکرٹری سچر جنرل حسین (گھوکارو طاہرہ سید کے بھائی) کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔  
میرے پوچھنے پر ارشد بتانے لگے کہ دراصل تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں سچر صاحب نے  
قومی اسٹیبلشمنٹ کو بتایا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کی ایک شوگر مل کی فروخت میں خاص ہی بے ضابطگیاں ہونے پر  
تعمیرات جاری ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی خرید و فروخت اور اس میں بے ضابطگیاں بی بی عام ہی بات  
ہے۔ ارشد نے میری طرف دیکھا اور کہا جناب عالی ایہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ فوجی  
فاؤنڈیشن کا ایم۔ ڈی کون ہے۔ میں نے لاسی کا اظہار کیا تو ارشد شریف بولے کہ حضور اس لیے آپ



اس خبر کی اہمیت نہیں سمجھ رہے۔ جنرل محمد امجد اس فوجی قاذوڈیشن کے نتیجے میں ہیں جن پر یہ پالیسی کا سہارا ہے کہ اس کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیوں ہوتی ہیں۔

میرے ذہن میں فوری طور پر جنرل امجد کا نام ٹک نہیں ہوا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جناب یہ وہی مہسوف ہیں جو پہلے سب کے نتیجے میں تھے اور جنہوں نے احتساب کے نام پر 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جرم بھی ان کے ہاتھ پڑھا انہوں نے اسے اٹھالیا۔ گرفتاری پہلے کی تھی اور الزامات بعد میں عائد کیے گئے۔

میں چونکہ پڑا میں نے ارشد سے کہا استاد یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔

خیر۔ سبکدوشی سے ہماری ملاقات نہیں ہوتی۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر وہ خبر بتائی۔ اس خبر کی مختصر تفصیلات کچھ یوں تھیں کہ سندھ میں فوجی قاذوڈیشن کی ایک اپنی شوگر مل تھی۔ جنرل امجد اس کے ایم۔ای بے تو اسے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ دو تین پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ ایک پارٹی نے 37 کروڑ روپے پیش کرنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ دوسری پارٹی نے اس کی بولی تیس کروڑ روپے لگائی۔ فوجی قاذوڈیشن نے وہ شوگر مل تیس کروڑ روپے والے کے ہاتھ بیچ دی۔ اس خوش قسمت انسان نے دو تین دن بعد وہی شوگر مل 37 کروڑ بولی لگانے والی پارٹی کو بیچ دی۔ یوں راتوں رات اس ایک انسان نے پندرہ کچھ کچے سات کروڑ روپے کما لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جن صاحب کو یہ تیس کروڑ روپے کی مال پینگی تھی وہ جنرل صاحب کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

اب یہ خبر ان اور وی نیوز میں بھی تو اس پر خاصا اوجھا ہو گیا۔ بی بی سی کے اجلاس میں فرحت اللہ ہار نے اس پر ابھی خاصی تقریر کی اور معاملے کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے دفاع میں بھیج دیا گیا۔ اس سٹوری کے پھینکے کے اگلے دن بعد فوجی قاذوڈیشن نے انگریزی اخباروں میں ایک بہت بڑا اشتہار دیا جس میں بغیر اس بات کے انکار کیے کہ سرکاری طور پر اس ذیل کے خلاف تحقیقات ہو رہی تھیں جس سے پتہ چلا کہ اس کی کوشش کی گئی کہ سب اچھا تھا۔

آصف زرداری اور سرفراز گلانی اور دیگر اہل خانہ کے رہنما جنہوں میں جنرل امجد کی حالی اولیٰ بی بی سی کے انٹرویو میں ایک جگہ ہے۔ آغا جنرل امجد خود کہانی کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ یوں جنرل پارٹی نے اس کو نال کو خوب اچھا لے کا فیصلہ کیا اور بات بذمہ لے شروع ہو گئی۔

ایک دن میں قومی اسمبلی میں تھا کہ مجھے اٹنی پائے کی جرنلسٹ جناسرہ کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل امجد ان کے انگل ہیں اور آج کل ان خبروں کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ بتاتے تھے ان کا کیا آپ اگر مناسب سمجھیں تو ان کا پوائنٹ آف ویو لے لیں۔ ہائی آپ کی مرضی کہ آپ نے کیا اور کیسے لکھتا ہے۔

میں جناسرہ کی اس بات کی دادوں کا کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ جنرل امجد ان کے انگل ہیں لہذا میں کچھ ان کا خیال کروں جیسے عموماً ہم صحافی لوگ ایک دوسرے کو اپنے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں کو اس طرح کی صورت حال میں پا کر کہتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے ہنگامہ گروپ میں ایک اٹنی مہدے پر قائم ہیں اور سب سے بلا کر یہ کہ صحافت میں مجھ سے بہت سچتر ہیں لہذا میں توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے انگل پر کچھ ہاتھ لگا کر رکھنے کا کہیں گی لیکن انہوں نے خالصتاً ایک پروفیشنل بات کی کہ مجھے ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لینا چاہیے۔

بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شاید جناسرہ کو یاد ہو کہ 90 کی دہائی کے وسط کی بات ہے وہ لاہور میں دی نیوز آن سنڈے کی ایڈیٹر تھیں۔ میں ان دنوں اپنا صحافت میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں وی نیوز کے لاہور میں واقع دفتر میں وی نیوز آن سنڈے کے ہی ادارے بلتان کے اچھے صحافی خالد حسین سے ملنے چلا گیا۔ خالد حسین سے تو ملاقات نہ ہو گی تاہم جناسرہ سے مل گیا۔ وہ اس وقت کہ پیوٹر پر بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ تمام روایتی صحافیوں کی طرح انہوں نے بھی کپیجنگ سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے دو تین منٹ بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں بلتان میں بیٹھ کر کس طرح کی رہ رہ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو تین آئیڈیے انہیں بتائے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ایم کیو ایم بلتان میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جناسرہ نے لیں کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ ایم کیو ایم کا فوٹو ہٹ گیا تھا۔ ان کو تو بلتان سے کوئی ایڈیٹر نہیں ملا تھا۔ اب مردہ گھوڑے میں ہان اٹانے کا کیا فائدہ؟ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اجازت لی کہ مجھے اسماس ہو گیا تھا کہ وہاں وال لکھ گئے والی

مجھے یقین ہے کہ جناسرہ کو یہ ملاقات جگر گز یاد نہیں ہو گی کیونکہ اس طرح کے کی تو جہان کی آواز سے کہ انہوں نے ان کے دفتروں میں پھرتے رہتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔







عزل صاحب نے کہا کہ جب ایک شخص انہوں نے کچھ دنوں کے بعد اس کا حال  
پوچھا تو اس نے کہا کہ میں اب بھی وہی ہوں۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب ایسا بات اتنی آسان نہیں ہے جس کی آپ کھٹے میں سہا  
کیے ہو مگر ہے کہ آپ ایک ہی میں کہہ سکتے ہیں اور پھر اسے ان کا کہہ سکتے ہیں۔  
آپ کا حال کیا ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیا وہ جس نے ایک سات میں سات کا  
بذریعہ کئے تھے آپ کا دوست نہیں تھا۔

عزل صاحب نے اس کا جواب دیا وہ مجھے بتانے کے کہ کبھی فوجی کا وہ نہیں کہہ  
تھوئے غیر انہوں کے پاس میں رہے تھے کہ وہ وہی ہیں کے تھے۔ میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر  
اس دن میں کوئی ایسا شخص تھا تو ہر روز اس وقت اس نے آپ کے خلاف تحقیقات کا حکم کیا ہے وہ  
عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کی تحقیقات کے بارے میں میں نے نہیں سنا۔ جب میں نے  
پوچھا تو اس نے کہا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب آپ کا بھوت کی حالت کبھی اس کے وقت میں بار بار ہوا ہے  
تو اس بار آپ سے پوچھ لیں گے۔

عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کا نام ایک شخص کا ہے جو اس وقت سے یہ کہتا ہے کہ اس  
پہلے کہ اس نے اس وقت میں اس کو سزا دیا اور اس وقت میں اس کے پاس سے۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کچھ دیکھا ہے تو اسے لکھ کر آپ کے پاس لے آئیے  
تو اس سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔

عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔ اس شخص کے بارے میں  
میں نے کچھ نہیں سنا۔ اس شخص کے بارے میں میں نے کچھ نہیں سنا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کچھ دیکھا ہے تو اسے لکھ کر آپ کے پاس لے آئیے  
تو اس سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب انہوں نے کچھ دنوں کے بعد اس کا حال  
پوچھا تو اس نے کہا کہ میں اب بھی وہی ہوں۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب ایسا بات اتنی آسان نہیں ہے جس کی آپ کھٹے میں سہا  
کیے ہو مگر ہے کہ آپ ایک ہی میں کہہ سکتے ہیں اور پھر اسے ان کا کہہ سکتے ہیں۔

آپ کا حال کیا ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیا وہ جس نے ایک سات میں سات کا  
بذریعہ کئے تھے آپ کا دوست نہیں تھا۔

عزل صاحب نے اس کا جواب دیا وہ مجھے بتانے کے کہ کبھی فوجی کا وہ نہیں کہہ  
تھوئے غیر انہوں کے پاس میں رہے تھے کہ وہ وہی ہیں کے تھے۔ میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر  
اس دن میں کوئی ایسا شخص تھا تو ہر روز اس وقت اس نے آپ کے خلاف تحقیقات کا حکم کیا ہے وہ  
عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کی تحقیقات کے بارے میں میں نے نہیں سنا۔ جب میں نے  
پوچھا تو اس نے کہا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب آپ کا بھوت کی حالت کبھی اس کے وقت میں بار بار ہوا ہے  
تو اس بار آپ سے پوچھ لیں گے۔

عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کا نام ایک شخص کا ہے جو اس وقت سے یہ کہتا ہے کہ اس  
پہلے کہ اس نے اس وقت میں اس کو سزا دیا اور اس وقت میں اس کے پاس سے۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کچھ دیکھا ہے تو اسے لکھ کر آپ کے پاس لے آئیے  
تو اس سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔

عزل صاحب نے کہا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔ اس شخص کے بارے میں  
میں نے کچھ نہیں سنا۔ اس شخص کے بارے میں میں نے کچھ نہیں سنا۔

میں نے کہا کہ عزل صاحب اگر آپ نے کچھ دیکھا ہے تو اسے لکھ کر آپ کے پاس لے آئیے  
تو اس سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیے۔



جزل ہیں اور میں ایک سہانی امیں اس وجہ سے یقیناً آپ کا خیال کرتا ہوں کہ آپ ہماری بہتر سمجھنا اور  
سرور کے اعلیٰ ہیں۔

میں وہ چارڑکی حیثیت سے کسی شخص کو مشورے دینے پر یقین نہیں رکھتا۔

اجی وہ میں میں نے محسوس کیا کہ لوہا گرم تھا۔ جزل صاحب میری باتیں سننے کے عوا میں  
تھے۔ میری گفتگو کا رخ بدلا اور میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے  
اس دور کی کچھ کہانیاں بتائیں جب وہ ویب کے چیئر مین تھے۔

جزل امہد ہار اپنے ایچ کے بارے میں بہت فخر مند تھے جو ان کے بقول میری خبروں سے  
بہت بری طرح جاہ ہوا تھا۔ اب وہ پابجے تھے کہ اس ایچ کو دوبارہ بہتر کیا جائے۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ مہلا جو چیز ایک دفعہ گزر جائے اسے کیسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ جزل صاحب اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ مجھے ذرا مکمل کریب کے  
ٹھیکر مین کی حیثیت سے کچھ واقعات سنائیں تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ آپ کتنے اچھے تھے اور آپ کو کیوں  
اور کیسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جزل امہد ان دنوں کے بارے میں بات کرنے میں کچھ تذبذب کا شکار  
تھے۔ خبر میں نے بھی بہت نہیں ہاری اور یوں جزل امہد پہلی دفعہ کسی سہانی کو اعتراض دینے کے لیے تیار  
ہو گئے۔

جزل امہد نے اپنی کرسی سے ٹپک لگائی۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گئے اور میں کافی کی چمکیاں  
پینے لگا۔

11 اکتوبر 1999ء کو جزل امہد اس وقت پھر جزل تھے، شام کو کالج کھیل کر رہا پڑھی میں  
واقع اپنے گھر والوں کے تو انہیں یہ تھا کہ جزل مشرف کو اس میں کر کے جزل فیاض الدین بنت کو بنا  
انہی وقت لگا لیا تھا۔ اس کی بات پر بھی جزل امہد کے جزل مشرف اور جزل بنت دونوں سے  
انہی وقت تھے۔ وہ جزل مشرف کو 1988ء سے پانتے تھے جب وہ طرح طرح کی چیزیں دیکھتے تھے اور انہیں  
انہیں کافی میں ان کے سزا کرتے تھے۔ پڑھیں کہ جزل امہد کی انہوں تک بہت تھے ان کے کافر وہاں  
کہنا اور انہیں کہہ کر انہوں میں آئی کہ آپ اپنا رشتہ بدل گئی تھی۔ جزل امہد جزل مشرف کے پاس

ہم سے بھی قریب تھے کہ وہ ہی اسی کی میں بیٹھ کر بہت سارے ایسے واقعات اٹھائے کرتے تھے جن  
آری ذیل جزل مشرف سے اکٹرا واسطہ رہتا۔

میں نے جزل امہد سے پوچھا کہ ان کا اپنا ذاتی خیال کیا تھا کہ فونج کو مارشل اور مارشل کو مارشل  
تھا۔ وہ بولے کہ آری ملک انداز میں کام کرتی ہے۔ اپنی بات میں وہ ان کے لیے انہوں  
نے کہا کہ جب 1988ء میں جزل نیپا کی موت کے بعد جزل اعظم ایک نے یہ لہجہ کیا کہ وہ مارشل اور  
نہیں لگائیں گے تو پوری فونج نے انہیں سہارے کیا، لیکن اسی فونج نے جزل مشرف کا ساتھ دیا جب  
انہوں نے 12 اکتوبر کو مارشل لگا لیا۔ اس سے آپ کو آری کی تربیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

ایک دن جزل امہد کو بلا کر یہ کہا گیا کہ آج کے بعد انہوں نے پاکستان میں بے رحمانہ قسم کا  
احساب کرنا ہے۔

جزل امہد بڑے حیران ہوئے کہ آخر انہیں جزل مشرف نے اس کام کے لیے کیوں چنا تھا۔  
اپنی تقریر میں جزل مشرف نے ان کے کندھوں پر ذمہ داری اور بڑھادی جب میڈیا کے لوگوں کو انہوں  
نے خود یہ بتایا کہ ایک دن انتہائی ایماندار اور اچھے آری آفیسر کو نیپ کا چیئر مین لگا لیا گیا تھا۔ جزل امہد کو  
جزل مشرف کی 16 اکتوبر 1999ء کو کی گئی تقریر سے یہ اندازہ ہوا کہ فونج اب کس رخ پر سہا سہا ہوں اور  
تیار کر میں کا احساب کرنا چاہتی تھی۔

جزل مشرف نے جزل امہد کو ہٹا کر کوئی بات نہیں سمجھائی کہ انہوں نے کیا کرنا تھا۔ جزل  
امہد کورف اتاتا لگا گیا کہ انہوں نے ہر ایک کے خلاف کارروائی کرنی تھی اور احساب کرنا تھا۔

جزل مشرف کے ان الفاظ نے جزل امہد کو وہ اعتماد دیا کہ پھر انہوں نے حرا کر چھپے نہیں  
دیکھا۔ جزل امہد کے نزدیک سب سے آسان ہار گت وہ لوگ تھے جنہوں نے انہوں کے قریبے والوں  
نہیں کیے تھے اور ان کی لہر ست فوری طور پر مل گئی تھی۔ جزل صاحب نے فوری طور پر انہوں کے صدر  
اور نائب ایگزیکٹو سے ملنا شروع کیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے ان کا انہیں کی لہر میں وہ انہوں  
نے لہرے والوں نہیں کیے تھے۔ جزل امہد نے یہ بھی لہجہ کیا کہ اس کو مارشل اور مارشل کے  
انہوں کو لگا لیا جائے گا اور اس طرح جب 1986ء میں انہیں لگا لیا گیا تھا اس کی گہرائی میں آئی  
تھی۔ جزل امہد پہلے ہی ایک ہیٹے کی لہر انہوں سے پہلے تھے کہ 18 اکتوبر 1999ء تک انہوں نے اپنے



قرضے واپس کر دیے اور دو وقت ایکشن میں گئے۔ جن میں یہ بالغ ان قریب آتی جا رہی تھی۔ جنرل  
 احمد زکریا کے قرضے کے ساتھ ان پرنسپل میں کی فہرستیں بنانے میں مصروف تھے جو قرضے واپس نہیں کر  
 رہے تھے۔ 17 نومبر کو انہیں ان 288 لوگوں کی فہرست دی گئی جو جان بوجھ کر قرضوں کے قرضے واپس نہیں  
 کر رہے تھے۔ قرضوں کی رپورٹ کے مطابق 211 ارب روپے کے قرضے واپس نہیں کیے گئے تھے  
 148 ارب کے قرضوں کی وصولی ممکن تھی کیونکہ وہ بینک کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت چل رہے تھے  
 جبکہ 90 ارب روپے کا قرضہ واپس ملنے کی امید نہیں تھی۔ جنرل احمد نے احتساب کو ترجیح دیتے ہوئے  
 ٹیکس چوری ٹیکس فراڈ لینڈ مافیا، الگ ٹیکس اور معمولی کی کرپشن کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ جوئی  
 ان کیسز کی فہرست بنی تو یہ چلا کہ لینڈ سیکٹل ٹیکس چوری مافیا کی کرپشن اور رشوت سے بھی کافی زیادہ  
 تھے۔ حکومتوں نے حکمت عملی بدلی اور سیاستدانوں کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

میں نے جنرل صاحب سے پوچھا کہ یہ بتائیں کہ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا کہ احتساب کی اس  
 فہرست میں صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کو نشانہ بنایا جائے گا جبکہ جنرل اور جرنیلوں اور جرنیلوں  
 سے کوئی ٹیکس پوچھے گا یا جان بوجھ کر ان میں طاقتور اداروں کو احتساب سے باہر رکھا گیا تاکہ انہیں اپنے  
 ساتھ ساتھ سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے خلاف اپنی مرضی کا ایکشن لیا جاسکے یا پھر ان کے اوپر کسی اور  
 کارروائی کا ان میں انہیں کے لوگوں کو ہاتھ نہیں لگا تھا۔

جنرل احمد نے احتساب کے بارے میں فیصلہ نہیں لے کر ہی کہا تھا کہ صحافیوں اور جنرل صاحب  
 میں یہ کیا کیا ہو رہا ہے کہ وہ یہ بات کہہ رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب انہیں میں لیتے ہیں کہ جنرل اور جرنیلوں کو ہاتھ نہ لگانے کا باعث  
 آپ کو ہاتھ نہیں پڑے گا کہ جنرل صاحب کو ہاتھ نہ لگائے گا کہ وہ اپنے قرضوں کو ہاتھ نہ لگائے گا  
 اور انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا اور سوچا۔

جنرل صاحب نے 1994 میں احتساب کے بارے میں کہا کہ انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی  
 اور انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب انہیں میں لیتے ہیں کہ جنرل اور جرنیلوں کو ہاتھ نہ لگانے کا باعث  
 آپ کو ہاتھ نہیں پڑے گا کہ جنرل صاحب کو ہاتھ نہ لگائے گا کہ وہ اپنے قرضوں کو ہاتھ نہ لگائے گا  
 اور انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا اور سوچا۔

سیور تھا ہندسے قانون کی ضرورت صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے لیے تھی۔  
 میں نے کہا کہ جنرل صاحب آپ کو تو جنرل شرف نے اپنے سیاسی مخالفین کی سیاسی  
 رفتاروں پر فریج نے کے لیے استعمال کیا تھا کہ وہ اس ملک کے جمہوری ادارے چھوڑ کر اپنے فوجی  
 اقتدار کو بچائیں۔ جنرل احمد نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ بولے کہ وہ سب لوگوں کے خلاف  
 احتساب کر رہے تھے۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ مجھے بتانے لگے کہ انہوں نے ایلے کی ایجر کے تمام  
 سیاسی پارٹیوں میں موجود کرپٹ لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ ہاتھوں ہی ہاتھوں میں وہ اس  
 بات کا انکشاف کر گئے کہ ان کے بعد آنے والے نیپ کے فیصلے میں نے یقیناً ان لوگوں کے خلاف  
 تحقیقات کی ہوں گی جن کے خلاف ان کے دور میں قائم بنائی گئی تھی اور جو جنرل شرف کے سیاسی  
 دوست بن چکے تھے۔

ان کا اشارہ یقیناً جنرل خالد مقبول کی طرف تھا۔

جنرل کا خیال تھا کہ وہ اس ملک میں کوئی احتساب نام کی چیز کو بھی دیکھ نہیں کر رہے تھے اس  
 سے پہلے ہیف الزلمین بھی نو اور شریف کے دور میں نہیں دیکھ کر رہے تھے۔ اب کی دفعہ فریق صرف اس کا تھا  
 کہ یہی کے پاس احتساب بیورو سے زیادہ پور تھی۔ کی فوجی حکومت نے ہاتھ نہ لگائے احتساب کے قوانین کو  
 اپنی طرف کھینچ کر ان پر تحقیقی معصوموں میں مملو کر رکھا تھا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب آپ کی یہ باتیں 1993 اور 1994 کے لوگوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ دیکھتے  
 تھے کہ اس بار آپ نے جوئی صورت کو دیکھا ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ وہ اس بار اس کا احتساب  
 کر کے انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا اور سوچا۔

جوئی اپنے ہمراہوں کے ساتھ جنرل اور جرنیلوں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی  
 اور انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا اور سوچا۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب انہیں میں لیتے ہیں کہ جنرل اور جرنیلوں کو ہاتھ نہ لگانے کا باعث  
 آپ کو ہاتھ نہیں پڑے گا کہ جنرل صاحب کو ہاتھ نہ لگائے گا کہ وہ اپنے قرضوں کو ہاتھ نہ لگائے گا  
 اور انہیں کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا اور سوچا۔







میں لکھتا ہے کہ یہ ہے۔

جس صاحب نے اس کی اس قدر تعریف کی ہے۔

میں نے جو کہ اس صاحب کی تعریف کی ہے وہ اس کی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی تعریف ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

یہ لکھتا ہے کہ یہ ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

### میر تقی اللہ خان بھٹائی

میر تقی اللہ خان بھٹائی صاحب نے میر تقی اللہ خان بھٹائی صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔

میں نے اس صاحب کی تعریف کی ہے۔  
اس کی تعریف ہے کہ اس صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔



جمالی صاحب کے چہرے پر کھینچی ہوئی اداسی اور مایوسی ایک واضح پیمانہ ہے۔ وہی قہمی کہہ لیا  
 سردار کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ استغلی دہینے سے صرف ایک  
 دن پہلے ہی انہوں نے ہمارے صحافی دوست اہلسار عالم کو یہ اطلاع دیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جا رہے تھے اور  
 وہی ان سے کسی نے استغلی مانگا تھا۔ شاید انہیں اس چیز کا احساس اور دکھ زیادہ تھا کہ کسی نے ان کے  
 ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ جب پوری دنیا میں ان کے استغلی کی خبریں گردش کر رہی تھیں تو طاقت کے ایوانوں  
 میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں یہ یقین دلارہے تھے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہی وزیراعظم آجیں گے۔  
 ایک طرف ایک نیا وزیراعظم احوط اہار ہا تھا تو دوسری طرف انہیں یہ یقین دہانیاں کرنی چاہی تھیں  
 کہ وہ قہمی تھیں۔ جمالی صاحب کے کمرے میں ایک سوگ کی سی کیفیت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی  
 تھی۔ میں بھی پہلے سے بیٹھے ہوئے سوگواروں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد جمالی صاحب نے  
 اسلام آباد کے ایک اردو اخبار کے مشہور صحافی کا نام لیا اور کہا کہ شکر کریں ان کی وجہ سے میری طاقت  
 ہو رہی تھی۔ ان کا پروگرام تو بلوچستان جانے کا تھا لیکن اس صحافی دوست نے اصرار کیا کہ آج شام ان  
 کے گھر کھانے کی دعوت کھا کر ہی وہ بلوچستان جائیں۔ وہ صحافی دوست کے اصرار کے سامنے اٹھ  
 نہیں کر سکے اور میں آج شام انہوں نے اس کے گھر کھانا کھانے جانا تھا۔ جونہی میں نے جمالی  
 صاحب سے رسا سوال و جواب کرنے شروع کیے تو انہوں نے اپنے نیلی فون آپریٹر کو کہا کہ اب کسی کو  
 اندر کال نہیں ملانی۔ عمارتی بات چیت کو چند لمحوں ہی گزرے تھے کہ ان کے اصرار کام کی نکل گئی۔ جمالی  
 صاحب نے مجھے سے فون اٹھا کر آپریٹر کو کہا کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اندر فون نہیں دینا۔ ایک لم  
 آپریٹر کی بات سن کر چپ رہا۔ وہ سیر کو ہوتا گیا۔ دوسری طرف سے کسی سے گفتگوری بات کی۔ ان کے  
 پرے کونک پر مہتی ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر  
 رہے تھے۔

مگر سنا یہ بکھا کہ شاید یہ فون انہیں کسی بیکٹ کی کھینچی کی طرف سے آیا تھا جنہوں نے انہیں  
 مجھے اطلاع دینے سے روکنے کی کوشش کی تھی کہ جمالی صاحب شاید کسی ضرورت سے زیادہ ہی  
 اہمیت سے تھے۔  
 مگر چپ رہا اور کوئی بات نہیں کہی۔

جمالی صاحب تو بڑی دیر اپنے آپ کو منہانے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی  
 میں غریبی فون کرنے والا کون تھا اور اس نے ایسی کوئی بات کہہ دی تھی کہ جس سے جمالی صاحب کدم  
 بے یقین اور حیرت انداز ہو گئے تھے۔ آخر ان سے رہبانہ کیا اور بول پڑے کہ یہ میرے ساری صحافی دوست  
 کا فون ہے جس نے آج اپنے گھر پر میرے کھانے کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ آج اسے  
 کوئی ضروری کام تھا لہذا یہ دعوت کینسل۔ جب جمالی صاحب پھر کبھی بلوچستان سے واپس اسلام آباد  
 آئیں گے تو وہ دوبارہ انہیں گھر کھانے پر بلائے گا۔

جمالی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے اس صحافی  
 دوست کے اصرار پر دونوں سے بلوچستان ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اب وہی دوست انہیں یہ کہہ  
 رہا تھا کہ اسے کوئی اور ضروری کام پڑ گیا ہے۔

اتنی دیر میں فون کی تیل دو بارہ آئی۔ جمالی صاحب نے مجھ سے پوچھا کیا اور صرف اتنا کہا کہ میں  
 ان سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پتہ چلا کہ یہ وہی صحافی دوست تھے جنہوں نے جمالی صاحب کو وہاں فون  
 کیا تھا۔

جمالی صاحب کو شاید پہلا دھچکا اس وقت لگا ہو گا جب جنرل مشرف کا انہیں یہ پیمانہ ملا ہو گا کہ  
 وہ استغلی دے دیں اور اب انہیں اپنے صحافی دوست کی کال رہا سیر کر کے کہ اس نے رات کا کھانا کینسل  
 کر دیا تھا دوسرا دھچکا لگا تھا۔ انہیں شاید کھلی دھوکہ یا احساس ہوا کہ اب وہ اس ملک کے وزیراعظم نہیں  
 رہے لہذا وہی صحافی دوست جو گفتگو پر اہم مشرک ہوا اس کے ان کردار ہی قہم میں جا رہے تھے کہ وہاں  
 کہ جمالی صاحب مجھے کے لیے جاتے ہیں اب انہیں اپنے گھر کھانا کھانے کے لیے چاہئیں تھے۔ اس  
 صحافی دوست کا پیمانہ جمالی صاحب کے لیے جو واضح تھا کہ اب وہ وزیراعظم نہیں رہے لہذا ایک صحافی  
 صحافی سے ایک صحافی سواک کی توقع رکھیں۔

جمالی صاحب کے ساتھ وہ کھلے طور پر جاس میں آ کر نہ کے حد تک سیر کرتا تھا اور  
 چہرہ کرنا کتنی مسلم ایک نواز کے لیزر ٹھہری تھو کے بیٹے کے لیے کہ وہ کبھی نہ کھائے اور کبھی  
 کھانے سے مذاقت ہوئی یہ وہی سہولت تھی جنہوں نے آج رات سوتے ہوئے جمالی صاحب کو  
 کھانے پر بلا دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ صاحب آپ دھوکہ کھانے سے تو آج رات جمالی











تادم، جمالی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے ایک طبقہ میں گویا کوئی نیا طبقہ پیدا ہو رہا ہے۔ وہ تو آج بھی حجاز شریف کو آج اس کے لیے چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ان کو اپنی زندگی میں بہت سارے بار دیکھے ہیں۔ آج بھی اپنی پارٹی کے سربراہوں کو اس کے لیے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے حجاز شریف کو اس کے لیے چاہتا ہے۔ ان میں کوئی نئی بات ہو گئی تھی۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب اب جب آپ اور ذرا عظیم نہیں رہتے تو آپ کو ہاتھوں میں لیں۔ وہ لے کر ان کے پاس ہاتھیں کر کے کوئی چیز نہیں لیں یہ موقع مناسب نہیں تھا۔ ایک دن سب لوگوں کو ذرا عظیم ہاؤس سے بلے جانا ہوا ہے اور وہاں بیٹھے ہوئے شخص کو اس بات کے لیے چاروں طرف دیکھا۔

میں نے عرض کیا کہ جمالی صاحب ابھی بھی ایک سانس کی حالت میں تھے اور اپنی زندگی کے ان سب سے اچھے اچھے سال کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ ذرا عظیم ہاؤس میں گزارے تھے کوئی بات کرنے کو چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب آپ نے اشعلی اسپتال سے نکل کر ایک رات پہلے اپنے ایک بلی والی اور وہاں میں یہ کہا تھا کہ آپ اشعلی نہیں دیکھ گئے۔ وہ لے کر میں آپ کو بلی سمیٹنے کی سے لگا رہا ہوں کیا اس واقعہ کو آپ نے اشعلی اسپتال میں لایا ہائے گا۔ انہوں نے جو کوئی کہا تو وہ جانتے تھے کہ ان وقت تک ان سے کسی نے اشعلی اسپتال کی بات نہیں کی تھی۔ انہیں 28 جون 2004ء کو ان صوبہ ملاوٹ گیا وہاں ہائے سے نکلے انہوں نے قرآن پاک پڑھا اور دعا سے دعا کی کہ وہ انہیں جگہ پہنچانے کی بات سے بچائے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ کسی طرح ملک کا چھوٹی حکام پہنچا رہے اور اسے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنے اشعلی کو ذاتی اٹا کا حصہ نہیں دانا چاہتے تھے کیونکہ داخل میں بھی بہت سارے وزراء، عظیم کو اس دور کے صدر دس میں کرتے رہے تھے تو سب وزراء عظیم ہاؤس میں گئے جہاں بلی بھی کالونی انہیں لای تھیں لیکن نتیجہ یہ کہ حاصل نہیں ہوا۔

جمالی صاحب بولتے رہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر میں سب سے بگڑا ہوا ٹکڑا کھینچا اور اقتدار میں آتے اور ہاتھ دیکھا تو انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اب کی دفعہ اگر ایک اور سیاسی حکمت عملی کے فیصلے وضوح کی وجہ سے اس میں ہو گئی تو شاید اس سے کسی کا بھی بھلا نہ ہوگا۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب تادم یا کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے کسی سرٹ پرائیڈ کی شکل میں کسے کو دیا ہے۔

جمالی صاحب نے انتہائی مہذبانہ انداز میں جواب دیا کہ سب ان طرح کی کوئی سرٹ کال جی ہوتی ہے تو نتیجہ ذرا عظیم کے پاس کی آواز آجاتے ہیں۔ ان کے پاس چھوٹے چھوٹے لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے کہ اس پارٹنر کو کس طرح میں کسی عرصہ میں آج وہاں کی نہیں ہوتی تھی۔ اس پارٹنر نے انہیں ذرا عظیم دیا تھا۔ سب انہیں آج کو ایک سے سارے سے آواز آج دیکھ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ یہ وہی تو وہ پارٹنر کے ہائے یہ آواز دہکا کہ وہ سارا نقصان اپنے سر لے لیں۔

کہانی کی یہ بھی ایک ایک کر کے آواز دہکا شروع ہو گئی تھی لہذا میں سنبھل کر اپنی کرسی پر بیٹھا گیا۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب آپ کے اور یہ وہی پوجا الٹی کے تعلق کب اور کہاں صاحب ہوا شروع ہوئے تو وہ بولے کہ ورائل وہ لیبل صاحب حیات کی رحمت پر انہیں انہیں جگہ میں کی تقریبات میں شرکت کرنے پہلے گئے تھے۔ یہ کہانی یہ وہی پوجا الٹی کو بہت ہی تھی۔ یہ سب بات تھی کہ یہ وہی پوجا الٹی یہ بات نہیں کہے کہ ایک ذرا عظیم بولنے کے لئے انہوں نے کہا ہے انہوں نے انہوں کی درخواست کو نظر انداز کرتے۔

جمالی صاحب نے کہا کہ اب انہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی الٹی اور دیگر عاصیوں اس بات پر ان سے ورائل ہو گئے تھے کہ وہ لیبل صاحب حیات کے شریک بن گئے تھے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب انہوں نے کہا کہ آپ کو کسی کی سرٹ پرائیڈ اور انہوں نے کہا کہ انہوں نے کہا کہ انہیں ذرا عظیم میں ہائیں گے۔ وہ لے کر انہیں انہوں نے کہا کہ انہیں ذرا عظیم بننے کا عزم نہیں تھا لیکن اس پہلے سے انہیں کوئی ضرور ہوئی تھی۔

جمالی صاحب بولتے رہے کہ ان کی پارٹی ان کی کارکردگی سے لڑا نہیں تھی۔ یہ وہی انہوں نے انہیں یہ بات بتائی کہ یہ کہ پارٹی ان سے لڑا نہیں تھی لہذا انہیں ہے انہیں ذرا عظیم ہاؤس سے ہاؤس ڈاؤن سب ایک دوسرے پارٹی نے لیبل کر لیا تھا تو پھر جمالی صاحب کے پاس ذرا عظیم ہاؤس میں رہنے کا کوئی عزم نہیں رہتا تھا۔ تادم، انہیں اس بات کا احساس ضرور تھا کہ اگر اس مشکل وقت میں یہ وہی















پہلی بات تو یہ تھی کہ شوکت مری کا اپنے آپ کو ایک سے ایم این ای سے منتخب کرنا کہنا عام  
بننے کا فیصلہ تھا۔ اگر شوکت مری کو بیٹھی پائی تھی تو جمالی صاحب کے بقول وہ اپنی بیٹھی سے  
لیے جالی کر دیتے۔

دوسری جہاں انہوں نے یہ بتائی کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شوکت مری پر قاضی صاحب نے  
سیاسی فائدہ کس کو ہونا تھا۔ ان کے بقول یہ بہت اہم سوال تھا جس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے انہوں نے کہا کہ بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شوکت مری جالی اور اولوں اور پتہ  
کا تو رگڑوں کا لڑاکا ہے لہذا اس لیے بھی اس پر غور کیا گیا۔

چوتھی بات تو یہ تھی کہ شوکت مری جس کا اپنا کوئی سیاسی بیک گراؤ نہیں تھا وہ ان تمام برسوں میں  
جنرل مشرف کے بہت قریب رہا تھا۔

پانچویں بات تو یہ تھی کہ بہت سارے پارٹی کے ایم این ای شوکت مری کے ذہن پر عظیم بیٹے پر بزرگ  
نظر نہیں تھے۔ اگرچہ وہ اس لحاظ پر غامض رہے لیکن انہیں یہ فیصلہ پڑا کہ انہیں تھا۔

آخری بات تو یہ تھی کہ شوکت مری کو وزیراعظم ہاؤس کے انہیں پھر انٹیشن آنا ایک بہت بڑا  
نظر تھا کیونکہ ان کو ہاؤس بہت سارے نظرات کے سامنے آکر آیا گیا اور ان پر کافی دھیماں لگانے  
کی ایک کڑی تھی۔ ان کے بقول جب پارٹی کسی کو ہاؤس منسٹر کے عہدے کے لیے ہاؤس کرتی ہے تو اس  
وقت وہی لٹاؤ اعلیٰ تک ہوتی ہے اور پوری کی پوری پارٹی اس وزیراعظم کے پیچھے پوری قوت سے  
کھڑی ہوتی ہے۔ شوکت مری کو پارٹی نے وزیراعظم ہاؤس نہیں کیا تھا لہذا ان کے پاس پارٹی کی کوئی  
طاقت نہیں تھی۔

آخر میں جمالی صاحب نے کہا کہ محض چند نوجوان ایم این ای کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کی  
بہت لٹاؤ شپ اور اس کے اگلے اگلے نہیں گئی تھی۔ انتہائی ریلوں میں انہوں نے پارٹی کے کسی اہم رہنما کو  
وہاں نہیں رکھا۔ جمالی کے بقول یہ بھی ممکن تھا کہ چند طاقتور نوجوان جو وہ جمہوری نظام کے خلاف تھے  
لہذا انہوں نے شوکت مری پر غور کیا کہ جنرل مشرف کو یہ نظام پیچھے کی کوشش کی ہو۔

میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جمالی صاحب پر پوری شامیت پر تو بہت بار اصرار ہے لیکن وہ  
شوکت مری کی قریب نہیں کہنے اور وہاں میں اپنے نہیں لکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شوکت مری

بہت قابل آدمی ہیں اور آئے ہالے دنوں میں اس ملک کو نئے نئے طریقے سے چلانے کے کام  
انہوں نے یہ بات ضرور کہی کہ شوکت مری کو سیاسی طور پر بہت جلد چھٹی کا مظاہرہ کرنا ہوگا تاکہ وہ ان  
قوتوں سے بہت کچھ جنیوں نے ان کے خلاف سازشیں کر کے انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے ہٹا  
تھا۔ جمالی صاحب کے بقول شوکت مری باقی تمام مخالفوں پر کامیاب رہیں گے لیکن سیاسی مخالفین  
شہید شہدات کا ہتھیار کر سکتا تھا۔

جمالی صاحب نے نام تو نہیں لیا لیکن ان کا واضح اشارہ پوری شامیت میں پوری شامیت  
اپنی اور وہاں اختر کی طرف تھا جنہوں نے جمالی کو سیاسی طور پر اتنا تھکا دیا کہ وہ کبھی کبھی ان پر  
درا گیا کہ کیا تو جمالی صاحب کو انہوں میں شامیت دیکھ کر جانا پڑا۔

ہام، بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ شوکت مری جیسے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا  
جمالی صاحب جیسے بچوں سے زیادہ سیاست کرنے کے لیے اور جمالی مسلم لیگ سے بھر  
پڑا تھا ان بہت بڑے اور انہوں نے 15 نومبر 2007 تک جب انہوں نے وزارت عظمیٰ چھڑی تو  
پوری شامیت، وہاں اختر، پوری شامیت اور دیگر کو اپنے خلاف ایک ہی سازش نہیں کرتے تھے اور  
کے حصر سے اتنے وقت پورا کیا۔ شوکت مری نے یہ ثابت کیا کہ وہ جمالی صاحب سے بڑا گرا  
پڑا تھا جسے اور انہیں پتہ تھا کہ پنجاب کے ان تین اہل شامیت پوری شامیت اور پوری شامیت  
کیے تھے تھا۔

ان دنوں جمالی صاحب کے چلے فرج جمالی کے خلاف کرپشن کی بہت کہانیاں چھپ رہی  
تھیں۔ جب میں نے یہ بات پڑھی تو انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ  
انہوں نے ان کے اس بیمار چلے کو بھی نہیں لکھا جو کتنے سالوں سے اس کی اور بات ہرگز ہے۔

جمالی صاحب کو پتہ نہیں کیا یا آ کر وہ بڑے جنرل شہداء اعلیٰ انٹرنیٹ کا بیڑے کے داروں کے  
نامہ بھڑکی پھانسی پر ہاتھ پیرتے تھے۔ ایک رات 1988ء کی ایک کا بیڑے ہانگ کے داروں انہوں  
سے جنرل شہداء سے بھڑکی پھانسی کا معاملہ دیکھ کر شروع کیا۔ جمالی جنرل شہداء سے بڑا بھنا ہوا  
رہے تھے کہ انہوں نے اور رات کیسے گزار دی تھی اس رات ان کے علم پر انہوں نے رات کی پھانسی دی  
پائی گی۔















سے زیادہ اہم تھا کہ وہ اس وقت سے پہلے جو ہدی نادر علی خان Edli کر رہے تھے وہ ان کے لیے  
کیونکہ میں ایک انٹرویو کرنے کا وقت تھا اور وہ اپنے والد کے شخص کو اس کے انٹرویو کا مسودہ لکھا تھا اور  
میں تھا کہ وہ اپنی اپنی بات سے غمزدہ تھے اور سارا انٹرویو ایک سارا کر رہا ہے۔

میں پاکستان واپس آیا اور ذاتی محنت سے پندرہ گز میں نے 2000 الفالو میٹرو میں انٹرویو  
کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر وہ قائل تھا۔ میری والدہ نے اس نظام آواز میں فہم نہیں دی تھی کہ انٹرویو  
ہو رہے تھے۔ یہ سب تک اس طرح کے جس کے قریب سیاسی یا دفاعی پمپ ہو چکے تھے انہیں بہت  
مشوریت ملی تھی۔

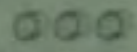
ان پر وہ ٹکڑا چھاپنے کا سارا کر پڑا وی نہ ز کے ایڈیٹر سلیم بخاری اور جنگ گروپ کے  
مالک میر تقی عثمان کو کہا تھا انہوں نے جرنل شرف کے مخالفین جو ہدی نادر علی خان، اسحاق اس  
نور احمد اور سب سے زیادہ جرنل علی قلی خان کے وہ انٹرویو چھاپے تھے جس میں انہوں نے جرنل  
شرف کو بڑے سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان دنوں جرنل شرف ایک طاقتور آرمی ڈیکلیریشن  
ہو چکے تھے اور اپنے آپ کو ہادی صدر بھی منتخب کر چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ جنگ گروپ پر بہت شرہ  
ہو چکا تھا کہ جرنل شرف کے مخالفین کے یہ انٹرویو نہ چھاپے جائیں تاہم سلیم بخاری اور میر تقی عثمان  
تو بہت زیادہ کے باوجود انہیں چھاپ رہے تھے۔

مجھے اس وقت یہ انٹرویو لکھا گیا کہ اب میر تقی عثمان نے نواز شریف کا یہ سہ کیا گیا ہے  
انہوں نے اپنے سہ لکھا کہ یہ ان وقت تک سلیم بخاری صاحب جا چکے تھے اگر نہ مجھے پتہ ہے کہ ان  
کے انٹرویو ہو چکا کہ وہ میر تقی عثمان کے انٹرویو کی چھاپے پر رستہ آسان کر لیتے۔

میر تقی عثمان کے اسٹیل ڈیکلریشن کے بعد ان کے یہ انٹرویو چھاپے جانے لگے۔ ایک دن  
مجھے یہ پتہ چلا کہ ایک دن میر تقی عثمان نے ایک ایسے شخص کا انٹرویو کیا تھا  
جو ان کے لیے جس شخص نے ان کا انٹرویو کیا تھا وہ سب سے پہلے ان کے انٹرویو کے سہ لکھا کہ  
نواز شریف کی تھی۔

یہ کتاب کی انٹرویو چھاپنے کے بعد میر تقی عثمان کی تھی۔

میں نے اپنے گروپ سے صرف انٹرویو کے لیے ہی ان کا انٹرویو کیا اور وہ انٹرویو چھاپ رہا تھا۔  
جو چھاپنے کے بعد انہیں اس کی کاپی میر تقی عثمان کو بھیج دی گئی۔ ان کی کاپی کے ساتھ ان کے انٹرویو کے سہ لکھا کہ  
ایک طرح کی بات لکھتے ہوئے وہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ  
تو ان کے سہ لکھا کہ اس طرح کا ایک انٹرویو چھاپ رہا ہے۔ کبھی صاحب نے ان کی باتوں میں انٹرویو  
پانچ شروع کیا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ مجھے انٹرویو کا انٹرویو چھاپ رہے ہیں۔ میں نے انٹرویو  
پانچ میں چھاپوں گا اور اس کی ایک کاپی میر تقی عثمان کو بھیج دیں گی۔ یہ وہی شخص تھی جسے میں  
اپنے دور افتادہ میں نواز شریف نے رات کو لاہور میں واقع ان کے گھر سے ٹیلی فون پر بلجی کے وقت  
بھرا کر لایا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے ایک انٹرویو کے سہ لکھا کہ پاکستان  
بڑی تیزی سے ایک ناکام ہدایت کا نشانہ بن کر رہا ہے۔ یہ ٹیکہ کہانی ہے کہ ان دنوں نواز شریف  
صاحب بھی ہدایت خود بڑی روانی سے اپنی تقریروں میں کرتے تھے کہ پاکستان کو ناکام ہدایت ہلانے  
میں فریبوں اور فوجی حکومتوں کا کتنا بڑا رول ہے۔ اگرچہ یہاں نواز شریف کا وہ انٹرویو لکھا گیا ہے  
میں یہ پتہ لگ گیا کہ ان کی وجہ سے اسے اچھا خاصا Edli کیا گیا تھا۔ ہم انٹرویو کے نوہم سورت  
تھاری اجازت سے اسے اس طرح Edli کیا کہ اس میں یہاں صاحب کی انٹرویو اکثر پمپ  
تھی۔



نواز شریف مجھے اور جو ہدی نادر علی خان کو لے کر سرحد میں واقع اپنا ایک گھر لے کر  
پڑوس پڑوس کے گھر چلے گئے۔ وہ چلے گئے تھے کہ جو ہدی نادر علی خان ان گھروں کے وہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ  
نواز شریف صاحب کے گھر چلے گئے انٹرویو کے سہ لکھا کہ جو ہدی نادر علی خان کے سہ لکھا کہ انٹرویو  
ہو چکا ہے۔

میں نے ایک بات غصے سے کہی کہ نواز شریف انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو  
مجھے پتہ چلا کہ ان کے پاس انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ  
تھی کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ انٹرویو کے سہ لکھا کہ



کراچی و لہور شریف کے باشندوں نے اپنے رشتہ داروں سے اس ملک کا آمدنی ٹیکس کا وقت نکالنا  
میں سے لیا تھا۔ وہ ملک میں جو لوگ اس وقت آکر رہنے آئے تھے وہ وہاں مقیم تھے اور ان کی  
زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے کسی انتظامی امور سے ہرگز کسی کی شہرت ایک ایک  
پاکستان کا گورنر تھا۔ ان دنوں ملک کے دارالحکومت تھے۔

نواز شریف کی باتوں سے گنتا گنتا لوگوں نے اپنے موجودہ حالات اور قسمت سے کھینچ لیا  
تھا۔ وہ اس سے سیر سے اس دن کا اظہار کرتے تھے جس دن وہ وہاں پاکستان میں آئے تھے۔ ان کی باتوں سے  
ان لوگوں کی حالت میں نواز شریف نے خاصا وزن لیا تھا۔ ان لوگوں نے ہل گوانے کے بعد  
نواز شریف سے گفتگو کی تھی۔

پھر سے لیے نواز شریف کی بات یہ تھی کہ نواز شریف میں اب یہ خوبی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ ہم سے ہر  
سوال کا جواب دے اور اس وقت اپنے کے ہاتھ اسے فلسطیانہ انداز میں دے رہے تھے۔ انہیں آفر اپنے  
وائی اور سیاسی انٹرویو کو ایک فلسطیانہ رنگ دینا آئی گیا تھا۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی کہ وہ  
گزشتہ کے ساتھ ساتھ ان کے اندر نیچورلی آئی جا رہی تھی اور ان چار سالوں میں انہوں نے بہت  
سے مشکل سبق سیکھے تھے۔ اب تو وہ اپنی ان تمام فلسطیوں کا اعتراف بھی کرنے پر تیار تھے جن کی وجہ سے  
وہ آج اس حالت میں پہنچے تھے۔ نواز شریف کو یہ بھی پتہ تھا کہ سیکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور وہ اپنی  
ان فلسطیوں سے سیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ان باتوں میں محسوس کیا کہ اگرچہ لوگ ان سے اس وقت بھی ملنے آتے تھے وہ  
اور ہر مقیم تھے آج وہ وہاں اپنی جگہ اپنی زندگی گزار رہے تھے تو بھی لوگ ان سے ملنے  
پاکستان سے آ رہے تھے۔ کام یہ ضرور ہے کہ باطنی کے بارے میں اب نواز شریف کے خوف  
سے ان سے ملنے نہیں آتے تھے۔ کام انہوں نے اپنی اس کی زندگی اور لوگوں کے لئے ان سے  
کچھ کر لیا تھا۔ انہوں نے ہر کے سر اور گلی میں دیکھا کہ وہاں آ کر ہی کیا سکتا ہے۔

ان دنوں کے فلسطیانہ انداز میں نواز شریف کا ایک دن سب کا اقرار سے رخصت ہوا تھا  
یہ کہ وہ ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیان ان سے پہلے گزرتا تھا۔ نواز شریف کی جگہ ان کے جگہ ان  
سے پہلے ان کی جگہ ان کے اقرار سے رخصت ہونے کے بعد نواز شریف کی جگہ ان کی

میں سے ملنے اور ان کی باتوں سے انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے اس ملک کا آمدنی ٹیکس کا وقت نکالنا  
میں سے لیا تھا۔ وہ ملک میں جو لوگ اس وقت آکر رہنے آئے تھے وہ وہاں مقیم تھے اور ان کی  
زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے کسی انتظامی امور سے ہرگز کسی کی شہرت ایک ایک  
پاکستان کا گورنر تھا۔ ان دنوں ملک کے دارالحکومت تھے۔

نواز شریف کی باتوں سے گنتا گنتا لوگوں نے اپنے موجودہ حالات اور قسمت سے کھینچ لیا  
تھا۔ وہ اس سے سیر سے اس دن کا اظہار کرتے تھے جس دن وہ وہاں پاکستان میں آئے تھے۔ ان کی باتوں سے  
ان لوگوں کی حالت میں نواز شریف نے خاصا وزن لیا تھا۔ ان لوگوں نے ہل گوانے کے بعد  
نواز شریف سے گفتگو کی تھی۔

پھر سے لیے نواز شریف کی بات یہ تھی کہ نواز شریف میں اب یہ خوبی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ ہم سے ہر  
سوال کا جواب دے اور اس وقت اپنے کے ہاتھ اسے فلسطیانہ انداز میں دے رہے تھے۔ انہیں آفر اپنے  
وائی اور سیاسی انٹرویو کو ایک فلسطیانہ رنگ دینا آئی گیا تھا۔ میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی کہ وہ  
گزشتہ کے ساتھ ساتھ ان کے اندر نیچورلی آئی جا رہی تھی اور ان چار سالوں میں انہوں نے بہت  
سے مشکل سبق سیکھے تھے۔ اب تو وہ اپنی ان تمام فلسطیوں کا اعتراف بھی کرنے پر تیار تھے جن کی وجہ سے  
وہ آج اس حالت میں پہنچے تھے۔ نواز شریف کو یہ بھی پتہ تھا کہ سیکھنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور وہ اپنی  
ان فلسطیوں سے سیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ان باتوں میں محسوس کیا کہ اگرچہ لوگ ان سے اس وقت بھی ملنے آتے تھے وہ  
اور ہر مقیم تھے آج وہ وہاں اپنی جگہ اپنی زندگی گزار رہے تھے تو بھی لوگ ان سے ملنے  
پاکستان سے آ رہے تھے۔ کام یہ ضرور ہے کہ باطنی کے بارے میں اب نواز شریف کے خوف  
سے ان سے ملنے نہیں آتے تھے۔ کام انہوں نے اپنی اس کی زندگی اور لوگوں کے لئے ان سے  
کچھ کر لیا تھا۔ انہوں نے ہر کے سر اور گلی میں دیکھا کہ وہاں آ کر ہی کیا سکتا ہے۔

ان دنوں کے فلسطیانہ انداز میں نواز شریف کا ایک دن سب کا اقرار سے رخصت ہوا تھا  
یہ کہ وہ ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیان ان سے پہلے گزرتا تھا۔ نواز شریف کی جگہ ان کے جگہ ان  
سے پہلے ان کی جگہ ان کے اقرار سے رخصت ہونے کے بعد نواز شریف کی جگہ ان کی

میں سے ملنے اور ان کی باتوں سے انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے اس ملک کا آمدنی ٹیکس کا وقت نکالنا  
میں سے لیا تھا۔ وہ ملک میں جو لوگ اس وقت آکر رہنے آئے تھے وہ وہاں مقیم تھے اور ان کی  
زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کے کسی انتظامی امور سے ہرگز کسی کی شہرت ایک ایک  
پاکستان کا گورنر تھا۔ ان دنوں ملک کے دارالحکومت تھے۔



ب اور شریف کا یہ خیال تھا کہ تاخیر بہتر ہے۔ جنرل شرف سے اس کی بات کر لی گئی۔  
ب ایک ہی خط پر ہوا۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ جنرل شرف سے اس کی بات کر لی گئی۔

ب اور شریف کا یہ خیال تھا کہ تاخیر بہتر ہے۔ جنرل شریف سے اس کی بات کر لی گئی۔  
ب اور شریف کے درمیان اتنی ہی بات ہوئی ہے۔ جب جو بھی چیز جنرل شریف سے  
اس آواز کرنے کی کوشش کرنے کا وہ اپنے لیے خود سمیت کھڑی کرے گا۔

ب سے اور شریف پاکستان سے آئے تھے کیا جنرل شرف نے ان سے ایک ہی بات کرنے  
کے لیے بلایا تھا۔

اپنی بات میں وہ ان سے بات کرنے کے لیے اور شریف نے مجھے بتایا کہ لاہور کے ایک دوست  
انہاری گروپ کے مالک ان کا شمار ہوا۔ وقت کے مجھ دکھائی صاحب کی طرف تھا جنرل شرف  
کی ایک آواز کرنے کے ہاں آئے تھے۔ جنرل شرف یہ ہاتھ تھے کہ شہزاد شریف 2002ء کے

انہیں کے بعد پاکستان آئی اور پاکستان مسلم لیگ کی قیادت کریں۔ تاہم، نو اور شریف نے جنرل  
شرف کے ساتھ کسی بھی قسم کی بات کرنے سے انکار کر دیا۔ بقول نو اور شریف کے اگر وہ ہاتھ تو وہ  
یہ تمہیں اور پاکستان دکھانے تھے۔ اس کے لیے انہیں مصلحتا کرنا تھا کہ وہ جنرل شرف کو اپنی

سیست پاکستان کا مدد دینے لیتے ہیں نو اور شریف پاکستانی 11 اور ان کا یہ بہت کرنا ہوا ہے کہ  
ان کو اپنی بات سے ان کا برقی اور اس وقت نہیں تھا۔ وہ کی برسوں تک بہت دیکھنے کو چاہتے تھے جنرل  
شرف سے اس کے پاکستان کو لے کر آتا ہے۔ نو اور کا خیال تھا کہ اب وقت آ گیا تھا کہ پاکستان

پاکستان کی انہیں کے ہاتھ کو لے کر آتا ہے کہ وہ ایک پاکستانی کو بھی لے کر آئے  
تھے۔ ان کے خیال میں اب کی نہ کی انہیں کے ہاتھ ان کے خلاف حرکت کرنا ہے  
کی سزا ہے۔ یہ لے کر آئے انہیں کے ہاتھ سے اس کی بات ہے۔ یہ ہی سزا ہے انہیں کے ہاتھ سے

انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے  
انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے انہیں کے ہاتھ سے

نو اور کا خیال تھا کہ اب یہ تاخیر بہتر ہے۔ جنرل شریف سے اس کی بات کر لی گئی۔  
ب اور شریف کے درمیان اتنی ہی بات ہوئی ہے۔ جب جو بھی چیز جنرل شریف سے

اس آواز کرنے کی کوشش کرنے کا وہ اپنے لیے خود سمیت کھڑی کرے گا۔  
ب سے اور شریف پاکستان سے آئے تھے کیا جنرل شرف نے ان سے ایک ہی بات کرنے

کے لیے بلایا تھا۔  
اپنی بات میں وہ ان سے بات کرنے کے لیے اور شریف نے مجھے بتایا کہ لاہور کے ایک دوست

انہوں نے اپنی حکومت اس میں کرنے کے بعد سب سے زیادہ اس پر دیکھا تھا کہ پاکستان کی حکومت کو  
اس وقت تک نہیں ہو گا۔ جب تک جمہوریت اور آف لا اور آئی رات اختیار نہیں کیا ہوا۔  
نو اور شریف صاحب کے منہ سے رول آف لا کی بات سن کر مجھے بڑا ایک برکھا لگا جس میں

نے اپنے آپ کو سنبھالا اور توجہ سے ان کی بات سننے لگا۔  
وہ مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اور اور اس میں اس سے میں دیکھا تھا وہ تھا کہ کسی ایک  
میں اور اس سے چاہ کر کے اس سے نہیں لینی چاہیے کیونکہ صرف اور سے ہی ملک کو سنبھال کر رکھنے کے

کہہ لوگ۔  
اپنی بات میں وہ ان سے بات کرنے کے لیے اور شریف نے مجھے بتایا کہ لاہور کے ایک دوست  
انہوں نے اپنی حکومت اس میں کرنے کے بعد سب سے زیادہ اس پر دیکھا تھا کہ پاکستان کی حکومت کو

اس وقت تک نہیں ہو گا۔ جب تک جمہوریت اور آف لا اور آئی رات اختیار نہیں کیا ہوا۔  
نو اور شریف صاحب کے منہ سے رول آف لا کی بات سن کر مجھے بڑا ایک برکھا لگا جس میں  
نے اپنے آپ کو سنبھالا اور توجہ سے ان کی بات سننے لگا۔  
وہ مجھے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اور اور اس میں اس سے میں دیکھا تھا وہ تھا کہ کسی ایک

میں اور اس سے چاہ کر کے اس سے نہیں لینی چاہیے کیونکہ صرف اور سے ہی ملک کو سنبھال کر رکھنے کے  
کہہ لوگ۔  
اپنی بات میں وہ ان سے بات کرنے کے لیے اور شریف نے مجھے بتایا کہ لاہور کے ایک دوست  
انہوں نے اپنی حکومت اس میں کرنے کے بعد سب سے زیادہ اس پر دیکھا تھا کہ پاکستان کی حکومت کو



لیڈروں سے متاثر ہونے بغیر چند گئے جب ان سب نے ایک زبان میں یہ کہا کہ 1947ء سے  
اب تک بھارت کی سب سے بڑی کامیابی جمہوریت تھی۔

کسی ایک بھی بھارتی وزیراعظم نے یہ نہیں کہا کہ بھارتی اکادمی یا اس کی فنی طاقتوں  
پہاں برسوں میں ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

نواز نے کہا کہ لادھی ٹیل کی اس کال کو فنی میں جینہ کر انہوں نے اس گھنگو سے ایک ہی تیر  
1947ء کی قوموں کی تحریک میں جمہوریت سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ جمہوریت کے بعد ہی کسی بھی ملک  
اور قوم کو دیگر کامیابیاں ملتی ہیں۔ نواز شریف نے کہا کہ جب انہوں نے سابق بھارتی وزیراعظم کو یہ  
کہنے سنا کہ ان پہاں برسوں میں جمہوریت ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے اچھا کہا ہے  
آپ کو شہید شرمندہ محسوس کیا کہ ہم بھارتوں کی طرح بی بی سی پر ڈنڈہ کر چوری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ نہیں  
کر سکتے تھے جو ان پر سابق بھارتی وزیراعظم نے کیا تھا۔

میں اب بات کو اصل موضوع کی طرف لانا چاہ رہا تھا۔ یہ امر ادھر کی باتیں صرف اس لیے کی  
تھیں کہ نواز شریف میرے ساتھ اپنے آپ کو بے سکون محسوس کریں اور مجھ سے کھل کر بات کریں۔

مجھے پتا تھا کہ نواز شریف دو دفعہ وزیراعظم ہونے کی مشہوریت سے بہت سارے اہم فیصلے کرنے  
آئے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ وہ تھا جو 1993ء میں سپریم کورٹ سے اپنی حکومت بحال  
ہونے کے بارے میں انہوں نے آئینی دعوے کیا تھا ان سے لے لیا گیا تھا۔ اب تک ہمیں پتا تھا کہ ان  
کا اس وقت کے آری ہیٹ ہزل و سہ کا کالے انہیں دھمکیاں دیکر ان سے آئینی لیا تھا۔

اب میں نے نواز شریف سے یہ سوال پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک اور کہانی سنا لی۔ اب نواز  
شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان حکومت بحال ہونے کے بعد بھی مشکلات کم ہونے کے  
بجائے لڑنے لگا تو انہوں نے ہزل کا کالے کو فون کیا کہ وہ آئینی دعوے کیا تھا وہ سہ ہیں کہ ان کے لیے  
غلام اسحاق خان کو صدر کے ساتھ مل کر حکومت چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ اب ہزل کا کالے نواز  
شریف کے سامنے یہ بات کہی تو ایک لمحے کے لیے وہ ششدر رہ گئے اور بڑی جراتی سے نواز شریف  
سے پوچھا کہ آپ کیوں آئینی دعوے کے ساتھ ہم ہزل کا کالے نواز شریف کو اپنی بات ہونے  
ہونے لگا تو وہ نے۔ او کے سوا آپ کبھی اس ملک کے گراں وزیراعظم بن کر نہ لے سکتے تھے ان کا کیا

تھیں نواز شریف نے یہ فریاد نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے ہزل کا کالے کے ساتھ ایک اور فریاد  
رکھی اور یہ ہے کہ ہزل صاحب اس آئینی دعوے کو گھر جا رہا ہوں لیکن وہ مجھ جس کی جہت سے لگا ہوا ہے  
جو ان سے لگا ہوا تھا اسے بھی میرے ساتھ ہی گھر جانا چاہیے۔

ہزل کا کالے نے غلام اسحاق خان کے بارے میں سخت زبان استعمال کیا اور نواز کو یقین دہانہ  
آپ تلی رہیں کہ غلام اسحاق خان کو بھی گھر جانا ہو گا اور اگر انہوں نے حرمت کی تو میں انہیں روکتی  
گھر لے جاؤں گا۔

نواز شریف کو یہ بات پتا نہیں آئی کہ ایک فنی جرنل ایک سو بیسین صدر غلام اسحاق خان کے  
بارے میں اس طرح کی سخت گھنگو کرے چاہے وہ اس وقت ان کا سب سے بڑا سیاسی دشمن ہی کیوں  
نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں کسی کو بھی لوگوں کے دونوں سے منتخب کیے گئے صدر کی بے عزتی کرنے کا  
انتہا نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں یہ فنی لوگ دراصل سو بیسین لیڈروں سے لڑتے کرتے ہیں انہیں ایک  
دوسرے کی بڑی عزت کرتے ہیں چاہے وہ بنا ڈرا ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

دوسری دفعہ وزیراعظم بننے کے بعد نواز شریف نے ایک بڑا فیصلہ کیا جو ہزل جہا گیر کر امت  
سے آئینی لینے کا تھا۔

میرے اسرار پر نواز شریف نے ایک اور ہی کہانی سنا لی۔

اب نواز شریف کو یہ پتا تھا کہ آری ہیٹ نے کھلے عام فیشنل ٹیکورٹی کو ملنے والے کا آئیڈیا ان  
کی حکومت کو دیا تھا تو انہیں شہید ہر فیصلہ آئی۔ ان کے خیال میں ہزل جہا گیر کر امت نے ایک آری ہیٹ  
ہونے کے بارے سے اپنی مدد اور انتہا رات سے لگا دیا تھا اور اب وہ اس قائل نہیں تھے کہ یہاں  
حکومت ان پر حملہ نہ کر سکتی۔ یہ ہزل جہا گیر کر امت کا انتہا نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی بات کرتے۔  
نواز شریف کو محسوس ہوا کہ جہا گیر کر امت نے ایک بیان دیکر ان کی وزیراعظم کی مشہوریت سے ساری  
انہی ایک لمحے میں ختم کر دی تھی۔ اب نواز شریف کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک سیاسی  
حکومت کے ہیٹ ایگزیکٹو ہونے کے آئینی اقتدار کو سونپیں اور اس ایک بیان سے انتہا رات  
کے دوران میں گرا پڑے ہوتی تھی اسے درست کریں۔ نواز شریف نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ہزل جہا گیر  
کر امت کو ڈاکر نہیں بنا سکتے تھے کہ انہوں نے ایک لگا کر حکومت کی تھی اور اب اس کی انہیں جہت پکا



پڑے گی۔

جنرل جہانگیر کرامت کو پرائم مشنر ہاؤس بلایا گیا اور نواز شریف نے انہیں یہ سے واضح انھوں میں بتایا کہ پاکستان کے وزیر اعظم ہونے کے ناطے ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ ان کا آری ڈیف اس طرح کے سیاسی بیانات داتے۔

جب جنرل جہانگیر کرامت نے نواز شریف کو اس موڈ میں دیکھا تو اچانک انہیں احساس ہوا کہ واقعی انہوں نے ایک سیاسی بیان دے کر ایک شدید غلطی کی تھی۔ چنانچہ نواز شریف نے بغیر وقت ضائع کیے جنرل صاحب سے کہا کہ ابتر ہو گا کہ آپ شام تک اپنا استعفیٰ بھیج دیں۔

نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب آگے سے جنرل جہانگیر کرامت نے بغیر بحث و مباحثہ کیے یہ کہا کہ وہ شام تک اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیں گے۔

جہانگیر کرامت اپنی بات کے پنے نکلے اور شام کو ذی آئی ایس آئی رہا جسیم ان کا استعفیٰ لے کر نواز شریف کو دے آئے۔

یہ ساری کہانی سننے ہوئے میں نے نواز شریف سے کہا کہ تو پھر آپ نے یہ طریقہ جنرل شریف کے ساتھ کس نہیں اختیار کیا۔ جہانگیر کرامت کی طرف آپ انہیں بھی اپنے ہتھیار تے اور انہیں کاہکی کے سامنے ہر وہ جواب کر کے ان سے استعفیٰ طلب کرتے۔ انہیں اس میں کرنے کے لیے آگاہ کیا پھر پھانسی کی پادھروست تھی۔

نواز شریف نے میری طرف فور سے دیکھا۔ وہ تھوڑی چہرہ ہے۔ وہ تو اب مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ میں شاید جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل شریف کی موجودگی کا ایک دوسرے سے موازنہ کر کے ان سے یہ سوال پوچھا ہوں گا۔

ان نواز شریف نے اسے کہہ سائل وہ لائف ہاؤس میں وہ لائف آری تھامس کے نامواری کر رہے تھے اور وہاں کے لیے لائف سٹریٹ کی ضرورت تھی۔ یہی وہ تھی کہ انہوں نے وہاں کو رہنے لائف اور اس میں آئی کر لے کی کوٹھلی کی۔

تاہم، مجھے نواز شریف کے اس فیئر مٹھن جواب سے پتا چلا کہ وہ انہوں نے جنرل شریف کو اس میں کرنے کا ایسا اچھا ہی ہندی میں کیا تھا جس کی ان کے پاس کوئی توقع نہیں تھی۔ یہی وہ

تھی جنرل شریف کے کیس میں وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکے جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے میں حاصل کیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک جنرل علی قلی خان سے لیے کے اعتراب میں پوچھی گئی ایک بات یہ آئی تھی جس کے جواب میں علی قلی نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ جنرل شریف جہانگیر کرامت کی جگہ آری ڈیف بننے کے لیے نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے تھے۔ علی قلی خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری نے انہیں یہ کہا تھا کہ اگر وہ آری ڈیف بننا چاہتے تھے تو پھر ساہوکارانی میں ساہوکارانہ کپڑے پہن کر وزیر اعظم سے خفیہ ملاقات کر لیں۔ تاہم، جنرل علی قلی خان نے ان شراکتہ دار نواز شریف سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور یوں وہ آری ڈیف نہیں بن سکے۔

نواز شریف نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کسی جنرل شریف سے خفیہ طور پر نہیں ملے تھے۔ تاہم، انہوں نے کہا کہ جنرل شریف کو آری ڈیف بنانے کے پیچھے اور بہت ساری وجوہات تھیں۔ جنرل علی قلی خان کو اس لیے آری ڈیف نہیں دیا تھا کہ ان کے بارے میں انہیں پتہ نہ تھی تھی کہ جب ان تک جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی بات پہنچی تو انہوں نے اس پر 22 اکتوبر 2001 کو غائب کیا تھا۔ جنسی میں بھی جنرل علی کے خلاف کچھ اس طرح کی رپورٹیں ان کے پاس تھیں۔ حاصل کو یہ وجوہات خان اور سیف اللہ لکھنوی کا رشتہ دار ہونا بھی جنرل علی قلی کے خلاف پوچھا اس وقت وہ آری ڈیف بننے میں پھانس لینے کو چاہتے تھے۔ علی قلی خان کو آری ڈیف بنانے کے لیے انہیں انہوں کی ایک تھی۔ یہاں سے وہ انہوں کو بھڑکانے لگے۔

نواز شریف نے اس بات کو بھی انکشاف کیا کہ گورنر ایچ بی خان جو اس وقت ان کے گورنر تھے اور علی قلی خان کے بھائی بھی تھے انہوں نے بھی انہیں آری ڈیف بنانے کے لیے کوئی ایک سنگ کی تھی۔

جب نواز شریف کے ذہن میں یہ بات چلائی گئی کہ جنرل علی قلی خان کو آری ڈیف بنانے سے ان کی حکومت پہلے یہاں اعتراضات میں گھری رہے گی تو ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ جنرل جہانگیر کرامت کو آری ڈیف بناتے۔

میں نے یہاں صاحب سے پوچھا کہ جنرل جہانگیر شریف کو آری ڈیف بنانے کی سزا نہیں







کے ان جرنیلوں کا نہیں تھا جنہوں نے کارگل کی پہاڑیوں پر یہ سارا کھیل کھیلا تھا جس میں اب تک بھی  
جزیرہ پاکستانی فوجی بے گور و کھن مارے گئے تھے۔ یہ دراصل اس ملک کی فوج کی عزت اور اہمیت کا مسئلہ تھا  
جسے اس وقت بچانا ضروری تھا۔

ان اپنی فوج کی عزت بچانے کے نام پر نواز شریف نے فوری طور پر 4 جولائی 1999ء کو  
امر یکہ ہائے کابینہ کیا۔ جنرل مشرف انہیں اسلام آباد ویزیت رٹ پر غدا صاف کھنے کے لیے آئے۔ اس  
کے بعد 4 جولائی کو امریکہ میں 111 افراد سب کے سامنے تھا۔ واپسائی کو بڑی مشکل سے ملی کسٹن نے  
بیز فائر پر ماضی کیا۔

اب اس ایک گروڈنڈ میں جب نواز شریف کو یہ اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ جنرل مشرف اور  
ان کے بریل اپنی سرکاری اور فوجی محفلوں میں کارگل جنگ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا رہے تھے اور یہ دوسرے کیے  
ہا رہے تھے کہ وہ اگر امریکہ ہا کر بیز فائر نہ کراتے تو شاید ہماری فوجی بھارتی کشمیر پر قبضہ کر لیتی تو انہیں  
شدید فضا آیا۔

نواز شریف اب مزید ان دردی والوں کی دھوکہ بازی اور چالوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔  
انہوں نے بغیر راج کی پروا کیے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات  
رہنمائی تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ پھر بھی انہوں نے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے  
سے پہلے اس وقت وزیر اعظم ہاؤس میں موجود اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری ثار علی خان سے  
مشورہ کیوں نہیں کیا تھا تو نواز شریف نے میری طرف دیکھ کر بڑے ہنست لہجے میں کہا کہ جناب اس  
وقت شہباز یا ثار سے مشورہ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے  
وہ کچھ کیا جو ان کے خیال میں اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں  
نے شہباز اور ثار سے بات کی تو شاید وہ انہیں روکنے کی کوشش کریں اور اس دفعہ انہوں نے رکن نہیں تھا  
کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

میں نے نواز شریف سے کہا کہ آپ پر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو  
بھی مدد آئے یا آرمی چیف، آپ کی اس سے ضرور لڑائی ہوتی ہے۔

میری بات سن کر وہ بولے کہ آپ بالکل درست بات کہہ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد لیڈر  
ہیں جنہوں نے بیٹھ ان آرمی چیف کے ساتھ ٹکری جو اپنے قانونی اور آئینی دائرے میں رہنے کے  
بجائے اس ملک کے سکران بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد آرمی چیف کو سوپریمن حکومت کی  
رہت میں لانا تھا۔ آرمی کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ ملک پر نگرانی کرنا۔

نواز شریف کے من سے فوجی جرنیلوں اور آرمی چیف کے خلاف سخت کھٹک میں کر میں نے کہا  
کہ سہرا آپ تو خود بھی ایک آرمی ڈیکٹیٹر جنرل ضیاء کی بیٹا اور تھے۔ میری بات کا برا ماننے بغیر  
نواز شریف نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے لیکن اس کے پیچھے 111 بات ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نواز شریف اس بات پر معذرت خواہ نہیں تھے کہ آج اب وہ بھارت  
سے ٹیپہن بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے آرمی جرنیلوں کے سیاسی کردار کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے  
تھے تو ماضی میں وہ خود بھی جنرل ضیاء کی وجہ سے سیاست میں آئے اور وہیں سے ان کا عروج شروع  
ہوا۔

تاہم نواز شریف نے مجھے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے 111 بات لگائیں۔ پہلی  
بات تو یہ تھی کہ پاکستان پر زیادہ عرصہ فوجی جرنیلوں نے حکومت کی تھی۔ جتنے بھی لوگ سیاست میں آئے  
اس وقت ملک پر مارشل لا تھا۔ وہ کوئی اکیٹیل لیڈر نہیں تھے جو مارشل لا دور میں سیاست میں آئے۔ اگر  
ملک پر فوجی حکومت نہ ہوتی تو یقیناً سیاستدان بغیر فوجی حکمرانوں کی مدد کے سیاست میں آتے۔

نواز شریف نے کہا کہ آپ کم از کم مجھے اس بات کا کریڈٹ تو دیں کہ انہوں نے طاقتور  
ایلیٹمنٹ پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے ان کی کسی بھی  
غیر قانونی حرکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ واحد وزیر اعظم تھے جنہوں نے سوپریمن حکومت کی رت  
کا کم کرنے کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اس بات میں کامیابی ہوئی یا  
نہیں لیکن کم از کم انہوں نے یہ بات تو ثابت کی کہ وہ کسی آرمی جنرل کی سیاسی معاملات میں مداخلت  
مداخلت نہیں کریں گے کیونکہ یہ قانون اور آئین کی خلاف ورزی تھی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ جنرل مشرف اکثر یہ کہتے تھے کہ اگر نواز شریف







نواز شریف نے پورا پاکستان کے ساتھ ساتھ...

پندرہوں اور جنرل شریف نے نواز شریف کو ہتھیار کیا اور اس بات پر جو نواز کا اصرار تھا کہ وہ اپنے والد صاحب کی میت کے ساتھ پاکستان کیس لکھا آئے تھے۔

شرف کے در سے یہ بات سن کر نواز شریف بہت پریشان ہوئے اور انہیں بتایا کہ جیسا آپ کا اپنا بیٹا ہوا سیر ہی انہیں پیسے کر کے گیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں جاسکتے اور اب آپ کا پچھرا ہے جس کیس پاکستان کیس لکھا آئے۔

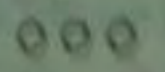
جنرل شریف نے نواز کی یہ بات سن کر اس طرح تاڑ دینے کی کوشش کی جیسے پاکستانی سیر نے انہیں لٹل بیٹھا دیا تھا اور وہ ان کے خلاف شدید ایکشن لینے کے کہ اس نے کیوں لٹل بیٹھا ان تک پہنچا یا تھا۔ جنرل شریف کے بقول وہ دونوں بھائیوں کو پاکستان آنے کی اجازت دینے پر رضامند تھے۔

نواز شریف نے اٹا بھجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ آخر ایک سفیر کی مگر ملک کے صدر اور آرمی چیف کا لٹل بیٹھا ان تک پہنچانے کا اور سب سے بڑا کہ جنرل شریف کے اس فنون کے بعد بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ ان کی کب تک پاکستان واپسی ممکن ہو سکے گی۔ انہوں نے پھر مجھے ایک سیاسی ملازم کے سے الفاظ میں جواب دیا کہ رؤف صاحب اور دکتا ہے میں کل ہی اوت ہاؤں اور مجھے ہاؤں کچھ کر کوئی تیر ان رہ ہائے۔

اس وقت نواز شریف نے پورا پاکستان کے ساتھ ساتھ... اس وقت نواز شریف نے پورا پاکستان کے ساتھ ساتھ... اس وقت نواز شریف نے پورا پاکستان کے ساتھ ساتھ...

رات خاصی دو بجی تھی۔ انٹرویو تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سہو کا سرواٹس چھوڑنے سے پہلے نواز شریف نے مجھے آخری بات کہی کہ کچھ تو بات یاد رکھنا کہ میں کسی وقت بھی پاکستان واپس آؤں گا۔



نواز شریف سے بیان دیا اور اس کے بعد... نواز شریف سے بیان دیا اور اس کے بعد... نواز شریف سے بیان دیا اور اس کے بعد...







میاں صاحب کے ہاں احمد بڑا شور مچا رہا اور کھانے پینے کا دن ہوتا تھا۔ میاں صاحب کے  
شیدائی دور دور کے علاقوں سے ہر قسم کی خوراک لے کر آتے۔ سماجیوں سے لے کر سیاستدانوں اور  
عام لوگوں تک سب پرست کر کھاتے۔ میاں صاحب اکثر ہمارے جیسے مہمانوں کی پیشکشوں میں بھی سے  
ہولیاں اور پانی لاتے دیکھے جاتے۔

بینظیر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ذیل کی باتوں نے اگرچہ نواز شریف سے کچھ  
فاصلہ پارہا کیا ہوا تھا، تاہم میانے سیاستدانوں کی طرف وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کا ذیل کر  
کے پاکستان چلے جانا ہی ان کے سیاسی فائدے میں تھا۔ اگر کل کلاں بینظیر بھٹو اقتدار میں آگئیں تو یقیناً  
وہ طالبان کے بجائے نواز شریف کو اپنا اپوزیشن لیڈر دیکھنا زیادہ پسند کریں گی۔ نواز شریف یکپ کو یہ بھی  
لگتا تھا کہ بی بی کی جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ذیل کا زیادہ فائدہ انہیں ہوگا۔ بدنامی بینظیر بھٹو  
کے حصے میں آئے گی جبکہ وہ بڑے مزے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ذیل نہیں کی  
تھی۔ حالانکہ یہ بات بڑے بڑے حزمے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ذیل نہیں کی تھی۔  
دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں نے 12 اکتوبر کو ایک دوسرے کو ڈس مس کیا تھا۔  
اب نواز شریف اور جنرل مشرف کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ساتھ مل بیٹھتے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل  
مشرف میں بہت ساری چیزیں کاٹن تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان 12 اکتوبر کی طرح  
کے ماضی کی کوئی زنجیر ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔

نواز شریف یکپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک دفعہ بینظیر بھٹو پاکستان چلی گئیں تو پھر انہیں  
روکنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بینظیر سے اپنے سیاسی تعلقات چارٹر آف ڈیموکریسی کی خلاف  
ورزی کرنے کے باوجود ختم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بینظیر بھٹو کی ذیل میں ہی انہیں اپنی سیاسی زندگی نھر  
آنی تھی۔

نواز شریف اس دن بڑے خوش تھے جب 7 اگست 2007ء کو لندن میں آل پارٹیز کانفرنس کا  
انعقاد کیا گیا۔ وہ قلمی جمہوریت میں مجھ سے براہ راست جنرل مشرف کے ہارنے میں ہات کرتے ہوئے  
اور تھا آج پاکستان سے آئے ہوئے امین نسیم، مولانا فضل الرحمن، عمران خان، محمود خان اچکزئی اور  
انکے بڑے بڑے اہلکاروں کے سامنے جس طرح جنرل مشرف کو ذرا ہاتھا پڑا، یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو

رہی تھی۔ جس انداز میں نواز شریف تقریر کر رہے تھے اس سے میرا خیال ہے سب کو یہ اندازہ ہو گیا تھا  
کہ ان گزشتہ برسوں میں ان میں اور کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہیں، تاہم وہ ایک ایسے مقررہ انداز میں کرتے  
تھے۔

اس بات پر لندن میں شرطیں مچی ہوئی تھیں کہ بینظیر بھٹو اسے پی سی میں شریک ہوں گی یا نہیں۔  
مجھے میں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف نے بینظیر بھٹو سے مذاکرات کامیاب کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی  
کہ وہ نواز شریف کے اس سیاسی شو میں نہیں جائیں گی۔ دوسری طرف نواز شریف یکپ کا یہ خیال تھا کہ  
وہ ضرور آئیں گی تاکہ جنرل مشرف پر دباؤ ڈال کر ان سے بہتر ذیل کی جاسکے۔

نواز شریف اور بینظیر بھٹو دونوں ایک دوسرے کو جنرل مشرف کے مارشل لا کے بعد استعمال  
کرتے آئے تھے۔ 10 دسمبر 2000ء کو نواز شریف نے بینظیر کا سیاسی پریشراستعمال کر کے جنرل مشرف  
سے ذیل کر لی تھی۔ جدہ روانگی سے آٹھ دن پہلے ہی نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کے ساتھ  
اسے آروزی مانی تھی۔ بینظیر بھٹو اب وہی کچھ کرنے جا رہی تھیں۔ وہ نواز شریف کے ساتھ اپنے سیاسی  
اتحاد کا پریشراستعمال کر کے جنرل مشرف پر ذیل کران سے بہتر شرائط پر پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ نواز شریف بھی  
شاید اس بات پر چپ تھے کہ چلیں، اس بہانے دونوں کا سکھرا رہا ہو رہا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے جنرل  
مشرف کی قید سے رہائی پانے کے لیے بینظیر بھٹو کے سیاسی پریشراستعمال کیا تھا تو آج بینظیر بھٹو بھی  
ان کا سیاسی دباؤ استعمال کر کے پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ میں دونوں سیاستدانوں کو ایک دوسرے  
سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

اسے پی سی کی کامیابی سے نواز شریف میں ایک نیا اعتماد آیا۔ ان کے اندر جیسے دشمن نے  
انہیں یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اب جنرل مشرف کے لیے انہیں پاکستان آنے سے روکنا بہت مشکل  
ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں یہ باتیں پھیلائی شروع ہو گئیں کہ بینظیر بھٹو بہت جلد انہیں سے پہلے پاکستان  
واپس چلی جائیں گی۔ اس سے نواز شریف یکپ پر اور پریشراستعمال انہیں یہ چھس چھا کر ان کے  
دلوں سے یہ موقع نکل گیا تو پھر کیا پتہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف کے ساتھ مل کر نواز شریف کا راستہ سمجھ  
کرنے کی بجائے ان کا راستہ روکنے پر تیار ہو جائیں اور انکیشن دینے کے بعد ہی نواز شریف کو واپس  
آننے دیا جائے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ نواز شریف کو یہ یقین دلایا جائے گا کہ پاکستان



اب اللہ کے لیے تیار ہے۔ وہ آیت اللہ قمی کی طرح اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اتر کر چہرہ دکھائیں  
میں جنرل مشرف کا تختہ الٹ دین کے۔ لندن میں اپنی ایم ایل نواز کے جس لیڈر سے بھی بات ہوئی وہ  
نواز شریف کے پاکستان واپس آنے کو آیت اللہ قمی کے فرانس سے تہران واپسی کے ساتھ ساتھ  
کرتا۔

20 جولائی 2007ء کے پیریم کورٹ کے فیصلے نے نواز شریف کو مزید پختہ کیا کہ وہ واپس  
جائیں۔ اب جنرل مشرف دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ پیریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار  
چوہدری کو بحال کر دیا تھا۔ پاکستان بدل گیا تھا۔ اب سب سے اچھا موقع تھا کہ اس وقت پاکستان جاپا  
ہائے جب چیف جسٹس بحال ہو چکے تھے اور فیصلہ بھی دے چکے تھے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو  
پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے وطن واپسی کا پورا حق تھا۔ یوں پیریم کورٹ نے وہ ذیل سکریپ کر دی  
تھی جو بقول نواز شریف کے جنرل مشرف اور سعودی بادشاہ کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دن مجھے لندن میں نواز شریف کے ترجمان نادر چوہدری کا فون آیا کہ میاں صاحب اپنی  
پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ میننگ کے بعد ڈورچسٹر ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں  
گے۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی پاکستان روانگی کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔

آخر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ نواز شریف اپنی جلا وطنی ختم کرنے کے بعد اپنے ان نامزد کردہ  
آرمی چیف سے مگر لینے کو تیار ہو جائیں۔

ڈورچسٹر ہوٹل میں قتل دہرنے کی جگہ نہیں تھی۔ پاکستان سے متعدد صحافی وہاں پہنچے ہوئے  
تھے۔ عالی میڈیا بھی اس میں ہاری دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے اس ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی  
تھی۔ مشہور کالم نگار عرفان صدیقی صاحب ایک کونے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے  
مجھے اپنی طرف بلا لیا اور وہیں کھڑے ہوئے کہ توڑی سی جگہ دی۔ تمام کیمرے اور ٹکاڑوں نواز شریف پر  
مرکوز تھیں کہ وہ کب پاکستان واپسی کی تاریخ کا اعلان کریں گے۔ پہلے انہوں نے ایک بیان انگریزی  
میں پڑھا اور پھر انہوں نے اردو میں گفتگو شروع کی۔ نواز شریف نے بتایا کہ وہ 11 دسمبر 2007ء کو  
اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اتریں گے۔ اپنی جلا وطنی ختم کرنے کے لیے نواز شریف نے جو پیش قدمیاں  
لیں وہ سب صحیح تھیں۔ لیکن اپنے آج کے کھڑے رہنے والے عرفان صدیقی صاحب سے کہا کہ یہ کہنا ہے کہ

نہ نہیں تو ایک بات کہوں۔ ہمیشہ بڑی محبت اور پیار سے کھٹکھٹ کرنے والے عرفان صدیقی صاحب نے  
فرمایا کہ ہائیکل ضرور!

میں نے کہا کہ صدیقی صاحب! میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ میاں صاحب جو  
تقریر اس وقت اردو میں کر رہے ہیں وہ آپ نے لکھی ہے۔ آپ سے بہتر اتنی اچھی لکھ اور سیاسی تقریر  
نہایت یہاں پر موجود اور کسی سیاستدان، صحافی یا کالم نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی  
سکرائے اور بولے کہ اگر آپ نے پہچان ہی لیا ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے۔

میاں نواز شریف کے 10 ستمبر کی تاریخ دینے کے ساتھ ہی لندن اور اسلام آباد میں ایک  
یو پیال سا آ گیا تھا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں نے فوراً اس پر رد عمل کا اظہار کیا کہ نواز شریف کو کسی  
صورت پاکستان واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ ایک ذیل کے ذریعے دس سال کے لیے  
پاکستان سے باہر گئے تھے اور مقررہ مدت سے پہلے انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ لندن کے  
مذاقات میں جنرل مشرف کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر نیاز اور شہباز شریف کے درمیان مذاقاتوں کی  
خبریں آنے لگیں۔ سعودی اور لبنانی پیغام رساں نواز شریف سے ملنے لگے لیکن لگتا تھا جس طرح نواز  
شریف نے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا اس پر انہیں سعودی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف نے  
بھی ایک دن یہی بات ہم صحافیوں کو بتائی کہ ان پر سعودی حکومت کا کوئی ہاؤ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے  
جنرل مشرف سے براہ راست کوئی ذیل نہیں کی تھی۔

لندن آئے ہوئے تمام سیاسی لیڈروں کو واپس پاکستان بھیجا گیا کہ وہ جائیں اور نواز شریف  
کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ صحافیوں کی فہرستیں بنا شروع ہو گئیں کہ پاکستان سے کون اور کہاں سے  
آئے گا۔ لندن سے میاں صاحب کے ساتھ کون کون سے صحافی جائیں گے۔ اپنے پروگرام کو خیر رکھنے  
کے لیے جن مختلف ایئر لائنز پر سیٹوں کی بکنگ کرا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف کے سٹاف  
کے لوگ اور مرزا اور محمد افضل اس کام میں ذمہ دار تھے۔ انہوں نے آخری لمحے تک اس بات کی  
ہوا کی کوئی گتھی لگنے دی کہ انہوں نے کوئی ایئر لائن پر کسی کو بکنگ کیا ہو اتنا ان کے صحافیوں سے پوچھ  
اور تحقیقات تھے لیکن مرزا اور افضل نے نواز شریف کے ملاقات میں اس بار کو آخری لمحے تک راز  
رکھا کہ وہ میاں صاحب ہی اپنی اسے ایئر لائن بکنگ ایئر لائن سے جاری کیے۔



پاکستان کی ساری ساری عورتوں کو یہ بتانا چاہیے کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان کو کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اس کتاب میں ان کے حقوق اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کرنیوالی چیزیں بتائی گئی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ان کو اپنی زندگی میں ان کے حقوق کا استعمال کرنے میں مدد ملے گی۔

سوری پر ان کی اسلام آباد آمد نے نواز شریف کو ایک بڑا چیلنج دیا۔ ان کے ساتھ ان کے ہم سفرانوں کو ایک حریف بنا دیا گیا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے درمیان برائی مچ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کی کوئی شہ جیت کر نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے وہاں موجود جس کی ایڈرس بات کرنے کی کوشش کی ان سب کو جمیہہ پایا اور تو اور اپنے دوست پرودا شہید بھی زیادہ بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ نواز شریف بڑی دیر تک ایک کمرے میں بند ہو کر شہباز شریف پرودا شہید اور پارٹی کے دیگر دو تین لوگوں کے ساتھ بی بی دیر تک مشورہ کرنے میں مصروف رہے اور ہم سمجھتی تھیں ان کے دفتر میں چائے بکٹ اور قشیریاں کھاتے رہے۔ خاصی دیر بعد نواز شریف کمرے سے باہر نکلے ان کا چہرہ ایک دفعہ پھر جمیہہ کی میں ڈوبا ہوا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی ایسا اہم فیصلہ کر کے نکلے تھے جس پر انہیں ابھی بھی کچھ شک تھے۔

اس دفتر میں پہلی خوفناک جمیہہ کی نے ہم صحافیوں کو بھی مسکرانا بھلا دیا تھا۔ ہمیں کچھ نہیں آری تھی کہ کل 10 ستمبر کو یہاں صاحب نے پاکستان روانہ ہونا تھا اور آج 9 ستمبر کو وہ ایمر جنسی میں پریس کانفرنس بنا کر بات چیت کرنا چاہ رہے تھے۔

کیا نواز شریف سعودی شہزادے کے پاکستان آنے کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کرنے والے تھے۔ یہ سوال ہم سب صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ نواز شریف اب پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔ شہباز شریف بھی ان کے ساتھ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ کیا دونوں بھائی یہ انور اکریختے تھے کہ وہ ایک دفعہ پھر گرفتار کر کے ہندو لے جائے جائیں جہاں سے بڑی مشکل

پاکستان کی ساری ساری عورتوں کو یہ بتانا چاہیے کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان کو کس طرح حاصل کرنا ہے۔ اس کتاب میں ان کے حقوق اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کرنیوالی چیزیں بتائی گئی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ان کو اپنی زندگی میں ان کے حقوق کا استعمال کرنے میں مدد ملے گی۔

یہ سب کا خیال تھا کہ نواز شریف ایک بہت زیادہ سیاسی ذہن تھے۔ نواز شریف Do or die کی سیاست کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اب چاہے پاکستان سے دور جے میں اس اپنی سیاسی خود کشی نظر آ رہی تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ان دنوں کو ابھی پر گرفتار کر کے ہندو بھیجا گیا تو کیا ہوگا۔ میں نواز شریف کے دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر میں پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ اسلام آباد سے آنے والے دن نواز شریف کو ایک ایسی سی حالت کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا احساس انہیں 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئر پورٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

جب نواز شریف نے مکتھو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ حراست کے سما میں تھے۔ وہاں بیٹھے آنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ہراسہ کرنے پر تیار تھے۔ اب ان کو حراست میں رکھا جا سکتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب یہاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں ایک کلمہ سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جرنل شرف کے ساتھ باہر رہے گا سب کو پانچ سال کا قید کیس سال کا تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں یہاں صاحب ایک ایسی بات کہ گئے تھے جس کا تعلق انہیں سیاسی طور پر جکڑنا ہوگا کیونکہ اب تک ان کے چھلے آٹھ سالوں میں وہ مکہ اور مدینہ میں جھونک رہے تھے۔ کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جرنل پرودا شرف سے کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج وہ سب کو پانچ سال کے لیے تھی۔



پاکستان میں تمام فی وی جیکس اس وقت موہاں ٹیلی فون کے ذریعے نواز شریف کی یہاں تک تک  
تکرار ہے تھے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سعودی شہزادے کا اسلام آباد میں آنا  
کراہیں وہاں لے جانے کا اظہار کرنا پاکستان کی خود مختاری پر ایک ضرب نہیں ہے۔  
میاں نواز شریف نے میری طرف دیکھا اور انہوں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ تاہم وہ  
دیکھا بھی پاتے تو نہ سے پاتے۔

نواز شریف صاحب اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ پانچ سال کی ایل کی بات کر کے وہ اپنی  
واپس کا براہِ عملہ کر لیں گے۔ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی ان دونوں  
ہاتھوں سے پکڑ کر دیا تھا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ایل نہیں کی تھی اور آج ہی سپریم  
کورٹ اور پاکستان کے محرم کو یہ ناکامی ہوا تھا کہ ایل تو اولیٰ تھی لیکن دس سال کے لیے نہیں بلکہ پانچ  
سال کے لیے تھی۔

وہی بات اور اس کی توجیح تھی۔ جنرل مشرف اور ان کی کابینہ کے وزیروں نے اسلام آباد میں  
آسمان سر پر اٹھایا۔ وفاقی وزیر شیخ رشید صاحب سے آگے تھے۔ ہائی ویزروں نے بھی میاں صاحب پر اس  
ٹھن کرنی شروع کی کہ وہ کہیں آٹھ سال تک وہ بھونٹے ہوئے رہے گا انہوں نے ایل نہیں کی تھی اور  
آج وہ اس سے ایک دن پہلے انہوں نے نوواپلی زبان سے یہ اعتراف کر لیا تھا۔

ہاں پاکستان میں بارہ گھنٹے کے اندر نواز شریف کے اس اعتراف کو اس طریقے سے لڑال  
مشرف کے وزیروں نے استعمال کیا کہ پی ایم ایل کے لیڈروں اور وزیروں کا سارا جوش بلائی عدلیہ  
گھنٹا ہو گیا اور اسے عام بلائی عدلیہ نواز شریف کے حق میں ہموار ہو گئی۔

میں نے پریس کانفرنس سے نکلنے کے بعد نواز شریف کے قریب جہاں ایڈر سے یہ کہا کہ منظور اب  
کچھ اور مشورہ میاں صاحب کو اس نے دیا تھا تو انہوں نے نہایت سیاسی جواب دیا۔ بولے کہ یہ سب کا  
مشورہ کہہ لیا تھا اگرچہ وہ ایک لوگ اس کے خلاف تھے لیکن میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی بھونٹ  
نہیں بل رہے تھے۔ وہ کہتا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ ایل جنرل مشرف اور سعودی شہزادوں کے درمیان  
ہوئی تھی جو کہ پانچ سال کے لیے تھی۔ یہ ایل نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان نہیں تھی۔

میں نے ان سے پتہ سے ادب سے کہا کہ حضور اب آپ یہ بات پاکستان میں کس کس کو رکھ  
یاد رکھتوں میں سمجھاتے رہیں گے کہ یہ ایل جنرل مشرف اور سعودیوں کے درمیان تھی اور نواز شریف کو  
اس کی خبر آج آٹھ سال بعد لندن میں پتہ کر پکلی دلو ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ ساہیوال کے  
پولیس تھانہ مظفر اقبال کا شہر شاہی اس موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ

بھونٹ ۱۲ ہے تو قائم بھی اس پر رہو مظفر

آدلی کو صاحب گزار ہونا چاہیے۔

میں نے کہا کہ صاحب اگر آٹھ سال تک یہ بھونٹ ہوا تھا تو اگلے بار کبھی بھی اس بھونٹ پر  
قائم رہے۔ کیا ضرورت آئے گی تھی کہ آپ خود دیکھیں کہ اس کا اعتراف کر لیا گیا ہے پانچ سال کے لیے  
تھی۔

جس جگہ سے ایل پکڑا گیا۔ نواز شریف کے ساتھیوں کا بھی اسی خیال تھا کہ اسلام آباد بھونٹ  
پکڑا گیا پاکستان نواز شریف کا استقبال کرنے کے لیے آئے گا۔ انہی انہی نے ایل دیکھی تھی لیکن اس  
تھی کہ جس جگہ ان اور اٹھا۔

نواز شریف نے نوواپلی زبان میں ان صحافیوں کی گورنمنٹ ہائی کوریجیٹوں نے ان کے ساتھ اسی جہاز  
میں سفر کیا تھا جس میں وہ اسلام آباد آئے والے تھے۔ کئی صحافیوں کو بھی پکڑا گیا تھا ان سے پہلے  
میاں صاحب سفر کریں گے۔ ہم صحافیوں کو کہا گیا کہ ہم یہ جے ایئر وائر ہوسٹنگی جائیں۔ میں اور  
اس نواز شریف کے ارشد شریف اگلے ایئر پارٹ چلے۔ ہم دونوں نے اسی جہاز میں سفر کیا تھا جس میں  
دونوں جہاز برادران لے جاتا تھا۔ ہوائی اسے پر باجوش و ڈروں تھا۔

غلام مصطفیٰ کھر بھی پاکستان سے مخصوص طور پر لندن چلے گئے۔ ان کا وہاں آنے کا ایک ہی  
مشورہ تھا کہ دنیا بھر کے کیمبرے وہاں اگلے ہوں گے اور لی وی سکرین کے کسی کوئے کھر سے میں میاں  
صاحب کے پیچھے ان کی فعل بھی نظر آجائے گی۔ مجھے بڑی حیرانی اور حیرت تھی کہ کچھ ماہ قبل غلام مصطفیٰ کھر  
کی بیوی جینڈر درانی سے شہباز شریف نے شادی کی تھی اور آج کھر صاحب اپنی سابقہ بیوی کے سنے  
شوہر کو لندن سے اسلام آباد لانے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ جس غیرت اور عزت کا مظاہرہ کھر



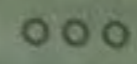








جہاز میں پوری رات کوئی نہیں سو یا سوائے میاں نواز شریف صاحب کے اس نے جہاز میں سونا ہوا  
کے ایک شخص کیساتے آرام سے جہاز میں سو سکتا ہے خصوصاً جب یہ پتہ نہ ہو کہ اس کی انگلیوں  
اسلام آباد ہے، انکے کا قہقہہ یا پھر جہد کا سرور نہیں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص نیند کی دوا ہی میں نہیں کمر  
سکتا تھا اس کے ذہن پر غیر قیمتی صورتحال چھائی ہوئی ہو۔ نواز شریف نے ہم سب کو کھانا بہت کر دیا  
تھا۔ دو سے چار سے چائے میں اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔



سات گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد اندیشوں اور انجانے خوف میں گھرے اس طیارے کے  
مسافر اب اسلام آباد کی فضاؤں میں کج سو رہے پہنچ گئے تھے۔ خبر آئی کہ نواز شریف صاحب جاگ گئے  
ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ تھوڑی دیر میں جہاز کی کچھلی سائیڈ میں آنے والے ہیں۔ جہاز میں ایک عجیب سی  
سہ چکنی اور خوف کا عنصر لہایا تھا۔ کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر نواز شریف کا  
کس طرح کا استقبال ہونے والا تھا۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ صحافی بھی اسے ہی  
روں اور کسی حد تک ٹولڈ وہ تھے۔ ہمارے اہنوں میں لاہور ایئر پورٹ پر پریوز انٹی کی پولیس کے  
ہاتھوں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کے ساتھ آنے والے صحافیوں کی درگت کے مناظر بھی  
تازہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ تنزل شریف بھی ان صحافیوں کو یقیناً سزا دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے جو  
نواز شریف کے ساتھ لندن سے آ رہے تھے۔ پھر نواز شریف نے بھی بڑی عظمت کی قسمی کہ انہیں  
میلے ڈاکے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ ان کی نظروں کے سامنے ہی سب بکھر ہو۔

جب جہاز اسلام آباد کی فضاؤں میں داخل ہوا تو نواز شریف آ کر جہاز کی درمیانی سٹوں پر  
دلہ گئے۔ ان کے ساتھ ان کی پارٹی کے لیڈر اور صحافی کھڑے ہو گئے۔ شہد و نعر سے باری شروع ہو  
گی۔ انکی دیر میں نواز شریف نے کسی سے سچا گفتگو نہ کیا اور لاکھ لاکھ گھمانے لگے۔ کسی نے میرے  
کان میں سرگوشی کی کہ وہ اسلام آباد کی طرف آنے والے اپنے لیڈروں کے لہر مار رہے ہیں تاکہ ان  
سے بچا جاسکے کہ یہ لکڑی کی گھنٹوں کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہو چکا ہے۔ ہر کال لانے کے بعد  
میاں صاحب کے پیر سے کارنگ لٹی ہو چکا ہے اب اس لیڈر کا سوا کچھ نہیں رہتا۔ انہوں نے لکڑی کی گھنٹوں سے

کرتے کے بعد میاں صاحب نے اپنے سچے کٹ فون اٹھا کر ایک طرف کھینچ دیا۔  
نواز شریف کی کہانی اسلام آباد کی فضاؤں میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ  
زیادہ ہو گئے تھے۔ انہیں ایئر پورٹ پر پہنچانے کے لیے اب تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔

جب جہاز اسلام آباد کے رن وے پر اترا تو ہمیں دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ اسلام آباد آج  
پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے ترسے میں تھا جہاں کسی چٹا کو بھی ہمارے کی اہلات نہیں تھی۔ میں اور  
ارشد احمد لائے لگانے لگے کہ دور کھڑے کون سے جہاز میں سموی شہزادہ اس جہاز سے نواز شریف کے  
اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب پنی آئی اسے کا جہاز اپنی مقررہ جگہ پر جا کر کھڑا تو ہمیں پاروں طرف کافی  
دور میں میلوں پنجاب پولیس کے کمانڈوز ہی کمانڈوز نظر آتے۔

میں نے ایک بڑی عجیب بات نوٹ کی کہ اس وقت صحافیوں کی اکثریت ہڈی ہڈی طور پر نواز  
شریف صاحب کے ساتھ مل چکی تھی۔ ایک نیلی وین میں کیمیکل کا مشینر بنکر تو اس وقت باقاعدہ وہاں  
صاحب کا ہاؤس کا روبرو بن گیا تھا۔ یہی صاحب شوکت عزیز کے بھی سب سے قریبی دوست تھے۔ وہ اس  
وقت میاں صاحب اور ان کی پارٹی کے لیڈروں کو ہدایات دینے میں مصروف تھے کہ اگر پولیس کے  
کمانڈوز جہاز میں زبردستی داخل ہوتے ہیں تو انہوں نے کیسے میاں صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ اس  
نے کہاں پوزیشن لیٹی ہے۔ اس وقت وہ ایک ہینڈلر پر من سے لڑا وہ ایک تربیت یافتہ کاپو رہی آجیرنگ  
رہے تھے جو ہر قیمت پر میاں صاحب کو پولیس کے ترسے سے نکال کر ایئر پورٹ سے باہر لے جانے پر  
تیار تھے۔

جہاز کے دوسرے عام مسافروں کو ہانے کی اہلات دہی گئی تھی اور جہاز میں صرف وہی  
رنگ تھے نواز شریف صاحب کے ساتھ لندن سے آئے تھے اور ان میں ایک شخصیت ہم صحافیوں کی تھی۔  
ہم صحافیوں کو کھینچ لیا آ رہی تھی کہ تنزل شریف نے نواز شریف سے ملنے کے لیے کہا تو کئی گھنٹے  
رنگا ہے۔ جہاز کے نواز شریف کے ساتھی بھی گھنٹے گھنٹے تنزل شریف سے بات کرنے کے لیے  
کی گھنٹوں میں کر رہے تھے اور نواز شریف کو ہڈی لگا رہا تھا کہ ان سب کے ذہنوں میں چٹا کہ  
نواز شریف نے وہ وہاں صاحب کو گرفتار کر کے نیپ کے کھٹے کھٹے میں کھینچ لیا تھا۔ نواز شریف نے کہا  
نواز شریف نکل جانے کے لیے تیار تھے کیونکہ اس میں انہیں اپنی رازداری پوری نظر آتی تھی اور سب سے



20 کہ اس وقت سے جا سکتے تھے جو ان کی پارٹی کے ایجنڈوں اور ان کے اسٹیبلشمنٹ پر چلنے لگی  
ہوئے ان کا اظہار کر رہی تھی۔

آرے کھلے سے زیادہ گزر گیا تھا۔ جہاز کے دوران وہ بھی تک بند تھے۔ ہم سمائی جہاز کی  
پھولی کڑیوں سے باہر دیکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ باہر کا ماحول کیا  
ہے۔ اچانک لانا ڈیرہ جو نواز شریف کے ساتھ لندن سے آرہے تھے، انہوں نے ہم سے جہاز کا  
کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ اس وقت ایک ایسی دلہن کے ماسوں لگ رہے تھے جو پہلا کے  
استقبال کے لیے آئے ہوئے لڑکی دالوں کے ساتھ حق مہر، ہنجر اور کھانے پینے کے معاملات پر  
ذرا کرات میں مصروف ہو۔ وہ جگہ پر جہاز کے دوران سے پر جاتے وہاں کھڑے دو تین پولیس آفیسروں  
سے باتیں کرتے اور بار بار دیکھا کرتے کہ میں صاحب کے کان میں تمس جاتے اور پھر اسے قدم جا کر  
پولیس دالوں سے مذاکرات کرتے۔ میں وہ لے کے بارہا تھیں اور لڑکی دالوں کے درمیان خاموشی میں  
مذاکرات چلتے رہے۔

اور نہ ہی ایک جیب و غریب خوشی سے بھرے نہیں لمانے جا رہے تھے۔ مصطفیٰ کوئی طرح  
بھی اس کوشش میں تھے کہ وہی کیمروں کا رخ ان کی طرف زیادہ سے اور وہ نواز شریف کے ٹیبل  
بھی تھے وہی پکار میں رہے تھے۔ انہیں اس حیرت پر بھی زبان تھا کہ وہ طاقت کے ہاتھوں آتے اور ان کے  
کمرے تھے انہیں میں اتنی ہال کو پاکستان میں ان کی بات نہ سنے اس وقت انہیں تعزیرات شریف ایک  
ڈیپارٹمنٹ ہے تھے۔ یہ پچھلے آٹھ سالوں میں تعزیرات صاحب کے ساتھ ہوتے تھے وہی ان کی ملاقاتوں پر  
بہل گئے تھے۔ نواز شریف بھی اور نہ ہی تعزیرات شریف کے درمیان ہوتے تھے وہی ملاقاتوں کو یہ نہیں  
کہہ پاتے تھے کہ ان وقت انہیں بھی ایک ایسی ہی کہہ ان کی ضرورت تھی۔

آخر وہی پر ضرورت مادی نہیں بلکہ ان کے لیے کے بعد جہاز کا دوران کھول دیا  
کیا اسلام آباد ایئر پورٹ کے متعلق ان کے اچھا راج حکیم الام اپنے ایک دوست نواز شریف کے ساتھ  
جہاز میں آئے۔ ایک ایئر بی نے میاں صاحب کو بلاتے کیا جس سے ماحول میں پھیلے ہوئے کسی حد  
تک کم ہواں ایک سیٹ سے سب کو یہ پتہ چل گیا کہ باہر کھڑی ہوئی پولیس کم از کم ان میں سے کسی  
پر اندازہ کرنے کے موزا میں نہیں ہے۔ پولیس والے چاہتے تھے کہ میاں صاحب اکیلے ان کے ساتھ آ

یہاں تک کہ وہی اور دیگر غیر متعلقہ افراد جہاز سے اتر جائیں۔ یہاں صاحب نے بھی مکی کو ہواں میں کھلی  
کھلی تھیں۔ انہیں یہ تھا کہ سوائسوں کی موجودگی میں پولیس کوئی بھی ایکشن لینے سے گریز کرے گی بلکہ  
انہوں نے اپنی سین سے اٹھ کر ڈیپارٹمنٹ میں لے گیا کہ آپ ایئر پورٹ سے یہ نہیں  
ایئر پورٹ پر لگا کر آپ کو وہاں کر دیں گے۔ میاں صاحب نے وہ بات بھی نہیں سنی۔ جہاز کے بعد  
ماحول ایک دفعہ بحر کرم ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ پولیس افسران بھی ایک سو تک دھن سے بات کرنے  
کے لیے جا رہے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے ایک دفعہ پھر کہا کہ میاں صاحب کو جہاز سے نکلنے پائی اور میں  
نہیں ہے۔ وہ اصل ابھی بھی اس کوشش میں ہیں کہ وہ جتنی بھی وقت گزریں وہاں ہو سکتے ہیں  
کوئی اور ہنگامہ سیاسی ایجنڈا اپنے ساتھ چند دنوں سے لے کر ایئر پورٹ پہنچا رہے۔

جہاز کو وہاں لے کے ایک کھلے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مذاکرات ابھی بھی چل رہے تھے۔ تقریب  
ہے ہوا کہ میاں صاحب ممالکوں کے ساتھ اس میں بیٹے کو روٹی آئی فی راول اور ان میں پھیلنے لگے۔  
میں اور ارشد شریف جہاز کی بیڑیوں سے نیچے اتر آئے۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر یہاں  
صرف وہی پچھلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا سٹون جنسوں والی ٹیبل ایک ایئر کانسٹرکشن کے لیے  
اور ایک ٹیبل کے ساتھ ہم پولیس کے کمرے میں آئے۔ اس ملک میں وہی پھیل رہے تھے۔ انہیں  
ان وقتوں پر یہاں نہیں آ سکتے۔

میں اور ارشد شریف سوچوں میں غرق جہاز سے نکلنے کے لیے آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور  
شریف کے ساتھ وہی میاں اترنے کے بعد یہ ماحول بدل گیا۔

جب تو ارشد شریف جہاز کی بیڑیوں پر اترے تو میں نے ارشد شریف سے کہا کہ آ رہیں  
صاحب میں تعزیرات میں یہاں موجود ہے۔ انہیں نیچے اترنے سے بھی روک دیا گیا۔ انہیں یہاں سے  
نکلنا کہ ان کے وہاں بھڑا ہے۔ لگ بھگ آئے ہیں۔ میں اس سے کہا کہ انہیں لے کے لے  
سہارا لگ کے تعزیرات میں تو ارشد شریف کی اسلام آباد ایئر پورٹ پر لگتی ہی چھوڑا کرتے ہوئے یہاں  
مخالفانہ پچھلے تو لوگوں کو اتنا ہی پیغام ملے گا تو ارشد شریف کا یہ اتنی ہی چھوڑا کرتے ہوئے تو ان کی  
تاریخ رقم کرے گا۔ وہی وہی کیمروں سے بار بار یہ فریج ماس کو دکھائیں گے۔ نواز شریف کو وہ تمام یہی



تھان جو ایشیا میں کھڑا کر کے جہازوں سے کام لائیں جو ہوائی...

ارشاد شریف نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر یہ کہہ دیا کہ وہ فخریہ مصلحت تھی، سیاست  
جو آئی کر لو۔ یہ خیال تو اب تک بی ایم ایل نواز کے کسی بھی لیڈر کو نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے نواز شریف  
کو یہ مشورہ دیا ہے۔

میں نے ارشد سے کہا کہ تم دیکھ لینا نواز شریف شکرانے کا یہ کسی یہ بھدہ نہیں کریں گے اور  
دوسرے میں نواز شریف کے اس شکرانے کے بعد سے کو ایک سیاستدان کی آنکھ سے ٹھنک ایک صحافی کی  
آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کا حواہم پر کیا اثر پڑے گا۔

ارشاد شریف نے مجھے کہا کہ تم جا کر یہ بات نواز شریف کو کیوں نہیں کہتے۔

میں نے کہا میرے پیارے اس تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں میں صحافی ہوں کوئی سیاسی ورکر نہیں  
کہ لیڈروں کو جا کر مشورے دینا پھرے۔ میاں صاحب میں اتنی سمجھ بوجھ خود ہونی چاہیے کہ جب وہ  
آٹھ سال بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو انہیں جہاز کی میزبانیوں سے اترتے ہی پہلا کام کیا کرنا  
چاہیے۔

میں اور ارشد شریف نواز شریف کا ایک ایک قدم گن رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی دلچسپی اس  
بات میں زیادہ ہو چکی تھی کہ نواز شریف بچے اترتے ہی بھدہ کریں گے یا نہیں کہ ہم ایک لمحے کے لیے  
اپنے ارد گرد کا سارا سچا سچا معلوم کئے تھے۔

آخر نواز شریف آخری میز می سے بچے اترے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے جیالے نہیں  
کسی موقع کا لانا ایکشن سے بچانے کے لیے چہارتے۔

نواز شریف نے وہ موقع کھو دیا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں خدا کے آگے جھک کر اس مٹی کو چونا  
چاہیے تھا۔ اس کا انہیں بے پناہ سیاسی فائدہ ہوتا لیکن شاید جس نے ان کی لندن سے اسلام آباد واپسی کا  
سکرپٹ لکھا تھا اس میں وہ یہ سین ڈالنا بھول گیا تھا یا یہ اس کی ترجیح میں نہیں تھا۔ نواز شریف نے اپنی  
دھرتی ماں کو گلے نہیں لگایا اور دھرتی ماں بھی شاید اس سے روٹھ چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز شریف کو  
پنجاب پولیس کے کمانڈر تقرر کیا گئیے ہوئے وی آئی پی لاؤنچ سے ایک پرانی بس میں بٹھا کر شہر کو لے  
مترن کے جہاز میں بٹھا چکے تھے۔

جہاز سے اترنے کے بعد ایک ٹھکانے پر کھلا شہر میں کھلی آنکھوں سے دیکھا  
میں جہاز سے اترتے ہی اس لاؤنچ میں جا کر اس کے جس میں سارے صحافی ہوتے تھے وہاں ایک چھوٹی سی  
آئی پی کوٹر میں بیٹھیں گے جو ان کے لیے لائی گئی تھی۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو ایک سٹیٹس  
نظراً، ہاتھ کا گروہ اس چھوٹی کوٹر میں بیٹھ گئے تو یہ ظن تھا کہ انہیں کچھ پا کر وہاں پر ہتھیاروں کے  
میں کھڑے ایک اور جہاز میں بٹھا کر جہاز لے جائیں گے۔ قحطی سے ہتھیاروں کے ہونے اور  
شریف صحافیوں والی بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب تک کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ نواز شریف اپنی ہزاری پارٹی تھے نہیں  
لندن میں جس انقلاب کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ختم ہو  
چکی تھیں۔ اسلام آباد ایئر پورٹ پر انہیں لینے کے لیے پارٹی کا ایک لیڈر یا اور کئی سہرا نہیں تھا  
پارٹی کے تمام لیڈر ران اور در کرز ایک رات پہلے ہی پولیس کو بلا کر گرفتاری سے بچے تھے۔ وہ نواز شریف  
کے لیے ڈانٹے کھا کر ایئر پورٹ جانے کے لیے چہارتے تھے۔

اب نواز شریف کا زیادہ تر انحصار اس پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا پر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے  
تھے۔ ہزاری بیٹے دیکھ کر ان کے اپنے قریبی ساتھیوں کے چہروں پر بھی خوف ویراس کی نگاہیں سرف  
نظر آ رہی تھیں۔ اگر کسی شخص کا حوصلہ بلند تھا تو وہ نواز شریف کے ساتھ آئے ہوئے لندن کے سہرا  
تھے۔ نواز شریف کے لندن کے آفس کے ساتھی محمد افضل بھی نواز شریف کی حفاظت کے لیے اپنی  
جان دینے پر تھے ہوئے تھے۔ سہرا احمد ملک جن کا تعلق فیصل آباد سے ہے وہ جہاز کے اندر بھی ماسی  
اور ایک ایئر لائن افسران سے قانونی معاملات پر لڑتے بٹھرتے رہے تھے۔ احمد ملک کا اصل وطن  
اب شروع ہونے والا تھا جب وی آئی پی لاؤنچ میں نواز شریف اور جنرل مشرف کے بیٹے ہوئے  
ایکس کے درمیان آخری لڑائی شروع ہونے والی تھی۔

وی آئی پی لاؤنچ میں کھینچتے ہی ہمیں یکدم محسوس ہوا کہ شاید کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہم لندن سے  
ایک نام سفر فلائٹ میں ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ہم کوئی ۱۰ سے وی آئی پی لوگ ہیں جن کے لیے جس  
اور ہائے پائی لاؤنچ ہاؤس ہے۔ وہاں کچھ اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ یکدم سب لوگ رہنمائی ہو  
گئے۔ کئی گھنٹوں پر محیط اندیشے اور خوف اچانک ختم ہو گئے تھے۔ صحافیوں نے رہنمائی ہو کر سڑکوں پر چلنے



مجھے کسی نے سونے سے ایک گاڑی تھیں جس کو کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ گاڑی کسی کے ہاتھوں سے  
کہا۔

نواز شریف ہی سب کچھ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سونے پر چھوٹے تھے۔ انھیں بھی ہونا  
سکتا ہے۔ جس کوئی نہیں سے اس میں پھالی ہوئی تھی۔ یہ سونے کی تھی۔

مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ یہ حکومت کی کیا تھی۔ کیا یہ  
نواز شریف کو اپنے ہاتھ سے نکلنے کی اجازت دینی چاہئے گی یا پھر کسی مناسب وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا  
کہ نواز شریف پر کمانڈو آپریشن کر کے انھیں ایئر پورٹ پر کھڑے ایک اور جہاز سے جبراً روانہ کر دیا  
وہاں کا ماحول اب ان کا پر سکون ہو چکا تھا کہ وہاں تمام فی وی کیمرے بند تھے اور سماعتی تقریریں لوگوں کو شروع  
ہو گئے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے کہا کہ یہ معاملہ جتنا پر سکون لگ رہا ہے یہ اتنا ہے جس کا یہ ساری  
نامہ ساری اور سکون کسی سے طوفان کا پیش خیر ہے۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور روایتی انداز میں مسکرایا۔ یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے  
ہم دوست کوئی بھی معنی اپنے مطلب کے باب چاہیں پہنا سکتے تھے۔

آفریدی ہوا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں تھا۔ نواز شریف سے ایک دفعہ پھر ایمگریشن  
سٹاف نے عمر شروع کر دی کہ وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کریں تاکہ ان کی ایمگریشن کرائی جاسکے۔  
اب کی دفعہ نواز شریف ایمگریشن کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈال  
دی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایئر پورٹ سے باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ ایئر پورٹ سے نکلنے  
میں کامیاب بھی ہو گئے تو باہر سڑک پر ایک ساتھی بھی نہیں تھا جو ان کا استقبال کرتا۔ حکومت ایمگریشن کرا  
کر واصل ان کا پاسپورٹ قبضے میں لینا چاہ رہی تھی تاکہ اس پاسپورٹ کو سپریم کورٹ کے سامنے ثبوت  
کے طور پر پیش کیا جائے کہ نواز شریف پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پھر اپنی مرضی سے ہی وہ وہاں  
پہلے گئے تھے لہذا ان پر کسی طرح کا توہین عدالت کا کیس نہیں چل سکتا تھا۔

نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہانی سمجھ آ رہی تھی لہذا ان کے لیے سب سے اہم بات یہ  
بن گئی تھی کہ کسی طرح نواز شریف کا پاسپورٹ ایمگریشن والوں کے ہاتھ نہ لگے۔

انہی میں سے کئی تھے جنہوں نے سمجھنے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں آئے۔ اور  
یہ بات سے باہر جانے کے سبب ان کو کوئی بھی نہیں سمجھا۔ ان کو کوئی اور بیان میں بھی  
کہا کہ وہ ایک سرکار میں چلے گئے۔ پھر وہ بھی سمجھنے کو تیار نہیں ہو گئے۔ سمجھنے سے کہا گیا کہ وہ اپنے  
بیٹے ہیں اور بہت سے جانی نہیں کہہ کر اپنے پاس بہت سے ساتھیوں کی ہر گولہ لیں۔

نواز شریف ایک دفعہ پھر تازہ کی کیفیت جاری تھی۔ ان دفعہ یہ خزانہ ملک سمجھنے اور دوسرے  
تو سچی مدد یہ انہوں سے لڑ چکرا رہے تھے۔ سچی دوسری سب کے ایک اور افسران وہاں موجود تھے۔  
انہوں نے بتایا کہ وہ نواز شریف کو چند مقدمات میں گرفتار کرنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے ان سے  
دراحت مانگے تو انہوں نے فوراً عدالت کے وارنٹ دکھا دیئے۔ اس سے لگتا تھا کہ حکومت نے پہلی  
چوڑی کی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف کو اکیلا کر کے سماعتوں اور اپنے ساتھیوں سے جدا کیا  
جائے تاکہ انہیں جدا دیکھنے میں آسانی ہو۔

نیب افسران کے وارنٹ دکھانے پر وہاں ایک دفعہ پھر ایک سکون کی ہی کیفیت چھا گئی۔ سب  
نے ایک گہرا سانس لیا کہ پلیس اب نواز شریف کو گرفتار کر کے انک قلعے لے جایا جائے گا۔ اس بات کے  
لیے نواز شریف سمیت ان کی پارٹی کے سارے لیڈر تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انک قلعے سے چند دنوں  
بعد وہ سپریم کورٹ سے نواز شریف کی ضمانت کرائیں گے۔

ارشد شریف نے اپنے ایک جاننے والے آفیسر سے پوچھا کہ اب آپ لوگوں کا کیا پلان  
ہے۔ اب آپ لوگ مزید کتنی دیر اس صورتحال کو اس طرح برقرار رکھیں گے۔

وہ آفیسر مسکرایا اور بولا آپ لوگوں کے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے تاکہ کمانڈو آپریشن کر کے  
نواز شریف کو جہاز پر سوار کر دیا جائے۔

اس معنی خیز مسکراہٹ نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو  
رہے تھے۔ ہم سماعتوں کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف کو اب کی دفعہ جہ نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمارے اس  
بین کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سعودی عرب نواز شریف کے پاکستان آنے پر  
راضی نہیں تھا تو وہ لندن میں ہی نواز شریف کو روک سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ آف  
پاکستان نے حکومت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے شیروں کو واپس آنے سے نہیں روک سکتے



تھے۔ شہری چھوٹا شریف۔ کا پناہ دیا تھا جس کی وجہ سے ہم سب دھوکھا کھائے تھے کہ اس سے ہم لے کر  
کہا کہ شاید اس دفتر کو نواز شریف باقاعدہ پلاننگ اور گتہ بندی کے بعد پاکستان ہمارے قریب۔ وہ دفتر  
شریف کی طرح کوئی ایڈوانس کر کے نہیں ہمارے تھے لہذا اظہارِ معاملہ ملے کیے پاکستان و انہیں ملنے آئے  
تھے۔ آخر میں نہ کہیں سے تو انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ پاکستان واپس جانے کی تیاری کریں  
تو ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

نواز شریف لندن میں بار بار یہ بات کہتے تھے کہ انہیں کسی بھی سعودی مہذبہ اور یا ہاشمیہ  
مقامت نے فون کر کے پاکستان جانے سے نہیں روکا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پاکستان کا اندرونی  
معاملہ ہے جس میں سعودی عرب مداخلت کرنے کو تیار نہیں! ایک دو دفعہ تو نواز شریف اس بات پر چڑ  
سے گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا سعودی عرب نے انہیں پاکستان واپس جانے کی اجازت دیدی  
ہے۔ نواز شریف نے بڑی برہمی سے سوال کرنے والے اس صحافی کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ  
پاکستان ایک خود مختار ملک ہے اور ہم کیوں بار بار سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت میں  
تھیں۔

جب نواز شریف سوال کرنے پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے تو ہم سب چپ رہے مگر نہ پوچھا جا  
سکتا تھا کہ میاں صاحب اس سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار تو اس وقت تا  
تھا جب انہوں نے آپ کو جنرل مشرف کی ٹیل سے رہائی دلوائی تھی۔ اس وقت سعودی عرب کی مداخلت  
کا غیر منظم کیا گیا تھا لیکن آج بدلتے حالات میں اسی ملک کی مداخلت کو پاکستان کی خود مختاری پر ایک  
ضرب قراں بنا جا رہا تھا۔

یہ وہ وہ بات تھی جن کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف کو ہندو نہیں  
بٹھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں انگلینڈ لے جایا جائے گا۔

اتنی دن میں ہم نے دیکھا کہ معاملہ اب اینگریٹیشن اور ریپ کے افسران کے ہاتھوں سے اٹلی  
میں ایکسیسوں کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں پھانسیا گیا تھا۔ اب یہ ایکسپنس بے یقین نظر آ رہے تھے۔  
یوں لگ رہا تھا کہ اسی سے کہیں یہ پیغام آ گیا تھا کہ اب مزید سامہ کرنے کی ضرورت نہیں اب نہ کرنا ہے  
وہ کر گزریں۔

بات یہ تھا کہ آہستہ آہستہ جی میں ہوتی ہا رہی تھی۔ صحافی بھی اپنی باتوں پر ہانک گئے تھے۔  
سب کو چہ پل گیا کہ آخروہ مرحلہ آن پہنچا ہے جس کے لیے ان سب نے لندن سے اسلام آباد تک کا  
سفر کیا تھا۔ منظر میں تیزی آنے لگی۔ جذبات بڑھنے لگے۔ اچانک نواز شریف کے گرائی ہوئے  
افسران نے گھبراہٹ لیا اور بڑی تیزی سے ان کی پارٹی کے لوگوں کو ان سے علیحدہ کیا۔ دو جنم نے میاں  
صاحب سے بد تیزی کرنی شروع کی۔ ایک مرحلے پر وہ بد تیزی اتنی بڑھ گئی کہ میاں صاحب کا چہرہ ہلکی  
دلہ لہنے سے سرخ ہوا اور انہوں نے تقریباً چپا کر کہا کہ وہ تمام افسر جو ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں  
انہیں ایک دن اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

اس دوران میاں صاحب کو دھکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی پارٹی کے دو جنم لوگ ابھی  
بھی میاں صاحب کے قریب رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دھکے نہ چڑیں۔ ان میں ان کے لندن  
کے دفتر کے محمد افضل پیش پیش تھے۔ ہم سب صحافی ایکٹو ہو گئے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا  
کرنے والے تھے۔ راول لاؤنچ میں جیل و پکار اور شور شرابہ بڑھ گیا تھا۔ اٹلی میں افسروں کے ساتھ  
اب پنجاب پولیس کے کمانڈرز بھی مل گئے تھے۔ محمد افضل کا حال اس وقت سب سے زیادہ برا تھا۔ وہ  
نواز شریف کے ساتھ ابھی تک چپے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ بد تیزی نہ ہو۔ اسی دھم بھیل میں ہم  
نے اچانک ایک گونج دار آواز سنی۔ یہ محمد افضل کی آواز تھی جو زور سے اٹلی میں ایکسیسوں کے افسران  
کے رویے کو دیکھ کر چلا تے ہوئے کہا کہ شرم کرو یہ شخص بھی تمہارا دو دفعہ وزیر اعظم رہا ہے۔ تم لوگوں کو  
اپنے وزیر اعظم کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم آتی چاہیے۔

میں اور ارشد شریف ایک کونے میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں پر اچانک  
ایچ این کا دورہ ہوا۔ ہم کس طرح کے ملک کے شہری تھے جہاں دو دفعہ وزیر اعظم رہنے والے شخص کو  
اٹلی میں ایکسیسوں کے چند لوگ سرعام ذلیل کر رہے تھے۔ وہ شخص جو کبھی اس ملک کے اچھے رہنے والے کا  
نالک تھا آج چند ایکٹوں کے ہاتھوں کھینچا جا رہا تھا اور اسے ہاتھ روم میں بند کرنے کی کوشش ہو رہی  
تھی۔ لندن میں بیٹھ کر ہمیں یوں لگتا تھا کہ شاید اب پاکستان بدل گیا ہے، لیکن ہماری آنکھوں کے  
سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس ملک میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جنرل مشرف  
اور نواز شریف کے درمیان 12 اکتوبر کو شروع ہونے والی ذاتی جنگ آٹھ سال بعد بھی اپنی تمام تر قوت







لاہور میں آکر ان کے ساتھ رہا۔ پاکستان میں آکر پہلی بار دیکھا گیا تھا۔ وہ تو پہلی بار لاہور  
اور پہلی بار لاہور میں آئے تھے۔ اب لاہور شریف پر پہلی بار آئے تھے تو پہلی بار لاہور میں آئے تھے۔

پھر ان کے ساتھ سے یہ عالم آ گیا۔ لی وہی پر نہیں ملتا شروع میں۔ وہاں ہزل شریف  
کھوت کے لطف و ذرا لاہور شریف پر پہلی بار آئے تھے کہ کہے انہوں نے ایل کی لطف و ذرا  
کی تھی لہذا انہیں یہ بھی دیا گیا تھا۔ ان وزراء میں ایک وزیر کا نام زاہد جاوید بھی تھا۔ آئی وہی زاہد جاوید  
پاکستان مسلم لیگ کو ان کے گٹ پر سیالکوٹ سے انٹرنیشنل سمیت کرہ قومی اسمبلی میں۔ وہی لاہور شریف پر  
انہوں میں قرآن کی تمہیں کہتے تھے کہ وہ ہزل شریف کے ساتھ ہاتھ ملانے والے کسی سیاستدان  
سے ہاتھ تک نہیں ملائیں گے وہی بعد میں زاہد جاوید جیسے لوگوں کو اپنی پارٹی کا گٹ دیکر قومی اسمبلی کا ممبر  
بناتے دیکھے گے۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد لاہور شریف پاکستان لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انہوں نے درست ایئر  
پورٹ کا انتخاب کیا۔ وہ اسلام آباد کے بجائے لاہور ایئر پورٹ پر اترے۔ اب انہیں ہمارے جیسے  
سہیلوں کو چہرہ ہلا کر اپنے ساتھ لاہور لانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس دفعہ سعودی عرب کے  
بادشاہ سلامت نے انہیں اپنے طیارے پر ایک بلٹ پروف مرسیڈز گاڑی ساتھ دیکر پاکستان واپس  
بجھایا تھا۔ بھلا اب کی دفعہ ہزل شریف کی کیا مجال کہ وہ بادشاہ کے جیسے ہوئے ہمارے لیڈر کے ساتھ  
وہی سلوک کرتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کیا گیا تھا۔

### سید یوسف رضا گیلانی

وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں لیصل صلاح  
حیات ایک ایسی بات کہہ دیں گے جس کی وضاحت انہیں ٹی وی کیمروں کے سامنے ٹوکر کرنی پڑ جائے  
گی۔

دراصل وزیر اعظم گیلانی، فیصل صلاح حیات اور وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف  
کے درمیان ایک سال سے جاری لڑائی میں کراس قازنگ کا شکار ہوئے۔ جون 2010ء کے آخری ہفتے  
میں جب بجٹ پر بحث جاری تھی تو فیصل صلاح حیات نے ایک دفعہ راجہ پرویز اشرف پر بغل پاور  
پریکٹس میں کرپشن کرنے کے الزامات دہرائے۔ اس وقت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی ایوان  
میں موجود تھے۔ فیصل صلاح حیات نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ راجہ پرویز اشرف  
کے خلاف سیکینڈل اس رپورٹر (رؤف کلاسرا) نے کیا ہے جنہوں نے وزیر اعظم گیلانی کی کتاب "چاو  
یوسف سے صدا" لکھی ہے۔

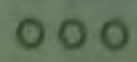
یہ بات قومی اسمبلی میں بیٹھے تمام ارکان اور میڈیا کے لوگوں کے لیے ایک بم شیل کے طور پر  
ساٹنے آئی۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وزیر اعظم گیلانی کو اس طریقے سے سب کے سامنے یہ  
کہا جائے گا کہ ان کی آپ بیتی و رسائل کسی صحافی نے انہیں لکھ کر دی تھی۔ انہیں نے مجلس میں پراپنا



نام لکھ دیا تھا۔

جب فیصل صالح حیات نے یہ ساری بات فتح کی تو وزیراعظم گیلانی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رولڈ کا سرا میرے دوست ہیں۔ پھر انہیں کوئی بات یاد آئی اور بولے کہ نہیں، وہ میرے اتنی دوست ہیں۔ اسپتال میں تھا تو وہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ گیلانی صاحب نے ایک اور بات بھی کہی کہ وہ کسی سرانجی ملاتے سے ہیں اور میں کسی سرانجی ملاتے سے آیا ہوں۔ تاہم، یہ کتاب میں لے ٹو لکھی ہے۔ رولڈ کا سرا لے نہیں لکھی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گیلانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ واکھل میں لکھتے ہیں، اردو میں نہیں ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر رولڈ نے لکھی ہوتی تو وہ کتاب واکھل میں ہوتی نہ کہ اردو میں۔

جب قومی اسمبلی میں یوسف رضا گیلانی اور فیصل صالح حیات میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب کس نے لکھی تھی تو میں اس وقت بڑے مزے سے اپنے گھر پر سوا ہوا تھا۔ ایک پریس کنفرانس کے دوست احمد کافون آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ کہاں ہیں؟ یہاں تو آپ کی وہ سے خاصا رولڈ لایا ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتادیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فیصل صالح حیات کہتے ہیں کہ کتاب آپ نے لکھی ہے، گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ نہیں یہ کتاب انہوں نے لکھی تھی۔ میں نے تقریباً سو سے سو کو جواب دیا کہ ہاں یہ ایسی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت اس پر بات کریں گے۔ احمد کافون بند ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسٹریٹ لائٹس دس سال پہلے کی ان یادوں میں کھو گیا جب میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے ایڈیٹریل میں ملاقات ہوئی تھی۔



اگست 2001ء کی بات ہے۔ میں نے ان دنوں نیا نیا ڈان اخبار چھوڑ کر دی نیوز کو جوائن کیا تھا۔ جنرل مشرف نے انہی دنوں ایڈیٹر ہاک پبلک اکاڈمنس کمیٹی تشکیل دی تھی۔ ایک نئے ہوئے رینجرز نیوز کرپٹ انجی۔ یو بیگ کو اس کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے باقی ممبران بھی رینجرز نیوز کو نہیں

تھے لیکن ایسا ہماری کی بات یہ ہے کہ ان سب نے ان کے بعد آنے والے سالوں میں جیل میں بیٹھ والی پبلک اکاڈمنس کمیٹی کے ممبران سے بہت اچھا کام کیا تھا۔

انہی دنوں اچھی بات یہ ہوئی کہ پہلی دفعہ اس کمیٹی کی میٹنگ میں میڈیا کے لوگوں کو شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اب سماجی واپس کر اس کی کارروائی کو بہت کر سکتے تھے۔ ایک دن بڑی مجلس ہی بات ہوئی۔ پبلک اکاڈمنس کمیٹی کے سامنے قومی اسمبلی اور عدلیت پکڑا بیٹ کی دو مختلف آڈٹ رپورٹس پیش کی گئیں۔ ایک رپورٹ اس دور کی تھی جب وہم سہاڈ نے جیل میں بیٹھتے تھے اور یوسف رضا گیلانی ان کی قومی اسمبلی تھے۔ ان آڈٹ رپورٹس میں دونوں پر لکھا گیا کہ طرح کے الزامات لگائے گئے تھے جن میں لوگوں کو نوکریاں دینا، گاڑیوں اور ٹیلی فون کا پھر ضروری استعمال اور اختیارات کا لٹلا استعمال وغیرہ شامل تھے۔ پکڑا بیٹ ٹائم انٹروال کا یہ پہلا تھا کہ پبلک اکاڈمنس کمیٹی عدلیت کے مساوات کو چیک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے جس کے تمام معاملات کی منظوری اس کی فنانس کمیٹی سے لی جاتی ہے۔ تاہم، کمیٹی نے یہ اعتراض ماننے سے انکار کرتے ہوئے آڈٹ رپورٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہم سہاڈ پر ٹیلی فون اور گاڑیوں کے لٹلا استعمال کے معاملے میں کمیٹی روم سے اٹھارہ لاکھ روپے ریکور کرنے کی اجازت کر دی۔ بعد میں وہم سہاڈ نے جنرل مشرف کے نام ایک خط لکھا۔ جنرل مشرف نے صدر پاکستان کی مشیت سے انہیں اٹھارہ لاکھ معاف کر دیے اور کچھ دنوں بعد وہم سہاڈ نے 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان مسلم لیگ قائد اعظم جوائن کر لی۔ یوں یہ سارا سودا اٹھارہ لاکھ روپے میں طے ہو گیا۔

اگلے دن یوسف رضا گیلانی پر بننے والی آڈٹ رپورٹ کی جاری تھی۔ ان پر بھی وہی الزامات تھے جو وہم سہاڈ پر تھے۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ان پر بھی کوئی جرمانہ وغیرہ کر کے آڈٹ رپورٹ کو سبٹل کر دیا جائے گا۔ تاہم، جب رپورٹ سامنے لائی گئی تو کمیٹی کو بتایا گیا کہ یہب نے پہلے ہی اس رپورٹ کی بنیاد پر یوسف رضا گیلانی کو گرفتار کر رکھا ہے اور جب تک ان کیسز کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کمیٹی یہ رپورٹ ایلی میٹنگ میں زیر بحث نہیں لاسکتی۔

یوں پبلک اکاڈمنس کمیٹی نے بھی اپنے اختیارات یہب کے سامنے سرخڑ رکیے۔ اگر وہ یوسف رضا گیلانی پر بننے والے ان آڈٹ رپورٹوں کا فیصلہ کر دیتی جیسے وہم سہاڈ کے سلسلے میں کیا گیا تھا تو شاید



انہوں نے یہ بات سنا کر بہت غصے سے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔

جب میں نے ایک بار اس شخص کو دیکھا تو اس نے کہا کہ میں نے یہ شخص پہلے ہی دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ شخص پہلے ہی دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ شخص پہلے ہی دیکھا تھا۔

میری بیٹی جو سرفراز گیلانی سے اس خبر سے پہلے بھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے شاید میری یہ خبر سنا لی ہوگی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ پورے کون ہے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ کسی دوست کے ذریعے مجھ تک ان کے شکرے کے الفاظ پہنچے۔ وہ جی ہائے میں واقع ایک ہسپتال میں اپنے چیک اپ کے لیے آئے۔ مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان سے ایک کمرے میں چکی وفد ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان نے ان کی گرفتاری کو ان کی والدہ سے چھپایا ہوا تھا۔ انہیں یہ پتہ چلا گیا تھا کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب گیلانی صاحب کی والدہ وہاں آئیں تو انہوں نے ہسپتال کے اچھے صاف سترے کمرے کی تعریف کی اور کہا کہ اب وہ بھی سیکرٹ رک جائیں گی۔ گیلانی صاحب کے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا کہ وہاں کو کیسے بھائیں کہ وہ تھوڑی دیر بعد اس کمرے سے نکل پلے جائیں گے۔ آخر گیلانی صاحب نے اپنی والدہ کو بتایا کہ جنرل مشرف بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح پاکستان چھوڑ کر پلے جائیں۔ اب وہ یہ بتائیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ بالکل نہیں اس کی بھی

بہتر نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بات سنا کر بہت غصے سے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو میری بیٹی ہے۔

ہسپتال کے اسی کمرے میں میری چکی وفد جو سرفراز گیلانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ جی ہائے میں اور احترام سے ملے۔ اس بات کا میرا شکر یہاں کیا کہ میں نے ان کے حق میں وہ ساری کوششیں کی ہیں جو اس بات کو میں ان سے پہلے بھی نہیں ملا تھا۔

میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ میڈیا میں چھو کر بیٹھ کر انہیں ملاقاتوں کے فیوڈلز کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے ملاقاتیوں کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ غریبوں کو نوکریاں نہیں دیتے۔ جب آپ نے نوکریاں دی تھیں تو نیشنل میڈیا نے کہا تھا کہ اس معاملے پر قلم اٹھانا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

خیر، گیلانی صاحب سے ایک نئے تعلق کی بنیاد پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ صاحب سائنسوں کے برعکس ملنے ملانے میں زیادہ بہتر انسان تھے۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہت کر تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور شفقت سے گفتگو کرنا ان کے حزان کا حصہ تھا لہذا مجھے ملنے ملنے میں ان سے محسوس نہیں ہو رہی تھی جو میں دیگر سائنس دانوں کے معاملے میں سمجھتا تھا۔ اس کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے ایڈیٹل گیا۔ وہ جی ہائے میں اور احترام سے پیش آئے۔ مجھے ایک نیا شوق ہونے لگا کہ کیوں نہ ان سے ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات چیت شروع کی جائے تاکہ ماضی میں چھپنے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹایا جاسکے۔ میں میرے ایڈیٹل آؤٹ ہاؤس میں ان سے ملا گیا۔ ایک دن گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی آپ جتنے گھر رہتے ہیں۔ نیشنل میڈیا نے ان کے بارے میں وہ باتیں بھارتی اور کارہ انٹور پر رائے کی تھیں دیکھتے رہتے یا ہر کانہ قلم لے کر اپنے دماغ کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔







آخر گیلانی صاحب نے میرے مسلسل انکار کے آگے اصرار ڈال دیے۔ ہم دونوں دہلی  
بیتے کرے کی طرف گئے جہاں ان کی بیوی بچے اور ارشد شریف بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب نے اپنی  
کتاب کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تاکہ میں ارشد شریف کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرنا شروع  
کریں۔

میں نے گیلانی صاحب سے مسودہ لیا اور ارشد شریف کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے باہر آ  
گیا۔ میں نے ارشد شریف کو ساری بات بتائی کہ کیسے گیلانی صاحب ہمیں ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر  
دے رہے تھے۔ ارشد شریف مسکرایا اور مذاقاً بولا پھر واپس کیوں کر دیئے تھے؟ پیسوں کی بی بی شہ  
ضرورت تھی۔

میرا اور ارشد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو وہ حصوں میں بانٹ کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کرتے  
ہیں اور پھر اسے اکٹھے بیچ کر ایڈٹ کر لیں گے۔ ارشد شریف ان صحافیوں میں سے ہے جو ہر کام کو ہوا  
کے ساتھ کرتے ہیں اور بہت اچھا کرتے ہیں۔ ارشد شریف کا مولانا اس وقت یہ مسودہ چھ کر ڈھاب ہو گیا  
جب اس نے گیلانی صاحب کی اپنے خاندان کے بارے میں دی گئی چھوٹی چھوٹی معلومات کو چرچا  
میں لے کر ارشد کو بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں۔ ہمیں انگلش بھاری  
دماغ میں رکھ کر اس کتاب کو لکھنا تھا لہذا گیلانی صاحب کے اس خاندان کے باب کو ہم اپنے مرضی سے  
ایڈٹ کر کے لکھ سکتے ہیں۔ میں نے گیلانی صاحب سے اگلی ملاقات پر یہ بات کی تو انہوں نے توجہ  
مجھے اس بات کی اجازت دی کہ ہم جیسے چاہیں اپنی کچھ کے مطابق اس کتاب کا انگلش لکھ دیں۔

میں واپس آیا اور ارشد شریف سے بات کی جس میں نے عرض کیا کہ ارشد شریف اب اس  
پابلیکٹی میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میں نے ارشد کو بھاننے کی کوشش کی کہ صرف  
پاکستان میں ہی ہم صحافی اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کے صحافی تحقیقات کر کے سچی  
شکار کرتے ہیں چھاپتے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اگر آج ہم نے گیلانی صاحب کی یہ پابلیکٹی  
انگلش میں کر لی تو نہ صرف ہمارے اپنے صحافیانہ کیریئر کو یہ فیصلہ فائدہ ہو گا بلکہ ہم اور بھی نئے نئے  
کے سیاستدانوں کی آپ بیتیوں لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ارشد سے مذاقاً یہ بھی  
کہا کہ کون جانتا ہے کہ کل کو یہ جیل میں بیٹھا ہوا ہوا تھا گیلانی اس ملک کا وزیراعظم بن جائے اور پھر

اس کی سیاست اور ذات پر کبھی بھی کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم دونوں سے بجز تبصرہ نگار اور کوئی نہیں  
ہوگا۔ لہذا کہا کرنا یہ ہوا کہ گیلانی صاحب واقعی وزیراعظم بن گئے۔

میری یہ آخری کوشش بھی رائیگاں گئی کیونکہ اس کے بعد ارشد بالکل اس پابلیکٹی میں دلچسپی نہ  
کر گیا۔ اسی اثنا میں یہ پتہ چلا کہ ارشد کو برطانیہ میں ماسٹر ڈگری کے لیے ایک اسکالرشپ مل گئی ہے اور  
وہ کچھ دنوں بعد پاکستان چھوڑ گیا۔ یوں گیلانی صاحب کی یہ کتاب کبھی بھی انگریزی میں نہیں چھپ سکی  
اور اس کے ذمہ دار اور کوئی نہیں، میں اور ارشد شریف ہیں۔ گیلانی صاحب کی آپ شرافت دیکھیں کہ  
اسے برسوں میں انہوں نے مجھے کبھی یاد تک بھی نہیں دلایا کہ میں نے ان سے ان کی کتاب کا انگریزی  
ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی وجہ بتائے بغیر آج تک اس کا کام نہیں کیا۔

اسی اثنا میں میں ایک دن اس وقت کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات سے ملنے ان کے دفتر  
گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ وہ بھی اپنی باج کرائی لکھیں کیونکہ ان کی زندگی اتنی دلچسپ  
گزرتی تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ اگر  
وہ چاہتے ہیں تو میں ان سے ساری داستان ان کو وہ کتاب لکھوں گا۔ وہ راضی ہوئے اور آج میں  
کہوں گا۔ فیصل صالح حیات نے میری بات کو مذاق میں لانا چاہا تو میں نے انہیں بتایا کہ جب یہ سب  
بتاؤں گے گیلانی بھی جیل میں کتاب لکھ رہے تھے لہذا انہیں کچھ لکھنے چاہیے۔ میرا خیال ہے اس وقت فیصل  
صالح حیات نے یہ سمجھا کہ شاید جیسے میں انہیں ان کی کتاب لکھنے کی آفر کر رہا تھا اس طرح میں یہ سب  
بتاؤں گے گیلانی کی کتاب بھی لکھ رہا تھا۔ حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں بھی یہ سب بتاؤں تاکہ  
ان کے دلچسپ سچے لکھنے چاہیے۔

تو وہ ان سات برسوں میں فیصل صالح حیات کے کہنے میں سبکی بات لکھ کر یہ سب بتا  
گیلانی کی آپ بیتی میں نے لکھی تھی۔ فیصل نے اپنے تئیں وزیراعظم بننے کے لیے کبھی کبھی  
بات میں جوش پیدا کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ ان کی کتاب بھی ان صحافیوں نے لکھی تھی کہ نے وہ  
پیارے شرف کے خلاف سیکڑال ہائل کیا تھا۔ فیصل نے یہ بات بھرت کرنے کی کوشش کی کہ ہر ایک  
ایہ صحافی جس سے وزیراعظم نے اپنی کتاب لکھوائی ہے وہ اس کے صحافی تھے اور نہ سکا ہے۔  
جب وزیراعظم گیلانی نے اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور یہ کہ



میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ یہ تو ایک نیا اور دلچسپ موضوع ہے۔  
میں نے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس سے متعلق کچھ سوچنا پڑے گا۔  
میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ یہ تو ایک نیا اور دلچسپ موضوع ہے۔

اب اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ یہ تو ایک نیا اور دلچسپ موضوع ہے۔  
میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ یہ تو ایک نیا اور دلچسپ موضوع ہے۔  
میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ یہ تو ایک نیا اور دلچسپ موضوع ہے۔

یہ کتاب صاحب کی نئی اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں ان کے بارے میں  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ

یہ کتاب صاحب کی نئی اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں ان کے بارے میں  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ

یہ کتاب صاحب کی نئی اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں ان کے بارے میں  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ

000

یہ کتاب صاحب کی نئی اور دلچسپ کہانی ہے۔ اس میں ان کے بارے میں  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ  
کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ کچھ نیا اور دلچسپ



ری۔ اب مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ اس کی اولیٰ فی کون کی گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ اس کا کہ  
اور بھی اس نیکل میں شریک ہو گیا تھا۔ ہم سارے اس فی کون سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ شریک  
اب سوچتا ہوں کہ کیا اس نیکل کو یہ یاد ہو گا کہ وہ کسی ایسے شخص کو سہرا کرتی رہی تھی جو کبھی اس سے  
پاکستان کا وزیر اعظم تھا۔

ابھی ہم وہاں پہنچے ہی تھے کہ گیلانی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے آصف علی  
زرداری کے ایک بڑے قریبی دوست فیصل نئی بٹ آرہے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ گیلانی  
صاحب کہنے لگے کہ وہ انہیں کھانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے  
ساتھ چلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ گیلانی صاحب کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کی آج بینظیر بہنوئی سے  
سات سال بعد پارٹی میننگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاید کچھ رہے تھے کہ پارٹی کے لیے پانچ سال  
نیل میں رہنے کے بعد اور جزل شرف کی ہر آفر ٹھکرانے کے بعد بینظیر بہنوئی شاید انہیں بڑا پروڈوکول  
دیں گی۔ تاہم میننگ میں بینظیر بہنوئی نے یوسف رضا گیلانی کو شاید وہ پروڈوکول نہیں دیا جس کے وہ واقعی  
اقدار تھے۔ جب فیصل نئی بٹ وہاں پہنچے تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ انہوں نے بھی تھوڑی دیر بعد یہ  
بات محسوس کی کہ گیلانی صاحب کچھ بچھے بچھے سے تھے۔ فیصل بٹ بڑے سمجھدار نکلے۔ انہوں نے گیلانی  
صاحب کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسی وقت اپنے موبائل فون سے آصف علی زرداری کو فون کیا جو اس  
وقت نیو یارک میں تھے۔ انہوں نے یوسف رضا گیلانی کی آصف زرداری سے بات کرائی۔ فیصل بٹ  
زرداری صاحب کو اشارہ بتاتا چکے تھے کہ گیلانی صاحب کا موڈ کچھ بہتر نہیں ہے۔ آصف زرداری کو  
احساس ہو گیا تھا کہ شاید لندن میں ہونے والی پارٹی میننگ میں ان کے جیل کے ساتھی کو وہ مقام نہیں دیا  
گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ زرداری صاحب بڑی دیر تک گیلانی صاحب کے ساتھ نیلی فون پر  
باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں فیصل بٹ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر کھانا کھلانے کے لیے ایک  
خوبصورت ترکش ریسٹورنٹ لے گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس ریسٹورنٹ کے اندر سستی اور  
خوبصورتی ابھی قائم تھی۔ میں گیلانی صاحب اور فیصل بٹ اس ریسٹورنٹ کے اندر ایک کونے  
والی نیکل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عربی موسیقی کی دھتوں پر عربی لڑکیوں نے وہ رقص پیش کیا کہ  
ہم تینوں اپنی اپنی پریشانیاں بھول گئے اور ہمارے سامنے پڑی لذیذ ڈشیں بھی سانسوں کو گرم کرنے والے

اس معاملہ میں کب کی پڑی تھوڑی ہو گئی تھی۔

000

ایک دن بینظیر بہنوئی نے شہلا پارٹی کی ایک اور میننگ والی اولیٰ فی کون گیلانی صاحب نے مجھے  
کہا کہ میں اس میننگ کے بعد ابجو سے روڈ پر آ جاؤں۔ تاریخ ہو کر وہاں میں ہی بات کریں گے۔ جب میں  
مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو میننگ ختم ہو چکی تھی۔ میں اور گیلانی صاحب ابجو سے روڈ پر بیٹھ بیٹھے گئے۔  
میں نے محسوس کیا کہ وہ آج ایک دفعہ پھر چپ چپ سے تھے۔ آگے ایک عربی کی دکان پر گھر میں رکھ  
کر میرے منہ میں پانی بھرا آیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ مجھے پہلے یہ گھر میں لے آئیے۔  
ہم ابھی وہیں گھوم رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر انہیں زور سے پکار لیا۔ گیلانی صاحب  
بڑے حیران ہوئے کہ ابجو سے روڈ کی اس سرد شام میں بھلا ان کا کون جاننے والے اتنی بے تعلقی سے  
ان کی کمر میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ہم دونوں نے مزہ کر دیکھا تو شہباز شریف وہاں کھڑے سرکار ہے تھے۔  
گیلانی صاحب اور شہباز شریف آٹھ سال بعد ابجو سے روڈ پر یوں مل رہے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک  
خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو تین منٹ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ شہباز  
شریف ذرا سی جلدی میں تھے۔ وہ اجازت لے کر روانہ ہوئے۔ تقدیر کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔  
ان دونوں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ چھ ماہ بعد ان میں سے ایک ملک کا وزیر اعظم اور دوسرا پنجاب کا  
وزیر اعلیٰ بنے گا۔

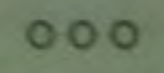
میں نے اور گیلانی صاحب نے ایک مرتبہ پھر ابجو سے روڈ پر چلنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کہا  
کہ جنہیں پتہ ہے کہ ایک سیاستدان کتنے عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے اس وقت  
چاہے اور جہاں چاہے لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔  
میں بڑا حیران ہوا کہ گیلانی صاحب بھلا یہ کس طرح کی بات مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں  
کیسے ان کے اس بیان کی تائید یا تردید کر سکتا تھا۔ خیر، میں نے بڑی سمجھداری سے ان کی بات سنی اور  
جواب دینے کی بجائے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب کوئی شخص  
اس طرح کی بات کرے تو اس کا مطلب بڑا واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی بات کرنے کے سوازیں تھا  
لہذا اپنے آپ کو سمجھدار سمجھ کر بولنے کے بجائے بہتر ہے انتظار کر کے اس کی بات سنی جائے کہ آخر اس



کے من میں کیا ہے۔

میرا چہرہ ہنس رہا ہے حق میں بہتر لگا کیونکہ گیلانی صاحب نے پھر اپنی ذات سے تڑپ کر ایک ایسی تاریخی کہانی سنائی جس سے مجھے سیاستدانوں کے حیران اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ گیلانی صاحب بولے کہ آج جب بینظیر بھٹو صاحب پارٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر ہی پکا زاکر کی ہائیکس سال پہلے کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک سیاستدان بیس سال بعد لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کامیاب سیاستدان بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لے، نہیں تو ساری عمر خود استعمال ہوتا رہے گا۔ گیلانی صاحب کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو اب اتنی بچہ سیاستدان بن چکی ہیں کہ آج انہیں محسوس ہوا کہ پھر پکا زاکر کی یہ بات سچی تھی۔ وہ جس طریقے سے پارٹی کے لوگوں کو قابو کر رہی تھیں اس سے صاف واضح تھا کہ وہ نہ صرف سیاستدان کو سمجھتی تھیں بلکہ وہ سیاستدانوں کو استعمال کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھیں۔

میں بینظیر بھٹو کے بارے میں گیلانی صاحب کا تبصرہ بھول کر ان سے پوچھنے لگا کہ بھلا یہ پکا زاکر نے ان سے یہ بات کیوں اور کب کی تھی اور اس کے پیچھے کیا کہانی تھی۔ یوسف رضا گیلانی نے ایسے روڈ پر چلتے چلتے مجھے پانچ سال پہلے کی وہ کہانی سنائی جو انہیں آج بینظیر بھٹو کو پکا زاکر یاد آ گئی تھی۔



یوسف رضا گیلانی محمد حان جو نیچے کی حکومت میں ایک نوجوان وزیر تھے ان کو وزیر بنے بھی بلکہ عمر بھر کا وزیر اعظم جو نیچے صاحب پکا زاکر کی پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف سے نہیں تھی۔ پھر تو انہیں جرنل ضیاء الحق کو بھی یہ لگتا تھا کہ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ وہ وزیر اعلیٰ پنجاب اس لیے تھے کہ ان کا صوبائی اسمبلی کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ یہ بات جرنل ضیاء سے ہمیشہ نہیں ہو رہی تھی کہ نواز شریف یہ سمجھیں کہ وہ اپنی جگہ سے وزیر اعلیٰ تھے نہ کہ جرنل ضیاء کی بدولت جرنل ضیاء نے اپنے دل کی بات ہی پکا زاکر کے سامنے رکھی۔ جرنل ضیاء کا کہنا اس کی پکا زاکر نے فرمایا کہ سائیں غم نہ کریں نواز شریف ٹھیک نہ جائیں گے۔ اگلے دن ہی پکا زاکر نے یوسف رضا گیلانی کو بلایا اور انہیں کہا کہ آپ

پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیر اعلیٰ پنجاب کے طور پر مہراں اسمبلی کے سامنے پیش کرنا شروع کریں اور اپنے ساتھ چند بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو شامل کریں۔ گیلانی صاحب نے یہ پکا زاکر کے کہنے پر پنجاب میں جا کر ڈیرے لگا دیئے۔ وہ ان دنوں وزیر اعلیٰ تھے۔ ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن سے آتے جاتے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے درجنوں اراکین اسمبلی نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وفاقی حکومت یوسف رضا گیلانی کو نیا وزیر اعلیٰ بنانا چاہتی ہے۔ جب بات زیادہ پھیل گئی تو بڑے بڑے لوگوں نے ان سے خفیہ رابطے کرنا شروع کر دیئے۔ ان میں نصر اللہ دریلنگ، ماشق گوپالک، ملک اللہ یار کھٹنا، محمد دم الطاف، رفیق لغاری اور دیگر بے شمار ایم این اے ان کے گروپ میں آ گئے۔ سب سے بڑی کامیابی اس وقت ہوئی جب چوہدری پرویز الٰہی نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ اور تو اور دیکھو روڈ کو بھی جب اس سارے معاملے کی ایک ملی تو وہ بھی گیلانی صاحب سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یوں بہت کم عرصے میں گیلانی صاحب نے ایم پی این کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

یہ پکا زاکر صاحب کو پیغام بھیجا گیا کہ جناب اب آپ تا میں کہ نیا وزیر اعلیٰ کس کو بنانا ہے کیونکہ نواز شریف کے خلاف بغاوت ہو چکی ہے۔ یہی صاحب سیاست کے پرانے گھاگ تھے انہوں نے نوجوان گیلانی کو کہا کہ انتظار کرو۔

گیلانی صاحب ابھی لاہور میں تھے اور اپنے تئیں اپنی مرضی کے وزیر اعلیٰ کا نام سوچ رہے تھے کہ پتہ چلا کہ نواز شریف جرنل ضیاء الحق سے ملنے کے لیے اسلام آباد شریف لے گئے ہیں۔ نواز شریف کو احساس ہو گیا تھا کہ جرنل ضیاء سے ملنا حق کیے بغیر ان کی حکمت اعلیٰ نہیں ہے گی۔ جرنل صاحب سے ملنے گئے اور اپنی وفاداری کا سہارے سے صاف لہا۔ جب جرنل ضیاء اور نواز شریف کی ملاقات ختم ہوئی تو جرنل ضیاء الحق نے ایک بیان جاری کیا کہ نواز شریف کا حکم مسترد ہے نواز اعظم محمد حان جو نیچے نے بھی یہ بیان دیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہی کسی سرور صاحب پکا زاکر کے بیان نے پوری کر دی کہ نواز شریف کی پوری میں سورج تھا جس کی من نے سنا کر کہی ہے کھیل ختم ہو گیا تھا۔

جونہی یہ خبر لاہور پہنچی، سارے کے سارے ایم پی این فوجی ہو کر بھاگ گئے۔ ان سب کو

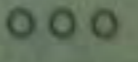


احساس ہو گیا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ ان سے زیادہ گیلانی صاحب کو احساس ہوا کہ مجھے جزل فیاء  
نہ جان جو نوجوانوں کی زندگیوں کو استعمال کیا تھا۔ میں بڑے بچھے دل کے ساتھ ہی پکا زور صاحب سے  
میلے گیا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مسکرائے اور بولے بچے ایسے سیاست ہے۔ نواز شریف جزل فیاء کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔  
میں نے جزل فیاء سے کہا کہ ہم نواز شریف کو ٹھیک کر دیں گے۔ اب ہم نے ایک ایسے بندے کا  
انتخاب کیا تھا جس کو استعمال کر کے نواز شریف کو سبق سکھایا جاسکتا۔ میری نظر تمہارے اوپر پڑی۔ تم  
نوجوان ہو۔ تمہاری ابھی سیاست میں پوری گریڈ پہنچنی نہیں ہے۔ مکان کے ایک بڑے سیاسی گھرانے  
سے تمہارا تعلق ہے۔ دوسرے تم میرے رشتہ دار ہو لہذا تمہارے لیے ایم پی ایچ کو یقین دلانا آسان تو  
کہو نواز شریف کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ مل جائیں۔ شکر ہے میرا اہم الزام قلمی نہیں ہوا تم نے مجھے  
بچاؤ نہیں کیا۔

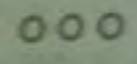
گیلانی صاحب نے نونے دل کے ساتھ کہا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے استعمال کیا  
ہے۔

ی صاحب مسکرائے اور بولے جی ہاں امیں نے آپ کو استعمال کیا ہے۔  
ایک گھنٹہ خور وہ گیلانی نے سیاست کے گرد سے پوچھا کہ ایک سیاستدان کب اس قابل ہو  
جاتا ہے کہ وہ اب چاہے کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔  
ی صاحب نے کہا۔ میں سال بعد۔



ایم نے رونا ہر پلٹنے اور لے مجھے ایک لمحے میں یہ بات بھڑ آگئی تھی کہ یوسف رضا گیلانی کے  
کہنے کا کیا مطلب تھا اور انہیں کتنے ہنسوا آج پارٹی کی میٹنگ میں کیوں یہ پکارا کہ ہائیکس سال ہوا  
قریب آرا کہا تھا۔  
میں نے مسکرائے اور گیلانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو سیاست میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔  
میری اس کا مطلب کچھ کہہ کر وہ نے کہہ دیا اور اول پلٹنے میں وہیں وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے کہا کہ

تھان میں ہونے والی اس ملاقات کے ٹھیک سات ماہ بعد مارچ 2008ء کی ایک شام میں گھر  
پہنچے تو پتہ چلا کہ یوسف رضا گیلانی گھر پر ایک ایک دسے کر گئے تھے۔ وہ ایک اپنے وزیراعظم بٹے کی  
بہرہ دگی کی خوشی میں تھا۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ طرفی تھی کہ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کہ جس دن وہ اس ملک  
کے وزیراعظم بن رہے تھے اس صحافی کے گھر جا کر انہوں نے ایک دن کا تقریباً دو بجے ان سے جیل میں آ کر  
ملاقات۔



جب گیلانی صاحب وزیراعظم بنے تو ان کے لیے سب سے پہلے 2007ء جون کے دوست تھے جو  
ان کے ساتھ ان پانچ سالوں میں جیل میں رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے گھسے کا گھر تھے۔ اگر وہ جیل  
کے دنوں کے ان دوستوں کو بھلاتے تو ان پر یہ الزامات لگتے کہ وہ ایک خود غرض اور بے ایمان تھے  
جو اقتدار میں آتے ہی بدل گئے تھے لیکن اگر وہ انہیں اہمیت دیتے تو پھر ان کی اپنی بدنامی ہوتی تھی۔ اور  
بدنامی ہو کر رہی کیونکہ جیل کے دنوں کے ان ساتھیوں نے ہر جگہ یہ بتانا شروع کر دیا کہ وزیراعظم کے  
ذاتی دوست ہیں۔ کسی نے کہیں پانچوں پر قبضہ کر لیا تو کسی نے چھری کی کسم پوزیاں اپنے ہم کرانی  
شروع کر دیں۔ کوئی ان کا نام استعمال کر کے زائسٹر ہسٹنگ کرانے لگ گیا تو کسی نے جیلے پکڑنے  
شروع کر دیے۔ جب مجھ تک اس طرح کی خبریں پہنچیں تو میں نے گیلانی صاحب کے خلاف زوردار حم  
کی سٹوریوں قائل کیں۔ گیلانی صاحب کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب میں نے اپنے اخباری نواز میں  
ایک خبر لکھی کہ جس دن مکان میں پاور لوس کے تاہر لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہنگامے کر رہے تھے اور  
پہلے شہر کو آگ لگی ہوئی تھی، اسی شام گیلانی صاحب نے یہ ہاؤن میں ملک رہائش کے گھر ایک بہت  
بڑی دعوت میں شریک تھے۔ ان کے نزدیک چلنے والے مکان ہانے سے ملک رہائش کے گھر دعوت  
میں ہانا زور اہم تھا۔

یہ خبر پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری اور گیلانی صاحب کی اتنی فری دو تھی اور میں  
پراگھی ان کے خلاف اتنی بڑی خبر قائل کروں گا۔ مجھے بعد میں وزیراعظم گیلانی کے پرنسٹن آفیسر  
نادر سلطان نے بتایا کہ جو فری میج اس نے خبر پڑھی تو اس نے وزیراعظم گیلانی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ







میں سے ایسا بھیج کر نے کے کو طش میں لگا رہا ہوں گھر صاحب کہا اس سے اور پھر لکھ گیا۔  
گیلائی صاحب قوم کی قسمت ہل نہیں و نہ ہل نہیں لکھنے لکھنے ان کی ان کے کچھ اور  
بیت و داروں اور دوستوں کی قسمت ضرور ہل دی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ لکھی صاحب کو خوشی  
ہے اور ہی طلب !!

کے سب مشورہ سمجھائی ایک جہت سے اٹھتے تھے۔ اچانک ان سب کے سب نے "اٹھا" کی وہی لکھی  
لکھ رہے ان سے پوچھا گیا کہ گیلائی صاحب اتنا ہے کہ آپ نے لا اور انھیں میں ہلا سے  
گھر فرم سے ہیں۔ راشدہ کے سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ ایک لکھ کے  
لے پورے ہل میں ایک نانا پھا گیا۔ سب سمجھنے لگے کہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت مزین، منزل  
اب وہ کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت مزین، منزل  
پروچ شرف یا نواز شریف سے کیا جاتا تو انہوں نے اس پر رزکی زندگی حرام کر دینی تھی۔ گیلائی صاحب  
نے نہ سے دھجھے لکھ میں کہا کہ اگر فریہ سے ہیں تو چھپ کر نہیں خریدے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف  
دیکھ کر کہا کہ کسی اور نے کوئی سوال پوچھا ہو تو پوچھ لے۔ یوں ایک لمحے میں انہوں نے اپنے خلاف ایک  
سبب لال کو وہیں ختم کر دیا۔ انہوں نے اس کی کوئی لمبی چوڑی وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے  
بعد میں نے کبھی ان کے ان چار گھروں والا معاملہ اخبارات یا ٹیلی ویژن میں نہ لکھی پڑھا اور نہ لکھا۔

گیلائی صاحب سے پوچھے گئے اس سوال کا موازنہ اب نواز شریف سے جولائی 2010ء کے  
پہلے پہلے میں 2009ء کے ایک صحافی کی جانب سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں دکھائے گئے شہدے  
مائل سے کریں۔ وہ 2009ء بار بار ہونے والے خونی حملوں کے بعد ان سے ایک رپورٹرز نے جرات کر کے  
صرف اتنا پوچھا کہ میاں صاحب! آپ کی سیکورٹی پر سیکورڈوں کی تعداد میں پنجاب پولیس کے بول  
تبدلت ہیں۔ یہ سن کر میاں صاحب بڑھک اٹھے اور انہوں نے رپورٹر کو غصے میں جواب دیا کہ یہ  
آپ نے مجھ سے کس طرح کا سوال پوچھا ہے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر اس سوال کو یہ کہہ کر مسترد  
کیا کہ صحافی نے ان کی اذیت پر حملہ کیا ہے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہماری صحافی دوست راشدہ میاں  
صاحب سے اسی طرح کا کوئی سوال پوچھ لیتی بیسہ انہوں نے یوسف رضا گیلائی صاحب سے پوچھ لیا تھا  
تو کیا رد عمل ہوتا۔

لکھ ہے کہ گیلائی صاحب نے یہ سوچ لیا ہو کہ موسم اور میڈیا کچھ بھی کہتے رہیں، وہی ہنگامہ  
کرتے رہیں گے جہاں کے سیاسی مٹاؤ میں ہے۔ ایک بات طے ہے کہ گیلائی صاحب اس پائے کے  
لیڈر نہیں ہیں جس کی ایس ان برسے وقتوں میں ضرورت ہے۔ وہ شریف اور مراد بھرے انسان ضرور  
ہیں لیکن قابل نہیں اچھے ان کی جو بات اچھی آتی ہے وہ ان کا قوت برداشت ہے جس کو سمجھانی ہونے کے



ہاں میں بھی تھی، بسو صاحب سے انہوں نے ہنگامہ کشی کے بعد صوبہ صدر میں جوب انجمن کے بارے میں  
بہت کچھ سنا ہے۔

آزاد خیال، جس سے شک ہے، عوامی ہو گیا اور میں نے بھٹو صاحب کی یہ دعوت قبول کرنے کا  
بند کر لیا۔ تاہم، یہ دعوت قبول کرنے سے پہلے میں نے یہ بات ان سے واضح کر دینی کہ ان کے یہاں  
ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں کھل کر ان کے بارے میں جو چاہوں دوں، لیکن گھونگی۔ میں جیسے  
ہو ان کے بارے میں اپنی مرضی کا تاثر لکھتی ہوں اسی طرح میں ان کے بارے میں بھی لکھوں گی۔  
کوئی بھی فرق چاہے وہ اتنے آداب ہوں یا میری خوشنما، مجھے لکھنے سے روک نہیں گی۔  
بھٹو صاحب کا جواب آیا کہ یقیناً آپ کا جوابی چاہے ہی لکھیے گا۔  
یہ میرا بھٹو صاحب کے بارے میں پہلا تاثر تھا۔

بھٹو صاحب ایک ایسے شخص ہیں جن کے بارے میں کوئی بات ذوق سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ  
ذاتی تیزی سے اپنا ذہن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب شخص ہیں جو اسی طرح کے فیصلے کرتے  
ہیں۔ تاہم، یہ بات مانتی ہے کہ وہ بہت ذہین شخص ہیں۔ وہ ایک لوجسٹک طرح بہت چالاک  
ہو رہا ہے جو صورتی سے متاثر کرنے والے یا انہیں کنفیوژ کرنے والے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ  
ساتھ ان میں آپ کو ایک پختہ بروائی اور گہری یادداشت کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

جب میں راولپنڈی ایئر بیس رٹ پر اترتی تو دو افسران نے مجھے روک لیا۔ دونوں نے مجھے  
بہانی انداز میں مجھے بتایا کہ صدر پاکستان ایک گھنٹے کے اندر اندر ان سے ملاقات کرنے والے ہیں۔  
اس وقت پاکستان میں صبح کے دس بج رہے تھے اور میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں سو پائی تھی۔  
میں نے ان دونوں افسروں کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہرگز ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس  
وقت مجھے ایک اچھے ہاتھ اور فینڈ کی ضرورت ہے۔

شاید یہ بات اگر کسی اور صدر کے لیے مجھ جیسی صحافی نے کی ہوتی تو وہ شاید ان کے لیے بہت  
ذاتی ذہن ہوتی لیکن بھٹو صاحب نے اس بات کا برا نہیں منایا۔ انہوں نے اس ملاقات کو شام ساڑھے  
سات بجے تک یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ وہ رات کو کھانے پر میرا انتظار کریں گے۔  
جب میں شام کو بھٹو صاحب سے ملنے گئی تو بھٹو صاحب نے کچھ بازوؤں اور مسکراتے چہرے

### ذوالفقار علی بھٹو

انٹرویو: اورینٹل

میں وہ دعوت نامہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ یہ دعوت ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تھی۔  
میرے پاس کوئی بہانہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے مسترد کرتی۔ مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو  
میں راولپنڈی پہنچی جاؤں۔ میں حیران ہوئی کہ اتنی جلدی کیوں؟ یہ بات درست ہے کہ ہر صحافی کی  
زندگی میں یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک دفعہ وہ لوگ خود دعوت دے کر ملنے کی خواہش کا اظہار  
کریں جو اس وقت آپ سے ملنے سے انکاری ہوتے ہیں جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرے ذہن میں مختلف باتیں آنے لگیں۔ بھٹو صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ  
مجھے اندرا گاندھی کے نام کوئی پیغام دیکر بھارت بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے یہ مفروضے خود ہی  
مسترد کر دیے۔ بھٹو صاحب کو اپنے ذہن کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھ جیسی صحافی کی ضرورت نہیں  
تھی۔ وہ یہ کام سولس اور رومی سٹار ٹکاروں کے ذریعے بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ میرے ذہن میں  
ایک اور بات آئی لیکن وہ بھی میں نے فوری طور پر مسترد کر دی کیونکہ بھٹو صاحب ایک تہذیب یافتہ شخص  
ہیں اور ایسے لوگ اپنے مہمانوں کو بلا کر قتل نہیں کرتے۔ ایک اور خیال آیا کہ شاید مجھے بلا کر اپنا انٹرویو  
دینا چاہ رہے ہوں اور میں ایک طرح کا سربراہان میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید یہی بات بھٹو صاحب کے



کے ساتھ ہر وقت ہمتاں کیا۔ میرے سامنے ایک ایسا دراز قد شخص کھڑا تھا جو مجھے ایک ایسے بظاہر کی طرح لگا  
 جو آپ سے اپنے ہونک میں اکاؤنٹ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی عمر چوبیس برس ہے لیکن  
 مجھے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگے۔ ان کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو چکے تھے اور جو ہاتھی سچ کے تھے  
 وہ ہورے تھے۔ ان کی گہری پکوں کے پچھلے ان کا چہرہ گال، ہونٹ، حتیٰ کہ آنکھوں کی پتلیاں بھی گھٹے  
 بھاری لگ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیا کہ بھنو صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی اداسی نظر آتی۔ ان  
 کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔

بہت سارے طاقتور لیڈروں کی طرح بھنو صاحب میں بھی بہت زیادہ شرمیلا پن ہے۔ ان میں  
 اور بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو آپ کو اندرا گاندھی میں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ بھنو صاحب کو جتنا  
 بنور پڑھتے جائیں گے آپ اتنے ہی زیادہ کنفیوژ اور غیر یقینی نتائج اخذ کرتے جائیں گے۔ آپ بھنو  
 صاحب کو کئی طریقوں سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جس طریقے سے بھی دیکھیں گے وہی آپ کو  
 درست لگے گا۔ بھنو صاحب آپ کو ایک لبرل، ایک سخت گیر حکمران، فاشٹ، کمیونسٹ، ایک انتہائی  
 شخص اور ایک چھوٹے شخص بھی لگیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ بھنو صاحب ہمارے وقت  
 کے سب سے زیادہ مشکل لیڈر ہیں۔ اگر پاکستان نے آج تک کوئی انتہائی دلچسپ چیز پیدا کی ہے تو وہ  
 خود بھنو صاحب ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر اس وقت کوئی بھی پاکستان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ بھنو  
 صاحب ہیں۔ آپ کو یہ بات ہر کوئی بتائے گا کہ بھنو صاحب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اگر بھنو نہ رہا تو  
 پاکستان بھی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔

جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں اندرا گاندھی کی بجائے اردوان کے شاہ  
 حسین کا خیال آتا ہے۔ شاہ حسین کی طرح بھنو صاحب پر بھی یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی  
 قیادت کر رہے ہیں جو معنوی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ بھی شاہ حسین کی طرح سودیت پر نہیں،  
 انڈیا، چائنا اور امریکہ کے درمیان ایک پیمانہ بنے ہوئے ہیں۔ شاہ حسین کی طرح وہ اس بات پر  
 اتنے ہونے ہیں کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید  
 وہ اس کی صورت میں کینیڈا کی طرح ہیں۔ وہ ایک ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں کوئی  
 چیز مانگنی نہیں تھی کہ آپ کو پوری طاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں چاہے اس پر کتنی ہی قیمت کیوں نہ صرف

ہو۔ کینیڈا ہی کی طرح بھنو صاحب نے بھی بڑا خوبصورت، آرام دہ، دلکش اور بڑا اچھا بھلا گزرا  
 ہے۔ جان کینیڈا کی طرح ہی وہ اقتدار کی لٹام کردشوں میں اوائل عمری میں ہی داخل ہو گئے تھے۔  
 یہ ایک حقیقت ہے کہ بھنو صاحب جاگیرداروں اور شرافت کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔  
 انہوں نے پہلے بنگلے اور پھر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے انگریزی میں ڈگری لی۔  
 ابھی ان کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی کہ وہ ایچ ب خان کی کابینہ کے وزیر بن چکے تھے کہ چھ  
 ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ابھی چالیس سال کی عمر پوری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہ جنرل  
 یحییٰ خان کے وزیر بن چکے تھے اور ان سے بھی وہ نفرت کرتے تھے۔ بھنو صاحب بہت تکلیف دہ ممبر کے  
 مراحل سے گزرنے کے بعد ایچ ان صدر میں براہیمان ہوئے۔

طاقت محبت سے زیادہ بڑا جذبہ ہے اور جو لوگ طاقت سے محبت کرتے ہیں ان کے نہ صرف  
 مددے بلکہ ناک بھی طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی خوشبو میں ٹھک نہیں کرتیں۔ بھنو صاحب نے بھی  
 اس طرح کی بڑی خوشبوؤں کو ناپسند نہیں کیا کیونکہ بھنو صاحب کو بھی طاقت سے پیار ہے۔ تاہم، جس  
 طرح کے پاور سے وہ پیار کرتے ہیں اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ وہ خود بھی اس  
 بات کا جواب انتہائی مبہم انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ان سیاستدانوں کے بارے میں آپ کو پہلے سے ہی  
 خبردار کر دیتے ہیں جو سچ بولتے ہیں یا ایک بوائے اسکاؤٹ مورائٹی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔  
 جب آپ بھنو صاحب کو سن رہے ہوتے ہیں تو آپ تقریباً اس بات پر یقین کرنا شروع ہو کر دیتے ہیں  
 کہ شاید ان کی خواہشات بہت اچھی ہیں اور وہ یقیناً ایک اچھا سوشلزم پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے  
 ہیں۔ تاہم، جب آپ کراچی میں ان کی شاندار لائبریری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ پر یہ انکشاف  
 ہوتا ہے کہ سولہوی اور پندرہویں صدی کے قلمی لیکچروں کی کتابوں کو کتنے احرام کے ساتھ سطر کی جلدوں میں  
 رکھا گیا ہے۔ جتنی غناست سے سولہوی اور پندرہویں صدی کی کتابوں کو وہاں لائبریری میں رکھا گیا ہے تو آپ اس  
 نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ کتابیں محض اس وجہ سے وہاں نہیں رکھی گئیں کہ اس لائبریری کا مالک انہیں ایک  
 لٹریچر میں رکھنا چاہتا تھا۔ آپ کے اندر رکت اور عرصہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھنو صاحب سے  
 پوچھتے ہیں تو آکھ پتہ چلتا ہے کہ ان کے دماغ کے دوست، کتا تو لہوہہ سر ہیں اور آپ کو ایک عجیب سی  
 لذت ہوتی ہے۔ کیا بھنو صاحب نے کوئی عجیب خواب دیکھا ہے کہ وہ ایک دن لکھنؤ میں گئے اور



ان پر بھی کسی کی کتابیں نظر اور سوسائٹی کی طرح اسی طرح کی سطور ہندوں میں کسی سے نہیں کی  
اور وہی میں چلی ہوں گی۔ اب یہ بات ان میں رکھیے گا کہ یہ اس طرح کا سوال ہے جو صورت  
سارے دو طرفی لوگ پر چلتے ہیں جو ایک ایسے ملک کی ابتدائی سے واقف نہیں ہوتے جہاں تاریخ ۱۲  
۱۳ کو کسی اور پانچوں ہزار سالوں کا کسی کوئی احترام نہیں کیا گیا اور ان کی جگہ ہمیں جو کہ انسانی اور  
دلت نے لیا ہے۔

میں بھوسا صاحب کے پاس چودھری ان کی مہمان میں کر رہی ہوں ان کے ساتھ چند مہینوں کے  
میں رہی گی۔ یہ اعتراف ہے کہ پانچ ہزار سالوں کے بعد عمل کیا گیا تھا۔ یہ سارا اعتراف ہے بھوسا صاحب  
رہا کہ کیا کیا تھا۔ یہ اعتراف ہے کہ پانچ ہزار سالوں میں اسی شام ہوا جس دن میں پاکستان بنی تھی۔ دوسرا اعتراف  
ہے کہ جتنے وقت ہمارے میں ہوا۔ تیسرا اعتراف ہے کہ شہر ہالہ میں ہوا جبکہ چوتھا اور پانچواں اعتراف  
کرائے میں۔ میں ان چودھریوں میں جو وقت بھوسا صاحب کے ساتھ رہی ہے وہ ہم کھانے کی کچھ نہیں  
یہ سزا کہ ہے میں۔ بھوسا صاحب پانچویں فیصلہ کرنے سے پہلے ہیں۔ اگر سے کہیں پانچواں کے ساتھ  
بڑا لپکتے ہیں۔

بھوسا صاحب رات میں اچھائی ہو گئے آواز میں ایک نئے کو خطاب کرتے ہیں جہاں کسی کو  
پیلے ان کا کان نظر آیا گیا تھا۔ کچھ نہ سوش نہیں اس کے تیر خوب ہیں۔ بھوسا صاحب ان کے وقتوں پر  
پیلے اور ہر سڑگی میں بیٹا ہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے نہ خود سے لہرا ہے ہیں جس سے وہ  
کئے کو یہ سزا ہون چاہی ہے ہیں کہ اس طرح کے اپنے کو ہر سڑگی سے لہرا ہے ہیں اور گولوں کی  
بوجھ لگاتے کا سارا کرنے کے لیے چاہ ہیں۔ میرے ساتھ ایک ہی ہوا بھوسا صاحب نے جسے ہاتھوں اور  
حالت سے یاد ہے یہ ہمارے ایک ایسے ہونے کو چاہیے ہوں جو ہالہ کے ان میں تھیں لوگوں کو چاہیے تھا  
کس نے مجھ کہتا ہے۔ شو کے سوز میں جہاں آگے ہوئے ہیں لیکن بھوسا صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے  
کہہ لگے ہیں۔ دلت کی ہر کی بھگتی ہے تو بھوسا صاحب انہ کو ان میں آتے ہیں۔ میں نے نظر لگا  
کہ ان کی طرف دیکھا تو مجھے ہوں گا کہ تو صورت قاتلوں پر ایک شہزادہ چلتا ہوا آ رہا ہے۔ ایک  
شہزادے کی طرح وہ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ بھوسا صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ اتنی بڑی  
بڑی مہمانوں والے مردوں کے درمیان میں ان کی صورت یہ سوچ رہی ہوں کہ بھوسا صاحب جان لہو

راہ کے سوز میں کو فساد لاسے کی کو فساد کر رہے تھے۔ اب بھوسا صاحب نے بھوسا صاحب نے ایک  
ایک کر کے اپنی پارٹی کے لوگوں، گورنر اور دیگر لوگوں کو اپنی آگے کیا اور ان سے کہہ دیا کہ ان لوگوں کو  
دلت اور میں ایک طرف نہیں سنا ہے کہ ان کے ہاتھ آتے ہیں۔ وہ گورنر اور بھوسا صاحب کے ہاں  
صفا اپنے کے لیے لیا گیا ہے۔

یہ اعتراف ہے کہ میں نے لیا ہے۔ ایک ایسا مسلمان ہونے کو چاہیے کہ کسی کو نہیں  
نہیں کرتے گا۔ میں آپ کو یہ بات بھی اتنی ہواں کہ بھوسا صاحب کی وہ وہ ہیں اس لیے میں نے انھیں  
ہیں نہیں۔

اب میں ایک اور اعتراف کرتی ہوں جو خطی آگے کہہ میں لایا ہے جس سے آپ نے سنا ہے کہ  
یہ ہے ان وقتوں کی وہی ہوتی تھی وہی ہوتی ہے۔ کئی وقت میں فرار سے بڑے حسرت سب سے نہیں  
ان وقت فرار تھی میں جب وہ اپنے بچے کو ہر سڑگی سے بڑے حسرت میں کو ہوں کہ کچھ ہیں جہاں  
غریب انسان نہایت جاہل کے ہر کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنا کھانا ہی انھیں کھاتے ہیں  
اور میں کو ہوتے ہیں۔ مجھے ہوں گا جیسے کہ ہے میں کہ میں نے یہ صورت میں کھانا پانچ  
ہے میں نے یہ صورت میں کھانا پانچ ہوا ہے اب میرے ساتھ ایک ہی ہوا کہ میں نے یہ صورت میں کھانا پانچ  
پانچوں کو ایک خوشحال اور صحت سے پاک کرتے گا ہے آپ سے لگا رہا ہے۔

آخر میں میں اس بھوت تھی میں جو مجھے آتا ہے اور وہ اپنا میں واقع ہے تو میں میں  
ہے جو مجھے اپنے ہاں میں جا رہا ہے اس لیے زندگی کے سفر کے ہاں میں لگتے ہیں کہ وہ اپنے  
ہو رہی صورت سے انہ کا کھانا بھی میری انہ اور کچھ کھانے سے لگا رہا ہے۔

بھوسا صاحب کے گھر میں میں آپ کو ایک بہت اچھی پانچ کھانا اور آواز سے جہاں جاتے  
ایسی قاتلوں اور کڑے ہونے والی ہوتی ہیں ان کے ساتھ مجھے ہونے تو تو آواز سے ہوتے ہیں۔  
میرے کھانا تو سب سے پہلے کھا گیا ہے۔

جب ڈر کا وقت ہوا تو ہم نے اکٹھے وہاں بیٹھے۔ اس وقت ان کی دوسری بیوی حضرت بھوسا  
سوز تھیں۔ حضرت بھوسا کو میں نے ایک خوبصورت اور اچھے اظہار کی عاتقوں پانچ ان کے بعد بھوسا  
صاحب کا ایک بیٹا اندر آیا۔ ایک چھوٹا بچہ اس سے بالوں والا بچہ مجھے وہ ایک ماڈرن اور بوجھ بھوسا



















مڑے تھے۔ میں نے وہی لاگاس اور پیر کا اور اس کمرے سے نقل کیا۔ بارگاہی تو مجھے جزل سے روک لیا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کہنے لگا  
"No. Come on, calm down, have a seat, go back in."

میں غصہ اچ گیا اور کمرے میں وہیں چلا گیا۔ میں نے جزل یعنی کو یہ بھانے کی کوشش کی کہ میرے اور مجیب میں بہت فرق ہے۔ مجیب ایک عظیمہ کی پسند تھا میں نہیں۔

لیکن میری یہ ساری گفتگو بیکارگی۔ میری بات سننے کے بجائے جزل یعنی خان ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اور پھر نہیں کتنے گلاس شراب کے پیچھا چلا گیا اور پھر اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے بھنو صاحب سے کہا کہ کیا ایک لمحے کے لیے ہم دو بارہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ آپ مارچ کے اس خوفناک مہینے میں وہاں تک کیسے پہنچے تھے چاہے اس مہینے میں ہونے والے قتل عام کا علاقائی جواز تھا یا نہیں۔

بھنو صاحب بولے میری طرف دیکھو۔ 27 جنوری کو میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے ڈھاکہ گیا تھا۔ اگر میں نے شیخ مجیب سے بات چیت کرنی تھی تو پھر مجھے ڈھاکہ جانا ہی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے راولپنڈی آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس دن شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گیا تھا جس دن میری اپنی

سگی بہن کے خاندان کی موت ہوئی تھی۔ اسے لاڈکانہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ میری بہن مجھ سے بہت شدید ناراض ہو گئی۔ قومی انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان اور میں نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اب وہ اپنے چھ نکات پر اڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو کسی نہ کسی

معاہدے پر پہنچنا تھا۔ جزل یعنی خان مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم چار مہینے کے اندر اندر آئین پر کام کر لیں وگرنہ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے گا۔ شیخ مجیب کو یہ بات سمجھانے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ ان لوگوں سے ذہانت کی توقع نہیں کر سکتے جن کے پاس ذہانت ہی نہ

ہو۔ میں نے شیخ مجیب سے ان باتوں کی بار بار وضاحت کی، اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ کیا آپ میرے چھ نکات کو مانتے ہیں۔ میں ان چھ میں سے پہلے میں تین نکات پر بات چیت کے لیے تیار تھا لیکن میں چوتھا نکات کیسے مانتا جس میں یہ لکھا تھا کہ ہر صوبہ کسی بھی غیر ملک سے تجارت کر سکتا

میں نے اپنی سرکشی سے اس بات پر عمل درآمد کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کا سبب یہ بھی تھا کہ مجیب الرحمن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بھارتیوں کے ساتھ ساتھ 1971ء سے رابطہ بھی تھے۔ یوں جنوری کے مہینے میں ہماری یہ بات یہ تھی آگے نہ بڑھ سکی اور ہمارے ہی آ گیا۔

وسط مارچ میں یعنی خان کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔

کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو میں ڈھاکہ جاؤں گا۔ اگلے روز مجھے ایک ٹیلی گرام ملا کہ شیخ مجیب بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ ٹیلی گرام ڈھاکہ سے جزل یعنی خان نے مجھے خود بھیجا تھا۔ میں 19 مارچ کو ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ 20 مارچ کو میری

یعنی خان سے ملاقات ہوئی اور 21 مارچ کو میں شیخ مجیب الرحمن سے ملا۔ اس ملاقات میں یعنی خان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس وقت بڑا حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ شیخ مجیب یعنی خان سے بڑے پیمانے پر بات چیت کر رہے تھے۔ شیخ مجیب بولے کہ یعنی خان صاحب امیر تو آپ سے

معاہدہ ہو گیا ہے۔ میرا بھنو صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ہر ٹیس کو ہتاؤں گا کہ میری صدر صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور بھنو صاحب وہاں اتفاقاً موجود تھے۔ یہ بات سن کر یعنی خان بولے تو تو مجیب تم صرف اپنی بات کرو۔

شیخ مجیب نے یعنی کو جواب دیا کہ سندھری طوفانوں میں پہلے ہی بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے اپنی بات کو دہرایا۔ یہ ہے شیخ مجیب۔ اچانک اس کے بیمار ذہن میں ایک فقرہ اٹک سا جاتا ہے۔ ایک ایسا فقرہ

جس کا اس گفتگو سے دور دور تک تعلق ہی نہیں ہوتا جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ایک جنونی کی طرح اتے بار بار دہرا رہتا ہے۔ اس میٹنگ میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجھے فضا آ گیا کہ بھلا مشرقی پاکستان میں آنے والے سندھری طوفان کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آجاتی تھی۔ کیا وہ سندھری طوفان میں نے مشرقی پاکستان



بہا تھا۔ میری بات سن کر شیخ مجیب اللہ کھڑا ہوا اور کہا کہ اس نے ایک ہفتے میں شرکت کر چکی ہے اور وہ پارہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی آپ شیخ مجیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو آپ کو ہر بات کا قابل بیانی ہی لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بھلا ہونا کیسے اسے سمجھنے کی سے لیتی ہے۔

میرے شیخ مجیب نے جانے کی بات کی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اسے باہر تک چھوڑ کر آؤں۔ اگر پتہ میں لے مسوں کہا کہ شیخ مجیب یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں انہیں چھوڑنے جاؤں۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں بیگنی خان کے منٹری سیکرٹری اور اس کا سیاسی معاون جنرل عمر بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر شیخ مجیب چلا آیا کہ کمرہ خالی کرو۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں نے مسٹر بھنوں سے بات کر لی ہے۔ وہ مجھوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیخ مجیب میرے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا برادر، برادر۔۔۔ میرے بھائی نہیں کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے۔ خدا کے نام پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم یہ معاہدہ کریں۔

میں اس کی بات سن کر شدید حیران ہوا۔ میں اسے باہر لے گیا تاکہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ جب ہم باہر گئے تو اس نے انتہائی پند جوش سی آواز میں مجھے کہا کہ بھنوں صاحب! آپ مغربی پاکستان رکھ لو اور اسے مشرقی پاکستان سے دو۔ وہ بولا اس نے ایک خفیہ ملاقات کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ رات کے اندر میرے میں بھی وہ مجھے بلوائے گا اور وہ یہ سارے معاملات طے کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس طرح کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھاکہ اس سے ایک پورے طرح رات کے اندر میرے میں کیلے کے کسی درخت کے نیچے چھپ کر نہیں طے آتا ہوں اور نہ ہی میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قومی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھائے اور اپنی عدوی اکثریت پر مجبور کرے۔

مجھے یوں لگا کہ میں کسی دیوار سے ہاتھیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اپنے ترجمان کے ذریعے بات چیت کو جاری رکھنے کے اعلان پر کھپو مانا کرتا۔ یہ قومی دو ساری اصل کہانی اور دو سارا قصہ۔ ان دنوں وہ ایک طرح سے پاگل بنا ہوا تھا۔ اس کا دماغ کھوم گیا تھا

میں نے اپنے صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے 25 مارچ کو کوئی مجیب و غیر مجیب چیزیں مسوں

تعمیر کی تھیں۔ بہنو صاحب بولے یقیناً اس دن کوئی مجیب سا ماحول تھا۔ انہوں نے بھی ایک مجیب سی بی

تعمیر کی تھی۔ وہ ہر شام بیگنی خان سے ملنے جاتے اور اسے بتاتے کہ ان کے اور مجیب کے درمیان تعلقات آگے نہیں بڑھ رہے تھے لیکن بیگنی خان ان باتوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے۔ وہ میری بات سن کر اپنا منہ پر سے کر لیتے یا پھر ٹیلی ویژن کی ٹرانسمیٹیں کرنے لگ جاتے۔ وہ اس بات پر بڑبڑاتے کہ ان کا پتہ ہی سے ابھی ان کا ریکارڈ نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی پسند کے گانے نہیں سن سکتے تھے۔ 25 مارچ کی رات جنرل بیگنی نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ بولے آج مجیب سے ججنرل بیگنی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں اور تم دونوں مجیب سے اکٹھے ملیں گے۔ میں نے پھر بھی کہا کہ میں نہیں ٹیک ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک بندے کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے ہی ڈھاکہ سے چلا گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں نے صدارتی رہائش گاہ فون کیا اور بتایا کہ میں بیگنی خان سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ رات کے کھانے پر جنرل خان کے ساتھ ہیں۔ میں نے نکا خان کو فون کیا تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس وقت بیگنی خان کے ساتھ کھانے پر ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے شک پڑا کہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں رات کا کھانا کھانے چلا گیا اور پھر سو گیا۔ میری آنکھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کھلی۔ میں نے اپنے دوستوں کو کمروں سے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں رو پڑا اور میرے منہ سے

My country is finished!

میں نے بہنو صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی کھڑکی سے کیا دیکھا تھا؟ بہنو صاحب بتانے لگے کہ اگرچہ لوگوں کو اندھا دھند نہیں مارا جا رہا تھا، تاہم یہ ضرور تھا کہ قومی پرانے کے People نامی اخبار کے دفاتر کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہمارے ہونٹ کے بالکل



ساتھ واقع تھے۔ فوجی 3000 فوجیوں پر فتح کر لوگوں کو اس جگہ سے دور جانے کا کہہ رہے تھے۔ جو انھوں سے باہر آئے انہیں مشین گنیں دکھا کر ایک طرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروہ میں کو دوسری جانب مشین گنوں کی مدد سے ہاتھ پر روک لیا گیا تھا جبکہ ہوشی کوئیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جس نے بھی ہوش میں نہ رہا لیکن کوشش کی وہ سیدھا فوجیوں کے ہاتھ لگا۔

میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صبح آٹھ بجے جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ چھٹیں شیخ مجیب زندہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں ضرور آئی کہ انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ بد تیزی کی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس کی گرفتاری سے اس کے ساتھ کچھ روز گزار کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ اسے ایک دو ماہ سے زیادہ جیل میں نہیں رکھیں گے اور اسی اثناء میں ہم اٹھاکہ میں لاہور آجڑا رڈ پر قابو پالیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ جناب صدر مجیب نے آپ سے کہا کہ آپ مغربی پاکستان لے لو اور میں مشرقی پاکستان رکھ لیتا ہوں اور بعد میں بالکل سب کچھ ہوا۔ کیا آپ شیخ مجیب سے اس بات پر نظر کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب نے زور سے کہا کہ بالکل نہیں اور میں یہ بات انڈین فیشن میں بھی نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو پورے غلطوں سے کہہ رہا ہوں کہ میں اسے نظر کرنے کے بجائے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس میں شکامن کنس ہے نہ ہی کوئی کچھ۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں ہے کہ کوئی سیاسی رہنما، معاشی یا عالمی مسئلہ حل کر سکے۔ اسے صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے کہ چلا نا کیسے ہے۔ میں اسے 1954ء سے جانتا ہوں اور میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میری اس سے جس لمحے ملاقات ہوئی تھی میں اسی وقت سے اس کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ وہ محض ایک Agitator تھا جس کے اندر بہت آگ بھری ہوئی تھی لیکن آئینڈ یا ایک بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی آئینڈ یا تھا بھی کسی تو وہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اب ایسے شخص کے ساتھ آپ بھلا ہمدردی کا ہتھ پھوس کرنے کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ 1961ء کی بات ہے۔ میں اٹھاکہ گیا اور میری شیخ مجیب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ 11

میرے ہوش کی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں چل کر اس کے پاس گیا اور کہا جیلو مجیب آزاد جانے کا ایک کپ بتاتے ہیں۔

دو انٹرویو نیا نیا نیٹیل سے باہر آیا تھا اور اس میں کئی بھری ہوئی تھی اور ہم نے اس واقعہ سے کئی دنوں سے گفتگو کی۔ شیخ مجیب مجھے بتاتا رہا کہ کیسے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ہاتھوں انحصار کون سے منظر کی طرح حکومت کی جا رہی تھی۔ اس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب کی اور ہاتھ ڈھا کہ پر ایک کالونی کی طرح حکومت کی جا رہی تھی۔ تاہم شیخ مجیب الزمن نے یہ باتیں بھی کہیں۔ میں نے بالکل سب کچھ ایک کتاب میں بھی لکھی تھیں۔ تاہم شیخ مجیب الزمن نے یہ باتیں ہاتھوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ غلطی معاشی نظام میں تھی۔ اس دور ایٹان ہاتھوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کے منظر انوں میں تھی۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس وقت جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ فوج کو چاہیے تھا کہ وہ ان نا انصافیوں کا خاتمہ کرے۔ اس کے اندر جرأت کبھی تھی ہی نہیں۔ یاد دہانی اپنے آپ کو صحافیوں کے سامنے شیر بنگال کہتا ہے۔

بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ ہاں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب اس کا ٹرائل کیا گیا تو اس نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گرفتاری کے بعد اس نے ایک ہیرو کی طرح کارروائی اختیار کیا۔ اسے ایک ایسے سیل میں رکھا گیا جہاں سونے کے لیے ایک گدا تک بھی نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے کہا کم آن۔ اسے کبھی کسی جیل کے سیل میں نہیں رکھا گیا۔ اسے ایک ایسے پارٹنٹ میں رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر بڑے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ اسے پنجاب کی میانوالی کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے اخبارات اور نئے کے لیے ریڈیو فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے پاس گورنر پنجاب کی بہت بڑی لائبریری کی کاپیاں موجود تھیں اور وہ وہاں بڑے اچھے طریقے سے رہا۔ کئی موقعوں پر تو اسے بنگالی خانہ ماں بھی دیا گیا کیونکہ وہ بنگالی ڈسٹریکٹ کا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ٹرائل کے موقع پر اپنا دفاع بھی کیا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے دو بڑے وکیلوں کمال حسین اور اس کے بیرونی کی خدمات بھی مانگیں جو اس کا قانونی مشیر اور دست بھی تھا۔ کمال حسین ان دنوں جیل میں تھا لیکن ہمدردی صاحب آزاد تھے۔ ہمدردی کو اپنا وکیل بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے پاس بہتر سے بہتر وکیل آپ کا دفاع کرنے کے لیے موجود ہو۔ میں







بھٹو صاحب نے کیا نہیں دیکھی تھی اور وہ بھی کتنا ہے وہ دوسری طرف ایک پاکستانی ہے  
 اور وہ دونوں نے کئی ایک طرف کے اثرات دیکھے ہیں۔ ہم نے ایک طرف کے متعلقہ ماہ کا سامنا  
 کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی انہوں نے اس میں ایک قسم کا جوش دیا ہے۔ اس کے علاوہ  
 ہوں جب مجھے انہوں کا دور دورہ آیا ہے تب اس نے میرے بازو کو زور سے پکڑا اور دستکیاں لے کر  
 پھر خواہست کی تھی کہ مجھے پھانسی پھانسی میں دھکیں ان کے لیے بھاری بھاری مسموم کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ  
 مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جہازوں کو زیادہ دیر تک اترنے میں نہیں رہے گا۔ آٹھ ماہ گزر گئے ہیں۔ جو بھی  
 ایک سال چلے گا وہاں ہادی جہازوں سے پھانسی دیا جائے گا۔ آج آپ دیکھ رہے  
 ہیں بلکہ دیکھ لیں ان کا 1947ء کا دور بہت جلد ہی روئے گا۔ 1947ء کے دنوں کا اور عجیب کیونست نہیں  
 ہے۔ اگر عجیب ان تمام معاملات کو اچھے طریقے سے سمجھ لیں گے تو ان کے سامنے ایک نیا جہاز بھی  
 بہت جلد اس کا سامنا Macists سے ہوگا جو اس جنگ کے اصل قاتل ہیں۔ وہ پہلے ہی اس پر ہادی جہاز  
 رہے تھے۔ سیاسی طور پر کتنی ہائی کچھ بھی نہیں۔ اگر معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک طرف سے کوئی  
 نظریہ ہی نہیں۔ کتنی ہائی کو صرف ایک چیز آتی ہے کہ وہاں کوئی کیسے چلائی ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ کیسے کرنا  
 ہے۔ کیسے مال چرانے ہے اور Jai Bangla کے نعرے کیسے لگانے ہیں۔ اور آپ محض نعرے لگا کر ایک  
 ملک نہیں چلا سکتے بلکہ دوسری طرف بلکہ Macists نے موزے لگے کی آدمی مال کتاب پڑھی ہوئی  
 ہے لیکن وہ سمجھدار ہیں اور بھارتیوں کو یہاں جہاز نہیں اپنے کہ وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ میرا نہیں خیال  
 کہ وہ پاکستان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ آپ دیکھیے گا برتری انہی کو ہی ملے گی۔ اسے خوفناک اور  
 عجیبہ و مساک کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو ایک مجلس کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ ذرا تصور کریں کہ  
 شیخ مجیب الرحمن جیسا شخص ان تمام مساک سے ڈیل کر رہا ہے اور پھر یہ زمین (بلکہ دیش) بہت پر نصیب  
 دھرتی ہے۔ سندھری طوفان و سیلاب اور دیگر مصیبتیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا  
 جائے گا کہ وہ کسی منوں ستارے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ آپ نے اٹھا کہ کو 1947ء میں دیکھا تھا اور  
 1954ء میں بھی ایک گندہ سا گاؤں جہاں کھیاں تک نہیں تھیں اب وہاں ہر چیز تباہ ہو چکی ہے اور اسے  
 چاہنے میں بلکہ دیش کی کتنی ہائی کے ڈاکٹار نہیں نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

میں نے جب بھٹو صاحب کے منہ سے بلکہ دیش کا نام سنا تو میں بڑی حیران ہوئی اور ان سے

کہا کہ آپ کے منہ سے بلکہ دیش کی بات ہو رہی ہے؟

بھٹو صاحب میری حیرانگی دیکھ کر بولے کہ صرف ظاہر ہے میں بلکہ دیش کا نام لیتے اور ظہرت  
 کے ساتھ لے رہا ہوں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ مشرقی پاکستان ہے۔ اب گنگا و گنگا۔ اگرچہ یہ بھی  
 بھارت کی فوجی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ بھاس ملک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی اسے تسلیم کرنا  
 چاہیے۔ میں بھی اسے تسلیم کرنے کو چاہوں اگر بھارت اسے تسلیم کر لے اور بھارتیوں کا وہاں  
 کئی عام بند کیا جائے اور پاکستان کے ماسیوں کو مارا جائے۔ اگر ہم نے دو بارہ ایک لٹیر پٹن میں ضم  
 ہونا ہے تو ہمیں سٹارٹی تعلقات قائم کرنے چاہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے چندہ سالوں میں پاکستان  
 اور بلکہ دیش دو بارہ ایک فیڈریشن بن سکتے ہیں۔ یہ بن سکتے ہیں اور انہیں بنا بھی چاہیے ورنہ اس  
 دیکھم کو کون پورا کرے گا۔ دوسری طرف مغربی بنگال بھی بھارت سے علیحدگی چاہتا ہے۔ مشرقی بنگالیوں  
 اور مغربی بنگالیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے جبکہ ہمارے اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے درمیان  
 ایک لمبے مشترک ہے۔ 1947ء میں ہونے والی تقسیم بہت اچھی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب اور ہی کٹھ۔ کیا آپ نے ایک ایسا ملک 1947ء میں بنا یا جو ایک  
 دوسرے سے دو ہزار کلومیٹر دور اور درمیان میں انڈیا تھا۔

بھٹو صاحب بولے کہ آپ یہ بات کیوں بھول رہی ہیں کہ یہ دونوں علاقے باوجود بہت ساری  
 قلیوں کے پچیس سال تک ایک ملک کا حصہ رہے۔ ایک ریاست محض علاقائی یا جغرافیائی تصور بھی نہیں  
 ہوتی۔ جب آپ کا جہنڈا قومی ترانہ اٹھ رہا ہے تو پھر قاسلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب  
 مسلوں نے انڈیا کو اکٹھا کیا تھا تو مسلمانوں کو اس کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لیے پورا ایک سو سال  
 لگا تھا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعے محض دو گھنٹے لگتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔

میں نے کہا جہاں صدر انہیں۔ مجھے اندرا گاندھی کی بات زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے جب وہ یہ  
 کہتی ہیں کہ 1947ء کی تقسیم ملحد تھی اور 1970ء کی وہاں میں لمبے کی لڑائی ایک امتحان چیز تھی ا

بھٹو صاحب بولے اسز گاندھی کے ذہن میں صرف یہ خواب ہے کہ وہ پورے برصغیر پر قبضہ کر  
 کے ہمیں اپنا رعایا بنا جائے۔ وہ ایک کنفیڈریشن بنا کر پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کرنا  
 چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھائی بھائی نہیں







ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی نہیں کہہ رہا کہ وہ ہمارے تو سے بڑا فوجی واپس کرنے کو چاہتا تھا۔ یہ وہی  
 بیٹا کوئی کچھ کا احترام نہیں کر رہی۔ میں تو آپ کو وہ بتا رہا ہوں جیسا میں نے اسے پایا ہے۔ وہ ایک ایسی  
 قانون میں جن میں سچے دکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج وہ ان دنوں سے زیادہ  
 بڑھ رہی ہے وہ آکسفورڈ میں پڑھتی تھی یا لندن میں ہونے والے ایک پیپر میں شخصی نوٹس لے رہی  
 تھی۔ اللہ ارے اسے اصرار رہا ہے اور کامیابی سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ لیکن اصل سوال یہ نکلا  
 ہے کہ اسے اس کی خوبیوں سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اگر پاکستان اور انڈیا نے ایک کنٹریڈیکٹری  
 فن تو مجھے سزا دیا گا ندھی سے ان کا یہ عہدہ لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں ان سے Intellectual  
 Confrontations بھی فوٹو نہ نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی میں سزا گاندھی سے کسی بھی  
 جگہ ملنے کو تیار ہوں جہاں وہ پسند کریں۔ میں نودہلی جا کر بھی ان سے ملاقات کے لیے جا سکتا ہوں۔  
 مئی ہاں میں ان سے ملنے کے لیے نودہلی بھی جانے کو تیار ہوں۔ تاہم جو بات مجھے پریشان کرتی ہے  
 وہ یہ ہے کہ مجھے بھارتی فوج کا رڈ آف آزر نہیں کر رہی ہے اور میں اندرا گاندھی سے ملاقات کر رہا  
 ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے پتہ نہیں کیوں ابھی نہیں لگتیں۔ خدا را مجھے ان دونوں چیزوں کے بارے  
 میں سچے پتہ بخور بھی نہ کرے۔

بھنوسا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ یہ باتیں چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ سزا اندرا  
 گاندھی نے ان کے بارے میں مجھے اپنے انٹرویو میں کیا کہا تھا۔

میں نے بھنوسا صاحب کو جواب دیا کہ وہ کہتی تھیں کہ آپ ایک غیر متوازن شخصیت کے مالک  
 انسان ہیں۔ آپ ایک دن ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے دن دوسری۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ آپ  
 کے بارے میں کسی کو کوئی پتہ نہیں چلنا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔  
 بھنوسا صاحب بولے۔ واقعی؟

بھنوسا صاحب نے کہا میں آپ کو اس کا بڑا سیدھا سا جواب دیتا ہوں۔ مجھے مشہور فلاسٹر لاک کی  
 Consistency is a virtue of small minds ہے کہ (اگرچہ بھنوسا صاحب نے یہ مشہور فقرہ لاک کے نام سے کہا۔ دراصل یہ بات ایمرن نے کہی تھی۔ اس نے  
 کہا تھا Consistency is the hobgoblin of little minds۔ مترجم)

بھنوسا صاحب نے کہا کہ دوسرے لکھوں میں میرے خیال میں آپ کا بنیادی تصور ضرور ایک ہے  
 ہے جس میں اس کے اندر بھی تبدیلی کی گنجائش ہوتی چاہیے۔ آپ کبھی ایک بول پر چلے یا نہیں تو کبھی  
 دوسرے پر۔ ایک دانشور کو صرف ایک خیال کے ساتھ چٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے خیالات میں  
 یکسوئی چاہیے وگرنہ اس کے خیالات ذرا سے یا ظلم میں کسی کردار کی لمبی تقریر جیسے ہی ہوں گے۔ یہ  
 بات سیاستدان پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاست بھی ایک تحریک کی طرح ہوتی ہے اور ایک سیاستدان کو  
 ہی سواہل رہنا چاہیے۔ اسے کبھی راست تو کبھی لیلٹ کی طرف گھومنا چاہیے تو کبھی اس کے اندر  
 نادات اور شکوک بھی ابھرنے چاہیں۔ اسے مسلسل اپنے آپ کو بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کو ٹیسٹ  
 کرتے رہنا چاہیے اور ان پر ہر سائینڈ سے حملہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مخالفین کے کنٹرول پر ماتحت  
 اور دیکھ کر ان پر حملہ کر سکے۔ اس شخص پر ترس کھانا چاہیے جو ہر وقت اپنے ایک بنیادی خیال سے چمٹا رہے  
 اور اس سے ہمدردی کرنی چاہیے کہ اگر وہ اپنے اس بنیادی نقطے کا انکشاف کرتا ہے۔ اظہار ایک غیر  
 مستقل مزاجی کسی بھی ذہن شخص اور مجھے ہوئے شخص کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات سزا اندرا  
 گاندھی کو سمجھ نہیں آتی تو پھر مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے سیاسی پٹے کی اس خوبصورتی سے  
 باآشنا ہے۔ یہ بات بہر حال سزا گاندھی کے والد نہرو کو اچھی طرح پتہ تھی۔

میں نے بھنوسا صاحب کو بتایا کہ اندرا گاندھی تو کہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب نہرو سیاستدان  
 نہیں بلکہ ایک Saint تھے۔ (یہ خطاب دراصل رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس چرچ ایک بہت ہی اچھے  
 اور نیک انسان کو اس کی موت کے بعد دیا کرتے تھے۔ مترجم)

بھنوسا صاحب فوراً بول پڑے اور ان کے منہ سے نکلا وہ۔ سزا گاندھی اپنے باپ کے بارے میں  
 یہ غلط بات کہہ رہی ہیں۔ ان کا باپ ایک بہت عظیم سیاستدان تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں اپنے  
 باپ کی آدمی خوبیاں بھی ہوتیں۔ اگرچہ نہرو پاکستان کے قیام کے خلاف تھا لیکن پھر بھی میں اس کی  
 خوبیاں کا محرف ہوں بلکہ جب میں نوجوان تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کا بہت بڑا فین تھا۔ یہ تو  
 مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ ان کے حصے کی اپنی ناکامیاں تھیں۔ ان  
 میں بھی نمایاں تھیں اور وہ سٹائن، چرچل یا موزے ٹگ کی کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بھنوسا صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ اس کے علاوہ سزا گاندھی نے ان کے بارے میں اور کیا کہا؟



میں نے صاحب کو یہ سنا کر بہت خوش ہوا۔ یہ سنا کر کہ 1977 میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی تھی۔

صاحب نے یہ سنا کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سنا کر کہ 1977 میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی تھی۔

دراصل سڑک گزری یہ بات بھولنے کا تازہ دہی ہیں کہ ہم نے تین دنہ کیمبر پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری نومبر 29 کو جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جو ہلکا ہلکا کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے یحییٰ خان کو کہا تھا کہ آپ تو ایسے پیٹھے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل بھارتوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلارہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل یحییٰ کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار دفعہ بھارت پر جو ہلکا ہلکا کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل یحییٰ نے بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر اپنے ٹیکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک اٹھارہ کی بات ہے میں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر اٹھارہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم اٹھارہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنا لیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک بھارت سے جنگ لاریں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم، یحییٰ خان کے ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں ہنگامہ دہی کا ہمنڈا ہرا دیں اور جب اسی جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو میں نے خدا سے کہا تھا بہتر ہوتا کہ میں اس سے پہلے ہی میں مر جاؤں۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے میں اس

میں نے صاحب کو یہ سنا کر بہت خوش ہوا۔ یہ سنا کر کہ 1977 میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی تھی۔

صاحب نے یہ سنا کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سنا کر کہ 1977 میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی تھی۔

دراصل سڑک گزری یہ بات بھولنے کا تازہ دہی ہیں کہ ہم نے تین دنہ کیمبر پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری نومبر 29 کو جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جو ہلکا ہلکا کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے یحییٰ خان کو کہا تھا کہ آپ تو ایسے پیٹھے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل بھارتوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلارہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل یحییٰ کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار دفعہ بھارت پر جو ہلکا ہلکا کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل یحییٰ نے بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر اپنے ٹیکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک اٹھارہ کی بات ہے میں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر اٹھارہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم اٹھارہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنا لیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک بھارت سے جنگ لاریں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم، یحییٰ خان کے ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں ہنگامہ دہی کا ہمنڈا ہرا دیں اور جب اسی جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو میں نے خدا سے کہا تھا بہتر ہوتا کہ میں اس سے پہلے ہی میں مر جاؤں۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے میں اس



مجھے کرکٹ کے دو سٹے ٹیک لڑیے کر دیئے۔ جونہی میری شادی کی رسومات ختم ہوئیں میں بھاگ کر کرکٹ کھیلنے پہنچ گیا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے ملک میں ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جنہیں مجھے تبدیل کرنا چاہیے۔ میں پھر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں تو میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے والے ایک کلاڑی دوست جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، کی شادی ایک 32 سالہ خاتون سے کر دی گئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ یا تم تو ٹوٹا قسمت ہو کہ تمہاری بیوی 23 برس کی تھی اور تم 13 برس کے! جب میں اپنی دوسری بیوی نصرت کی محبت میں گرفتار ہوا تو میری عمر اس وقت 23 برس تھی۔ نصرت اس وقت لندن میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایرانی تھی اور ان میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت تھی، پھر بھی میرے لیے اسے شادی پر رضامند کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اسے منانے کے لیے کوئی زیادہ دلیلیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے صرف دو تین الفلاہی کہے تھے کہ کیا ہوا اگر میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اب میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اپنی پہلی بیوی کا خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کزن ہے بلکہ یہ بھی کہ اب وہ میری ذمہ داری ہے۔ اس بھاری کی تمام عمر اس اہمقانہ شادی کی وجہ سے جاہ ہو کر رہ گئی جو ایک 13 سال کے بچے سے کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی زیادہ روایت ہے جس میں ہم سب ہل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ وہ میرے لاکھانہ والے گھر میں رہتی ہے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تہا زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں ہی نہیں بن سکی جبکہ میری دوسری بیوی سے میرے چار بچے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزارا ہے۔ میں جونہی تھوڑا سا بڑا ہوا میں پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔ یہ انسانی کی ایک اپنی داستان ہے۔ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ سب کچھ کروں گا جس سے لوگ دوسری شادی نہ کریں۔ پھر دوسری شادی کے بعد بہت بڑے معاشی مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ وہاں الگ گھروں اور شہروں میں رہتی ہیں جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اب ہر کوئی میری طرح بھی وہ وہاں مختلف شہروں اور گھروں میں افراتفری کر سکتا۔ اگرچہ میں کوئی اتنا امیر آدمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے جرائی سے بھٹو صاحب سے پوچھا۔ کیا آپ واقعی امیر نہیں ہیں؟

بھٹو صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نہیں میں اس طرح امیر نہیں ہوں جیسا آپ کے ہاں سمجھا

جاتا ہے۔ یہاں جس کے پاس بہت ساری زمین ہو اسے امیر سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس وہ یورپ کے ان لوگوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے Giggolo کھیلتے ہیں۔ ہماری زمینیں خشک ہیں اور پیداوار کم ہے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں نسبتاً ایک امیر آدمی ہوں۔ میں ایک اچھی زندگی گزارتا ہوں۔ میری بہن بھی ایک اچھی لائف گزار رہی ہے۔ میرے بھائی نے بھی اچھی زندگی گزارنی اور ہم اچھے سکولوں میں پڑھنے گئے لیکن ہم نے کبھی ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں کبھی بھی پٹے پوائے نہیں رہا۔ جب میں امریکہ میں سٹوڈنٹ تھا اور بعد میں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، میں نے وہاں کوئی کار نہیں خریدی۔ میں نے بیسوں کو ہمیشہ بڑی احتیاط سے خرچ کیا ہے، مثلاً میں نے پیسے کو یورپ جانے اور اچھے لوگوں سے ملنے اور کتابیں خریدنے پر خرچ کیا ہے۔ اگر آپ میری لائبریری پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا ہے۔ میرے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جن میں بہت ساری پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ میں مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح سپورٹس سے! چند لوگ میرے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ڈریس کپڑے پہنتا ہوں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی دولت کپڑوں پر اڑاتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہننے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک صاف ستھرا انسان ہوں۔ میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان بھارتی اور پاکستانی شہزادوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو گندے رہتے ہیں اور ان سے ٹو آتی ہے۔ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے، لیکن بہت بڑے عرصے تک میرے ان گھروں میں ایئر کنڈیشننگ نہیں تھی۔ میں لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتا ہوں لیکن احمق اور ناقوف لوگوں کو نہیں اچھے رقص کرنا آتا ہے لیکن اس وجہ سے کیونکہ مجھے میوزک پسند ہے۔ دوسرے امیں اس وقت دیوار پر لگا ہوا ایک ساکت پھول بن کر نہیں رہ سکتا جب دوسرے رقص میں مصروف ہوں اور آخر میں۔۔۔۔۔

میں نے بھٹو صاحب کی بات ان کے منہ سے اچک لی اور بولی کہ آخر میں آپ کی یہ ریپورٹیشن ہے کہ خوبصورت عورتیں آپ پر مرتقی ہیں۔ آپ ایک Don Juan ہیں۔ جناب صدر! کیا یہ بات درست ہے؟



بھنو صاحب نے کہا کہ یہ بات بھی نہ جانے کیا کر لیاں کی گئی ہے۔ میں ایک روز ایک شخص  
 ہوں اور میرا یہ خیال نہیں کہ وہ ایک ہونے بغیر آپ ایک اچھے یا تمہارا ہی سکتے ہیں اور ایک  
 روز ایک شخص ہونے کے بارے میں خیال ہے کہ ایک آٹھویں سے بڑا آپ کو سہارا کرنے کی اور کوئی  
 چیز نہیں ہوتی۔ کسی کی محبت میں گرفتار ہونا یا کسی محبت کے دل کو فتح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔  
 آپ کو ان لوگوں پر رحم کرنا چاہیے جو محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ آپ سبکدوشی اور محبت میں گرفتار ہو  
 سکتے ہیں اور میں بھی محبت میں گرفتار ہونا ہوں۔ میں معاملات پر بہت یقین رکھتا ہوں اور ایک شخص ہوں۔  
 میں محبتوں کی عزت کرتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان مردہ محبتوں کی عزت نہیں کرتے۔ وہ لوگ  
 جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ محبتوں کی عزت اور ان کا تحفظ کرنا ہمارے حضور پاک کی پہلی  
 تعلیمات میں سے ایک ہے۔ میں نہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے کا شوق نہیں رکھتا۔ ایک دفعہ ایک  
 شخص کو اسے کوڑے مارے کہ اس کے جسم سے خون نکل آیا آپ کو پتہ ہے میں نے اسے اسے کوڑے  
 کیوں مارے کیونکہ اس نے ایک چھوٹی سی لڑکی کا رہا کیا تھا اس طرح ایک مکان میں جسے سے پانچ سو  
 کیا تھا جب میں نے یہ پتہ چا کہ چھ سو چالیس نے لڑکی کے سامنے پر چھ سو چالیس لڑکیوں کے  
 کپڑے بڑی ڈالے تھے۔ یہ سوائس کپڑے کے۔ میں انہیں مارا شل کے ذریعے ٹھیک کر دیں گا۔ میں اس  
 کے ساتھ بھی بکھو کر پاتا ہوں۔ اگر مجھے اس چیز کا یقین ہو گیا کہ وہ اس میں تارے نہیں نے  
 وہاں کی محبتوں پر تھا کیا تھا تو میں سوچتا ہوں کہ اس بات پر سزا کرے گا کہ ایسے نہیں کو  
 برا لگتی ہوتی۔

میں نے کھنکھ کا مضمون پڑھنے کے لیے بھنو صاحب سے کہا کہ مجھے کسی اور مضمون پر بات  
 کرتے ہیں۔ آپ کے مازکرم کی بات کرتے ہیں۔ آپ اپنے ان نظریات کا اپنی امارت اور اسلام  
 کے نظریات سے کیسے آپ کرتے ہیں؟

بھنو صاحب بولے میں شخص معافی معاملات میں اپنے آپ کو مارکتا ہوں۔ میں صرف  
 معافی معاملات میں مارکتا ہوں۔ ہمارے مازکرم کی زندگی کے بارے میں سچ  
 کی گئی تھی اور اس سوال پر کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں جیسے سوالات پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک اچھے  
 مسلمان کی طرح میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ لہذا پانچ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایمان ایک

لنگا جی ہے جو وہ جو رکھتا ہے یا جس رکھتا۔ اگر ایمان کا وجود ہے تو پھر اس پر بحث کرنا فضول ہے۔ میں  
 ایمان پر یقین رکھتا ہوں اور میں اسے مازکرم کے فلاسٹیک پیلوڈس کی وجہ سے ترک کرنے کو چاہتا ہوں  
 ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اپنے آپ کو مارکتا اور مسلمان کہتا  
 لنگا جی ہیں جو ایک ساتھ چل سکتی ہیں خصوصاً پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں جہاں سٹیٹیک  
 مازکرم کے علاوہ مجھے اور کوئی مل نظر نہیں آتا۔

میں نے پاکستان کی بات کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی عالمی خدائی فوجدار چار کر  
 رہا ہوں۔ میں دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے ملکی حقائق پر توجہ  
 کرتا ہوں اور اس میں ایک انقلابی شخص ہوں لیکن میں اپنا کھ اور خوبی انتہا بات افورڈ نہیں کر سکتا۔  
 پاکستان ایسے انتہا بات کا قائل نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ہوتا تو یہ بہت بڑی چالی ہوگی لہذا مجھے انتہائی صبر  
 کے ساتھ اصلاحات متعارف کروانی ہوں گی اور ایسے اقدامات کرتے ہوں گے جو دوسرے دوسرے  
 ایسے مازکرم کی طرف لے کر جائیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں نیشنلائزیشن کی پالیسی اپنائی جائے اور جب  
 ضرورت پڑے تو اس سے دور بھی رہا جائے۔ سب سے بڑا کہ ہم غیر ملکی سرمایے کی بھی قدر کریں گے  
 جس کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے۔ مجھے صبر سے کام لینا ہوگا۔ ایک ایسے سرچین کا کہہ دو اور کہہ دو  
 معاشرے میں انہی پر قوم پرست یا انتہا پسند نہیں گھوڑ رہتا۔ یہ ایک بھاری معاشرہ ہے اور اگر آپ نے اس  
 معاشرے کو پانچوں سے مرنے سے بچانا ہے تو پھر آپ کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آپ کو  
 نہ صبر کے ساتھ ایک رخم کے ساتھ ساتھ جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔ آپ کو اصلاحات کی کامیابی کے لیے  
 بھی صبر سے کام لینا ہوگا۔ ہم صدمہ میں تک سوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو دیکھیں کہ شہرہ میں  
 لیکن جیسے انقلابی لہر کو بھی کبھی دمانہ کرنے پڑ گئے تھے۔

میں بولی کہ بھنو صاحب بہت سارے لوگ آپ کی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ ان کا  
 خیال ہے کہ آپ کو صرف طاقت چاہیے اور کچھ نہیں اور اقتدار میں رہنے کے لیے آپ کچھ بھی کر گزریں  
 گے اور آپ کئی بھی ان چیزوں سے دستبردار نہیں ہوں گے جو اس وقت آپ کے پاس ہیں؟

بھنو صاحب بولے کہ یہ بالکل لٹلا ہے۔ میں نے تین مہینوں میں ذریعہ اصلاحات کی ہیں اور  
 میرے اپنے خاتمہ ان کو 45 ہزار ایکڑ زمین چھوڑنی پڑی ہے۔ میری اپنی ذاتی چھ سے سات ہزار ایکڑ



وہیں ان اصلاحات میں جلی کی ہے۔ میں اس کی بھی خبر دے رہا ہوں ان اصلاحات میں اس وقت تک کہ میرے  
بچے اس کی اپنی زمین گھاٹی کے۔ خدا میرا گواہ ہے کہ میں نے ان کے خلاف کیا نہیں کیا۔ اس کی اپنی  
کوہلو میں کی بنا پر ان اصلاحات پر وجہ سے میرے کام نہیں کر رہا۔ جس دن میں نے اس کو چھوڑا  
اس دن سے مجھے ان ہی ان کو گوارا ہے میں کوئی ٹولہ محسوس نہیں کرتا میری ہیں۔ میں آپ کو دیکھ  
اور وقت میں تاکتا ہوں اب میں نے اس کو پہلی دفعہ ملنا تھا۔ مئی 1945ء۔

جہاں تک میرے اپنے الزامات کی بات ہے کہ میں صرف اللہ کا ہوا ہوں میرا خیال ہے کہ  
یہ بلا ضروری ہے کہ ہم یہ بات سمجھیں کہ طاقت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے نزدیک پاور وہ نہیں ہوتا جو  
بازار میں بیٹی کے پاس تھا۔ طاقت سے میری مراد ہے وہ چیز جس سے آپ پہاڑوں کو گرا کر زمین پر مار  
کرتے ہیں۔ جس سے صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جہاں ہوا  
اور دولت سے کوئی نہیں مرنا۔ میں ڈیکٹیٹر نہیں بننا چاہتا لیکن اس وقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بہت  
زیادہ لطف ہونا پڑے گا۔ میں جن کوئی ہوئی کمزریوں کو وہ بارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ کڑیوں  
میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ مجھے کڑیاں اٹھا کر باہر پھینکی ہوں گی اور اگر میں نے ان کڑیوں کو پھینکتے وقت  
احتیاط نہ کی تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ میرے پاس صرف ایک بازار روہانے گا۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ  
آپ سیاست محض کیل کو کے لیے جان نہیں کرتے۔ آپ سیاست اس لیے کرتے ہیں تاکہ طاقت  
حاصل کر سکیں اور اسے اپنے پاس رکھیں۔ جو یہ بات نہیں ماننا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیاستدان ہمیشہ آپ  
کو یہ نہیں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھے ہیں، بہت اچھے کردار کے مالک ہیں اور  
مستقل مزاج ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ اس طرح کے سیاستدان کا کوئی وجود نہیں ہوتا جو  
اچھا ہو، اخلاقی لحاظ سے بہتر اور مستقل مزاج ہو۔ سیاست کچھ لوگوں کا کام ہے۔ میرے باپ نے ایک  
دفعہ مجھے ایک بات بتائی تھی کہ کبھی کسی شخص پر اس وقت ہاتھ مت اٹھاؤ جب تک آپ اس کے ہاتھوں مار  
کھانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ باقی چیزیں ہمارے سکاؤٹ سٹف ہے اور میں ہمارے سکاؤٹ کی وہ تمام  
خوبیاں اس وقت سے بھول چکا ہوں جو میں نے سکول کے دنوں میں سیکھی تھیں۔

میں نے کہا کہ صوبہ صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مسیحی تھے اور پوپ  
کی آغوش میں تھے۔

اور اس کے احوال برطانوی کے پر عمل اور اس کے نتائج کے بارے میں کئی کئی چیزیں ہیں۔ یہ  
آپ مجھ سے یا میری طرف سے کہہ سکتے ہیں کہ میں ایک فاسٹ ہوں اور آپ کی اصلاح کے لیے مجھ سے  
کئی فاسٹ نہیں ہوں۔ کوئی بات تو یہ ہے کہ ایک فاسٹ ہونا میرا فخر ہے اور میں اس سے  
بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ایک فاسٹ دامن باز سے تعلق رکھتا ہے جبکہ میرا تعلق اس میں باز سے  
ہے۔ ایک فاسٹ مٹی بوڑھا ہوتا ہے جبکہ میرا تعلق آریٹلو کریسی سے ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے  
بارے میں کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کا ہیرو ہے۔ میرے بھی اپنے  
ہیرو تھے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک طالب علم تھا۔ یہ ہیرو بھی ایک ہیرو تھے کی طرح ہوتے  
ہیں۔ آپ انہیں منہ میں چباتے ہیں اور پھر نکال کر پھینک دیتے ہیں اور اس کی جگہ نئی ہیرو نگم رکھ دیتے  
ہیں۔ یہ ہیرو آپ کو جوانی میں اچھے لگتے ہیں۔ تاہم، اگر آپ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ اب تک میں نے  
کتنے ہیرو کو منہ میں چبایا ہے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دیتا ہوں۔ چنگیز خان، سکندر اعظم، ہنری ہال  
اور نیپولین۔ نیپولین کو میں سب سے بڑا ہیرو دیکھتا تھا۔ میں روس کا بھی بڑا فین رہا ہوں۔ اس کے علاوہ  
کبھی مجھے Mazzini, Cavour اور Garibaldi کو بھی چبانے کا موقع ملا ہے۔ آپ کو اندازہ ہو  
گیا ہوگا کہ میرے اندر کتنے تضادات تھے۔

میرے منہ سے نکلا "آئی سی"۔

میں نے بھنو صاحب سے کہا کہ چلیں، آپ کی شخصیت کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لیے آپ مجھے یہ  
بتائیں کہ موجودہ دنیا کے کون سے ایسے لیڈر ہیں جنہیں آپ پسند کرتے ہیں یا جو آپ کو پسند کرتے  
ہیں۔

بھنو صاحب نے جواب دیا۔ سکارٹو۔ وہ میری ایک طرح سے پوجا کرتا تھا اور میں اس کی۔  
اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود جس میں عورتوں کے ساتھ Vulgarity کرنے کے باوجود وہ ایک  
ادب مند انسان تھا۔ اسے اکٹاس کی بھی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ دوسرا لیڈر نہ صرف تھا۔ وہ بھی ایک شاندار  
انسان تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں اس سے۔ میں نے 1968ء میں جب جنرل ایوب کی کاہنہ  
سے تصحیحی رپورٹ لکھنے کے لیے اس کی دعوت دی اور مجھے ایک سربراہان مملکت کا پتہ کول دیا اور کہا کہ



میں جتنا عرصہ پا ہوں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تیسرا لیڈر جس سے میں متاثر رہا ہوں وہ شان تھا۔ میں ہمیشہ اس کی دل سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ تاہم، میں نے خروشیف کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اسے میں نے ہمیشہ جیتنے چاہتے، اس لیے دن کو بڑا بھلا کہتے یا شراب پیتے اور ہمیشہ امریکیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ خروشیف نے ایشیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ آخری لیڈر جس سے میں متاثر ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ چاہتی ہیں کہ میں موزے ٹگ کے بارے میں کچھ کہوں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے لیے پروان لائی کے بارے میں بات کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ میں اسے اتنی طور پر جانتا ہوں اور میری ان سے کئی ملاقاتیں اور بحث و مباحثے ہوئے ہیں جو صبح سے شام تک جاری رہے حتیٰ کہ ایک سال تک ہم یہ مباحثے کرتے رہے۔ میں 1962ء سے لیکن چارہا ہوں اور پروان لائی سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جناب صدر! آپ جن لیڈروں کے نام لے رہے ہیں انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی جنکا آپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟

بھنو صاحب بولے آپ لگا کہ رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے ڈیل میں االا گیا۔ میں نے کئی دفعہ خطرات کا سامنا کیا۔ میں نے جنرل ایوب خان اور یگنی خان کا سامنا کیا۔ انہوں نے کھالے میں زبردتہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اوپر گولیاں بھی برسائی گئیں۔ دو دفعہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ 1968ء میں ہوا اور ایک دفعہ 1970ء میں۔ سندھ کے شہر ساگھڑ میں دو سال پہلے میں یگنی خان کے پیچھے ہوئے قاتلوں کی گولی کئی کرا اس فائرنگ میں ایک آٹھنٹے تک پھنسا رہا۔ مجھے چھاتے ہوئے ایک گھنٹے مارا گیا جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ آپ ایک اور بات بھی نہ بولیں کہ جب آپ کسی امیر گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ بنتے ہیں تو پھر کوئی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا نہ دوست اور نہ ہی آپ کے قریبی لوگ بلکہ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تو اور غریب، بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتے جو بھارے اسٹے پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ وہ آپ کے غلطوں پر یقین کریں۔ میرے لیے گولیوں کی بوچھاڑ اور خوراک میں زہر سے بچنا اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ میری باتوں کو سنجیدگی سے لیں جو مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا گھنٹے جو آسٹریلیا اور مراعات میں میں پیدا ہوا تھا، انہوں نے کوئی مجھے والدین کے قاتلین پر

نہیں بنادیا تھا اور اگر سیاست میرا پیشہ نہ ہوتا۔۔۔۔۔

میں نے کہا بھنو صاحب آپ کے اندر سیاست کے لیے اتنی محبت کہاں سے آئی؟  
 بھنو صاحب بولے یہ ہمیشہ سے میرے اندر تھی۔ جب میں ایک بچہ تھا یا اس وقت بھی میرے ساتھ تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ چیز میرے والدین کی طرف سے میرے اندر آئی تھی۔ میرا باپ ایک بڑا زبردست سیاستدان تھا۔ تاہم، انیسویں کی بات ہے کہ سیاست سے اس وقت وہ نکل گئے جب وہ مختلف انتخابات میں ہار گئے۔ ان کے سیاست کے بارے میں بڑے اعلیٰ خیالات تھے۔ ایک دن وہ مجھے لاڑکانہ کا چکر لگانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے قدیم مندر دکھائے۔ شاندار گھر اور اپنی تہذیب کی نشانیاں اور مجھے کہا کہ دیکھو جتنا اسیاست بھی ایک مندر یا گھر تعمیر کرنے کی طرح ہوتی ہے یا میوزک یا شاعری کہنے کی مانند انہوں نے اپنی گفتگو میں مائیکل اینگلو کا بھی ذکر کیا۔ تاہم میری ماں بڑی مختلف قانون تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ دوسرے غریب لوگوں کی غربت بہت کھٹکتی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہتی رہتی تھی کہ جتنا تم ہمیشہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ ہمیں غریبوں کی مدد کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں امریکہ گیا تو میری ماں کی باتیں میرے ذہن میں اتنی رچ بس گئی تھیں کہ میں ایک انقلابی بن گیا۔ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھنے گیا جہاں انٹرنیشنل لاء کا ایک بہت بڑا لیور ریٹ پڑھا رہا تھا۔ میں اس وقت انٹرنیشنل لاء میں بھی ڈگری لینا چاہتا تھا۔ یہ دور کیونسٹوں کو ہارٹ کرنے کا دور تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا تھا۔ میں لال نیل پالش لگانے والی لڑکیوں سے دور رہتا اور ایک ایسی سٹریٹ میں جا کر رہا جہاں نیگرو ز رہتے تھے۔ میں وہاں ایک مہینہ اور ایک ہفتہ رہا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا اچھا لگا۔ وہ جو بھی تھے ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں ہنسنا آتا تھا۔ ایک دن ساٹھ یا گویں میں ایک ہوٹل والے نے اس وجہ سے کمرادینے سے انکار کر دیا کہ میں ایک میکسیکن لگتا تھا۔ اس واقعے نے بھی میری سوچ کافی بدلی۔ میں امریکہ سے لندن گیا۔ ان دنوں الجیریا کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ میں الجیریا کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا لیکن میں مظاہرین کے ساتھ مل کر برطانیہ کے وزیراعظم کے دفتر 10۔ ڈاؤنگ سٹریٹ کے باہر نعرے نہیں لگاتا تھا۔ ہو سکتا ہے شاید کسی کو ظم نہیں ہے کہ میں اندر سے ایک شرمیلا انسان ہوں۔ میں لوگوں میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ لکھ کر بحث و مباحثہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میرے خیال میں سیاست کی گیم میں یہ چیز مجھے



زادہ انجلی لکھی تھی۔

میں نے کہا کہ صاحب صاحب آپ سے آخری سوال۔ مخالف کبھی کا اگر سوال آپ کو یاد رہے؟

جی ہاں۔ آپ کا کیا خیال ہے، آپ گل نہیں کے؟

ابو صاحب نے کہا کہ آپ کے اس سوال کو ہم اس طرح سمجھتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ میں اپنی کل رقم دو ہزار جن جن میرا خیال ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے زیادہ اور تک پاکستان کا عمران راہوں کا ہوں نے انہی تک اس ملک پر شعرا کی ہے۔ کل بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت صحت مند ہوں اور میرے اندر خاصی ارضی بھری ہوئی ہے۔ میں کام کر سکتا ہوں جیسا انہی ہی ایک دن میں اٹھاؤ گئے کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت نو جوان ہوں۔ میری عمر 44 برس ہے اور میں اندر کا گندھی سے اس سال چھوٹا ہوں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیسری دنیا کا واحد ایٹم راہوں جو دنیا کی وہ بڑی سپر پاور کی مخالفت کے باوجود دوبارہ سیاست میں واپس آیا۔ 1988 میں امریکہ اور روس دونوں ابھ سے سخت ٹھکانے اور مجھے مشکلات میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آج میں ان تمام مشکلات پر قابو پا کر بیجاں بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے اپنے پیٹھے (سیاست) کے بنیادی اصولوں کا پتہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصول کیا ہیں؟ دراصل سیاست میں آپ کو کئی دفعہ یہ تاثر دینا پڑتا ہے کہ آپ یہ قوف ہیں اور دوسروں کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان سے بہتر ذہن کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تاہم یہ سب کچھ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر چمک ہو۔۔۔ کیا آپ نے کبھی کسی کونسل پر کسی پرندے کو اپنے انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ایک سیاستدان کی انگلیاں اتنی ہلکی اور چمکدار ہوتی ہیں کہ وہ بڑی مہارت سے اس پرندے کے نیچے سے اس کے انڈوں کو ایک ایک کر کے اپنی خوبصورتی سے نکالے گا سے پتہ ہی نہ چلے!

کراچی، اپریل 1972ء

Courtesy : An Interview With History

مترجم: رؤف کلا سرا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com





مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

رؤف کا سرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تہہ ملی کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تقریبات سے آگاہی بہت کم ہے۔ رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر مہا کھنکے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے اتفاق کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ میدان میں ریلنگس کے لیے پیش کیا ہے۔ جس کسی میں اختلاف کا مواد یا مہا کھنکے کی عقل ہو وہ اس معرکے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو پوہدری نثار یا پوہدری شہامت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں یا یہ کہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا یہی سب سے بڑا سہلی ہے کہ ایک ہی مضمون اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی پھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر حسین